

**PAGES MISSING
WITHIN THE
BOOK ONLY**

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222995

UNIVERSAL
LIBRARY

جملہ حقوق محفوظ

ہے رہنمائے خلقِ عمل جس کے نیک ہم

کافر ہودہ عقیدہ میں یا دین ^(ہماریوں) راہوں

بیاکارِ علاءِ فضیلتِ انبیاءِ حسنینؑ یا شاہدینِ صبا ہمایوںِ محرم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

میان بشیر احمد جی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء۔ ایڈیٹر۔

مولینا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جوائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق میجر رسالہ ہمایوں نے
کنٹریل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

طالع انجمن



فہرست مضامین جمالیوں



بابت مارچ ۱۹۳۲ء

تعمیر: جلوہ گاہ

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱	جہاں نما		۲۹۱
۲	سر محمد شفیع کی شاعری		۲۹۳
۳	جمہوریت الاقوام کا تاریخی پہلو		۲۹۴
۴	لبنت نظم	جناب قبول احمد پوری	۲۹۸
۵	اردو شاعری اور ملی سرمایہ	مولوی محمد حسین صاحب دیباچہ لکھنے والے بی. اے ڈی	۲۹۹
۶	غزل	حضرت سرور سی	۳۱۲
۷	غزل	جناب سیفی نو کاظمی	۳۱۲
۸	احساس اللہ	جناب منصور احمد صاحب	۳۱۳
۹	نغمہ محبت		۳۱۴
۱۰	ناظمی ڈراما	پروفیسر سید فیاض محمد صاحب گیلانی ایم اے	۳۱۵
۱۱	راحت کہہ (قطعات)	خواجہ عبد الباقی صاحب پبلشر صاحبانی ایم اے ایل ایل بی	۳۲۱
۱۲	کاوشیں گیارہ (افسانہ)	جناب منصور احمد صاحب	۳۲۲
۱۳	نوائے عدم نظم	حضرت عدم	۳۲۶
۱۴	جذبات محبت (۲)		۳۲۶
۱۵	اصلاح ادب	حضرت نشر جانہ دھری	۳۳۷
۱۶	فردغ نظر (نظم)	جناب اسد عثمانی	۳۳۷
۱۷	غزل	جناب عبدالجلی صاحب کاظمی	۳۳۸
۱۸	شب حرام (نظم)	جناب محمد جمیل خان صاحب راز	۳۴۳
۱۹	غزل	جناب زیبار و دولوی	۳۴۳
۲۰	یونانی غلام کی سرگزشت (افسانہ)	جناب جمہوری علی خان صاحب	۳۴۴
۲۱	غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط	جناب سید فرخ حیدر صاحب بی اے ایل ایل بی اے ایل بی	۳۴۴
۲۲	کلام تاجرب	جناب علامہ احسان الدین صاحب پروفیسر بی اے ایل ایل بی	۳۴۵
۲۳	نوائے راز	مادہ ملی خان	۳۴۵
۲۴	نظم شاعر (نظم)	جناب چادڑ دہلوی	۳۴۵
۲۵	عصف ادب		۳۴۶
۲۶	تیسروں دارا		۳۴۹
۲۷	ساگرہ خبر کے شعلیں آرا		۳۵۱

اعلان ہمایوں کے سالانہ چنیدے میں مستقل تخفیف

ہمایوں کا سالانہ چنیدہ اب تک پانچ پلے (علاوہ محصول ڈاک، راجی، دسویں ساگرہ کے موقع پر ہم نے نومبر دسمبر کے لئے عاری طور پر عایتی چنیدے کا اعلان کیا تھا۔ اس دو مہینے کے عرصے میں ہمایوں کی اشاعت نے اس سرعت کے ساتھ ترقی کی کہ چند ہی دنوں کے اندر خریداروں میں سابق تعداد کے ایک تہ کا اضافہ ہو گیا۔

اس واقعہ سے ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ شائقین ادب کی ایک فطرتاً ہی انسان تعداد ہمایوں کی خریداری کی دل سے خواہشمند ہے مگر چونکہ ہمایوں کا چنیدہ اکثر رسالوں پر زیادہ ہے اور ملک کی اقتصادی حالت بلاتنہا پس ہے اس لئے اکثر لوگ سالوں کے زیادہ چنیدے کے تحمل نہیں کر سکتے۔ ہمایوں کا بلند معیار قائم رکھنے کے لئے ہمیں پہلے ہی مقابلہ زیادہ مصارف کا تحمل ہونا پڑتا ہے اور اگرچہ موجودہ مصارف کے پیش نظر کسی قسم کی مستقل یا عارضی تخفیف کی گنجائش نہیں مگر ہمارا مطمح نظر عموماً محض تجارتی نہیں بلکہ ہمایوں سے اگر زبان ادب کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور ملک کو اس کی ضرورت ہے تو ہم پہلے کی طرح اب بھی ایک حد تک نقصان برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ اس اعلان کے بعد ہمایوں کا سالانہ چنیدہ پانچ پلے کے بجائے چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)۔

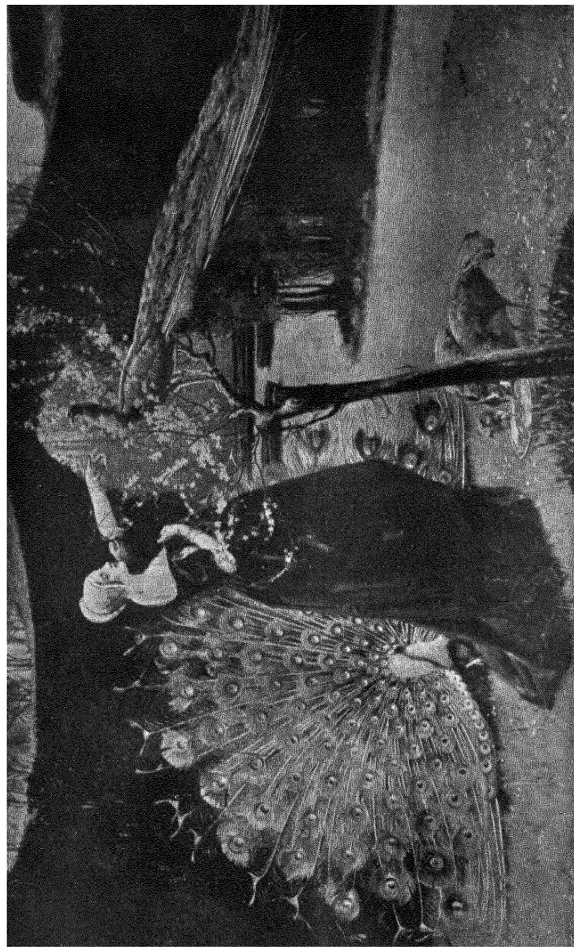
موجودہ صورت میں ایک کاپی کی کمی ناگزیر تھی۔ لیکن چونکہ جنوری ۱۹۳۲ء سے قبل ہمایوں کے ایک صفحہ میں ۳۴ سطریں ہوتی تھیں اب ۲۵ ہیں۔ اس کے علاوہ خط بھی زیادہ بھنی ہو گیا ہے اس لئے مراد مطالعہ پہلے سے زیادہ یعنی تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کا ہوتا ہے۔ موجودہ رسالے ہوائیات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

امید ہے کہ شائقین ہمایوں "اس عایتی چنیدے سے فائدہ اٹھائیں گے اور ناظرین ہمایوں رسالے کی توسیع اشاعت میں حسب سابق ہماری مدد کر کے زبان و ادب کی خدمت میں بہارا ناٹھ بٹائیں گے۔

جن حضرات کی فیداری کی درخواستیں کم اپریل سے پہلے دفتر ہمایوں میں پہنچ جائیں گی۔ ان کو ہمایوں کا ایک ضخیم ساگرہ منجس میں اردو زبان کے بہترین ادبوں کے مضامین نظم و نثر جمع ہیں۔ بالکل مفت نذر کیا جائے گا۔ اس شاندار نذر کا سرزدی رنگیں اور خوبصورت ہے۔ اس کے علاوہ متعدد فائفون اور رنگین تصاویر بھی شامل ہیں۔ صرف اسی نمبر کی الگ قیمت عدد روپیہ ہے مگر نئے خریداروں کو یہ سال بھر کے بارہ پرچوں کے علاوہ بلا قیمت بھیجا جائے گا۔ فرمائیں جلد بھیجئے اور بھجوائے۔

ناظم دفتر ہمایوں

THE HUMAYUN.



جایزہ

جہاں نما

ہندوستان کا افلاس

مطربریز فورڈ رسالہ ایشیا میں ہندوستان کے افلاس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی آبادی کا غریب حصہ س قدر فائدہ مند اور کمزور ہے۔ کہ وہاں اوسط عمر کی توقع ۳۳ سال ہے۔ زیادہ نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ انگلستان میں اوسط عمر ۵۴ سال ہے۔ ہندوستان میں صرف طبر یا ہی سے ہر سال دس لاکھ انسان ہلاک ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ محض آب و ہوا کی خرابی نہیں قرار دی جا سکتی۔ بنارس کی آبادی کے یورپین حصہ میں موت کا اوسط ۱۲ فی ہزار ہے۔ اس کے مقابلہ میں شہر کے اندر اس کا اوسط ۴۹ فی ہزار ہے۔ یہاں بچوں کی اموات کا اوسط ۳۱۹ فی ہزار ہے۔ حالانکہ انگلستان میں یہ ۷۰ سے زیادہ نہیں۔

مطربریز فورڈ حکمران جماعت کے ساتھ سودخواروں اور زمینداروں کو بھی دیہاتی آبادی کے افلاس پر زبون مافی کا زہر مار رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریزی حکومت کا قیام اور ہندوستان کا قابل اعتراض رستم و درواج دونوں یکساں اس ابتزی کے لئے جواب دہ ہیں۔ بعض صورتوں میں تو غیر ملکی حکومت کی ریکات ہی دیہاتیوں کے لئے بلائے جاں نابت ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ریلوے کو لینے۔ ریل نے قریہ قریہ میں مشین کی تیار کردہ ارزان مصنوعات کا ایک طوفان برپا کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دیہاتی و صنعتکار اور صنایع بھی قوتِ لایموت حاصل کرنے کے لئے کاشتکاری پر مجبور ہو گئے۔ حالانکہ قابل کاشت اراضی پر پہلے ہی ضرورت سے زیادہ جوہم جوڑا تھا۔

زندگی کے بہترین دس سال

ریورنڈ ہارٹن نے انسان کی زندگی کو دس س سال کے حصوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے۔

- ۱۔ خاص اور بے فکر سرت کا زمانہ ایک سے دس سال کی عمر تک۔
- ۲۔ زندگی کی مسرتوں کے شدید ترین احساس کا زمانہ دس سے بیس سال کی عمر تک۔
- ۳۔ فخر و لطیفہ کے شعلہ احساس کی بیداری کا زمانہ بیس سے تیس سال کی عمر تک۔
- ۴۔ خدمت و عمل کا بہترین وقت تیس سے چالیس سال تک۔
- ۵۔ باہمی انسانی تعلقات کا دور چالیس سے پچاس سال کی عمر تک۔

پچاس سے زائد عورتیں گمبھیر داتا نام کا زمانہ ہے۔

سیریں زیادہ گہری ہوتی ہیں مگر نہ کافی اور ایسی کتنے ہی سے آلودہ تعلقات کا احساس بھی زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ اور انجام کار درجہ اولیٰ کار شدہ طورتا ہے۔

ٹکٹ جمع کرنے کا شوق

دنیا میں ٹکٹوں کا سب سے عظیم الشان مجموعہ ہیرن فیئر سے (پیرس) کے خاندان میں ہے۔ اس مجموعہ کی ابتدا ۱۸۶۵ء میں ہوئی تھی اور اس کا مالک آج تک اس پر ۱۰۰۰۰۰ ٹکٹوں پر جمع کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں تقریباً ہر ٹکٹ کا جوائنٹ ٹکٹ کہیں بھی جاری ہوا ایک استعمال شدہ اور ایک غیر مستعمل نمونہ ہے۔ مجموعی طور پر پانچ لاکھ سے زائد مختلف نمونے ہیں!

سینما کا مستقبل

جب سے سنیما کو گراف ایجاد ہوئے بعض بہترین فلمیں اس کے نقائص دور کرنے کے لئے وقف ہیں۔

توقع کی جاتی ہے کہ وہ ناز زیادہ دور نہیں جب فلمیں حقیقت سے اس قدر مشابہ ہو جائیں گی کہ دیکھنے والوں کے لئے یہ بتانا مشکل ہوگا کہ وہ زندہ اکیٹروں اور ایڈیٹروں کو دیکھ رہے ہیں یا محض انہیں ان کی تصویریں نظر آ رہی ہیں ایک حیرت انگیز نیا طریقہ دریافت بھی ہو چکا ہے اور تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ فلمیں بالکل حقیقت کے مطابق بنائی جاسکتی ہیں۔

بروزہ استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے برعکس میں فلمیں عکس پر ہو سکتی ہیں ایک اور نقطہ سے دیکھنا وغیرہ بالکل حقیقی اجسام کی طرح ابھرے۔
تجئے نظر آنے میں اس کے متعلق تفصیلات ابھی معلوم نہیں ہیں کیونکہ تجربے انتہائی اخفا کے ساتھ متفصل ہذا درجہ کا اندازہ ملنے سے ہے یہ ضرورتاً معلوم ہوا کہ ان تجربوں کو ان میں ایسے نئے امتحان کئے گئے ہیں جن کی جلدت مختلف تھی اور جن میں فصلاں اس کے اختلاف بھی پایا جاتا تھا۔

سر محمد شفیع

مشہور گجراتی سالہ ۱۸۷۱ء میں یوٹو اپنی زوری کی اشاعت میں رقم طراز ہے۔

سر محمد شفیع کا انتقال صرف مسلمانوں ہی کا نقصان نہیں بلکہ تمام ہندوستانی قوم کا نقصان ہوئے ان کی ہستی قدر پرست سیاست دانوں کی رہنمائی کے لئے قدر دارن سیاست میں متعصبانہ ہوش فضا و گوشت ان سے ملے ہیں ان کا قول ہے کہ ان کی قدر پرستی محض ایک ارتقائی زندگی تھی جسے ہمارے قوم پرست پرہیزگاروں کے لئے ضروری سمجھتے تھے چنانچہ ان کی قابلِ حجاب زندگی تمام شہنشاہوں کی مقابلہ زیادہ قوم پرستانہ تقریریں ان کے لب کے حقیقی طبع نظر کا عکس سمجھی گئیں ان کی صاحبزادی کی اعلیٰ جیسے کی تعلیم و تربیت عورتوں کے متعلق ان کے خیالات اور طرز عمل کی آئینہ دار ہے۔

ذاتی اور شخصی تعلقات میں وہ انتہائی رواداری برتتے تھے اور مذہب و ملت کی عام تفرقات کے پابند نہ تھے۔

میاں سر محمد شفیع کی شاعری

ذیل کے اشعار عبدالقادر کے نوٹ کے ساتھ مخزنِ نبات نور ص ۱۹۲ سے نقل کیے جاتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو علم ہو گا کہ میاں سر محمد شفیع مرحوم فنی شعریں بھی سنسن رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے یہ دلکش اشعار اکثر لوگوں کے لئے ایک انکشاف ثابت ہو گئے۔ شیخ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں کہ گستاخ و تنبیہ گذشتہ میں ایدہ مخزن کو خوش قسمتی سے کثیرہ کا اتفاق ہوا اور مولوی محمد شاہ دین صاحب بی اے بریٹریٹ لاہور میاں سر محمد شفیع صاحب طرطیل جیسے نئی علامہ و طباع دوست رفیق راہ اور شریک سفر تھے۔ ان کی کل کل اور بار بار غزل کے اشعار و دوا بذاقی حضرت کے ملی مباحثوں کا نشانہ بن گئے۔ ان کا ادبی چرچہ ہے۔ ان کے شعر شاعری کی بھی باری کی مولوی محمد شاہ دین صاحب نے دتین تہذیب و تہذیب ان دنوں کی لکھیں جو ابھی صاف نہیں ہوئیں۔ بہت میاں سر محمد شفیع صاحب کی طبع آسانی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو انہوں نے عمر میں اپنی فہم کے لیے صاحب موصوف انگریزی میں کسی بھی نظم لکھنے سے ہیں۔ جو اخبار آبرور میں چھپ کر مقبول ہوتی ہی ہے۔ اردو میں آج تک انہیں کسی لکھنے کا موقع نہیں ہوا تھا۔ مگر جو حکم قدر تہذیب و تہذیب کو زون پائی کسی تہذیب کی بڑھانے لگا کر کہ یہ چند شعر ملاحظہ ہو۔

وادی بدر

مسرت کے ہے خوش سے شادماں
کہ سایہ ہے اس کا فرج بخش جاں
یہ گھر ہے میں ادی کو کوہِ بلند نہ رنم کی بھی جن پہ پہنچے کند
میں تیرے خوشانی کیل پسند عجب از قدر تھے کہ میں ان میں بند
ہے تاج سربر میں اشجار کے
میں تختِ دامن رکھتے انہار کے
یہ وادی کی جاں بخش تازہ ہوا ہے جس سے لاشائے کھلا
یسے پاس لاتی ہے تجھ سے سدا پیامِ محبت سلامِ وفا
محبت کی دُوس میں پامائوں میں
تو پھولا نہیں چھپر سنا تائوں میں
سکر سے چلے جئے تہہ گام ہوا دل میرا اور بھی شاد کام
دلاویز و دلکش تھا ہر کارِ تنہا صداقت کو پٹھانسی کا کلام
کہ فردوسِ دنیا میں ہے گر کہیں
یہیں ہی ہیں جو یہیں ہے یہیں م-ش

یہ شیر کے دل کشا غنڈہار یہ پانی، پیر شاد و مروت چنار
یہ سرسبز دشت اور یہ کوہسار سدا جن میں رہتی ہو گل کی بہار
میں بے شبہ جاں بخشِ فرست فرا
پر برب تہج بہن ہیں اے مروت
یہ دلکش لدر کی ہوا دی جہاں مہمانا ہر قدر تھے بندھا صامان
زیریں ایسی پائے مسافر کہناں کہے غنہِ سحر کی جو داستان
گھر کی ہے پہاڑوں سے جا دلِ وطن
ہیں اشجارِ سرسبز نیاں گلِ کف
سدا لگ گئے ہیں باری آبشار ہیں عاشق کیل کی طرح تیار
ہمیشہ گھر پر خود دل نگار ہے جہ روزن گل کا ان پر مدار
چمن گر کھلے ہیں تو ان کے طفیل
جو میدانِ جئے ہیں تو ان کے طفیل
کناروں پہ ان کے درختِ پناہ ہے نکل کا شاہنشاہِ باوقار
مٹا فرکا، جو دمت لیلِ نہار اے دیکھ کر میری جانِ ناز

جمعیت الاقوام کا تاریخی پہلو

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جمعیت الاقوام پر نیدرلینڈ ولسن کی اختراع ہے مگر تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں۔

مختلف قوموں کا کسی غرض سے یکجا ہونا معمولی بات ہے۔ اس یکجائی کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ آزاد قوموں یا طاقتوں کا کسی خاص مقصد کے لئے جارحانہ یا مدافعتی اتحاد۔ جیسے محمود غزنوی کے حملوں سے بچنے کے لئے ایک موقع پر ہندوستان کے تمام راجا متحد ہو گئے تھے۔ یا اسی طرح وجے نگر کے آخری فرمانروا رام راجا کے خلاف احمد نگر کو گولڈہ بیدر بھاپور کے مسلمان سلاطین متحد ہو کر تلی کوٹ کے مقام پر لڑے اور وجے نگر کے دفتار کا قلعہ فتح کر دیا تھا۔

۲۔ مختلف قدامتوں کا کسی حکمران قوم کے زیر سایہ یکجا ہونا اس کی مثالیں تاریخ کی عظیم الشان سلطنتوں میں ملیں گی۔ سلطنت عباسیہ کی حکومت عربوں، ایرانیوں، ترکوں، افغانوں، حبشیوں اور دوسری قوموں پر تھی۔ سلطنت عثمانیہ کے ماتحت مشرقی یورپ کی گونا گوں اقوام بھی تھیں۔ یہی حال کم و بیش دوسری سلطنتوں کا بھی ہے۔

یورپ میں جمعیت الاقوام کی سب سے پرانی مثال ایفک مجوک لیگ ہے۔ اس جمعیت میں یونان کی وہ تمام ریاستیں شامل تھیں جو ڈلفی کے مندر میں پرستش کرتی تھیں۔ جمعیت کا مقصد اس مندر کی محافظت تھا۔ (سومناٹہ کے مندر کی محافظت بھی اسی طور پر تھی)

یونانی اقتدار کے خاتمے پر سلطنت روم معرض وجود میں آئی۔ یہ صحیح معنوں میں ان مختلف اقوام کی ایک جمعیت تھی۔ جو روم کے عقابانی جھنڈے کے سامنے سر تسلیم خم کرتی تھیں۔ ان میں برٹن (انگریز)، گال (فرانسیسی)، اور مختلف گاتھ (جرمن) لوگ شامل تھے۔ ان سب پر رومن تہذیب، رومن قانون اور ایک مذہب رومن (لاطینی) زبان غالب تھی۔

جب روم کو زوال ہوا۔ تو اس کی بجائے یورپ کی مختلف قوموں کا ایک مذہبی اتحاد ایک مسیحی شہنشاہ اور پوپ کے زیر سایہ قائم ہوا جس کا نام مقدس رومن سلطنت تھا یہ سلطنت شارلین شاہ فرانس کے ہاتھوں قائم ہوئی اور نپولین عظیم کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سلطنت کے شہنشاہ اکثر آسٹریا کے شاہی خاندان (ہابس برگ) سے ہوتے تھے لہذا شہنشاہ کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ مگر عام طور پر اس انتخاب کی حیثیت ایک کھیل سے زیادہ نہ ہوتی تھی

مقدس رومن سلطنت کا خاتمہ ہونے سے پہلے اس کے اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس کے دو سبب تھے پہلا سبب

وہ ذہنی اور روحانی انقلاب جو حروب صلیبیہ کے زیر اثر پیدا ہوا۔ اور فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) کے بعد یورپ کے گوشے گوشے پر ظہور میں آیا یعنی ریناسنس۔ اور دوسرا سبب وہ مذہبی اختلافات جنہیں ریفارمیشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو زیادہ تر اسلامی اصولوں کے تنبیہ کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ بہر حال ان دونوں تحریکوں کا یہ اثر ہوا کہ یورپ کا اتحاد نہ رہا اور "قومیت" اور "وطنیت" کے تصور کی ابتدا ہوئی مختلف قوموں کو اپنے سامنے ترقی کی ایک نئی دنیا نظر آئی اور ایک مقابلے کی دوڑ شروع ہوئی جس میں قدم قدم پر لڑائی جھگڑے کا سامان تھا۔

اس صورت حالات میں قوموں کے باہمی تعلقات کا سلسلہ درپیش ہوا جس کے حل کی دو قسم کے اشخاص نے کوشش کی۔ لکینی فلی اور اس کے اطالوی ہم خیالوں کی رائے میں ایک قوم کی بہترین حکمت عملی خود غرضی ہے۔ البتہ یہ خود غرضی ظاہر نہیں ہونی چاہئے۔ یعنی مختلف اغراض کے ظاہری پہلے میں اپنی خود غرضی کو فروغ دینا چاہئے۔ برخلاف اس کے ایک بڑے گروہ نے وقتاً فوقتاً چند بین الاقوامی اصول وضع کرنے کی کوشش کی۔ اور صلح عمومی کے ذرائع پر غور کیا۔ سوھویں صدی کے شروع میں امریش گروہ سے لے اپنی ایک کتاب میں ایک بین الاقوامی مجلس کے انعقاد کی تجویز پیش کی جو مختلف قوموں کے باہمی جھگڑے فیصلہ کیا کرے۔ ایک ایسی ہی تجویز فرانس کے بادشاہ ہنری چہارم کے وزیر اعظم سلمی کی خود نوشتہ سوانح عمری میں بھی موجود ہے۔

۱۶۴۳ء میں ایک مشہور انگریز دلیم پن (جس کے نام پر امریکہ میں پنسل دنیا کا علاقہ آباد ہوا) نے بین الاقوامی تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے قوموں کی پارلیمنٹ تجویز کی جس کے ارکان یورپ کے فرمانروایان کے نامزد گمان ہوں جو عدل و انصاف کا دور دنیا میں قائم کریں۔ اس پارلیمنٹ کی دو زبانیں ہوں۔ لاطینی اور فرانسیسی کسی معاملے میں فیصلہ دینے کے لئے رائیں لی جائیں۔ رائے دینا پوشیدہ طور سے ہو مگر ہر ایک کے لئے ضروری۔

دلیم پن کے کچھ عرصہ بعد ایسے سینٹ پیار نے ایک عہد نامہ صلح دائمی پر تخیال آرائی کی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک مستقل جمعیت قائم کی جائے جو ہر قسم کے بین الاقوامی اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کرے جھگڑے فیصلہ کرے جس قوم کا قصور ہوا سے سزا دے۔ اور سزا دینے کے لئے دوسری قومیں اپنی اپنی فوجوں سے اس جمعیت کی امداد کریں۔

انہی لوگوں کی طرح مشہور جرمن فلسفی امانول کانٹ نے بھی "دائم صلح" پر ایک کتاب لکھی جس میں آزاد حکمران ریاستوں کی ایک جمعیت کا خیال موجود تھا۔

ان لوگوں کی صلح جوئی سے دنیا کو بہت فائدہ پہنچا مگر سب سے زیادہ فائدہ ہو گا کہ گروٹی اس کی ذات سے ہوا کہ وہ اس نے بین الاقوامی قانون کی بنیاد ڈالی۔ اور ایسے اصول وضع کئے جو صلح اور جنگ دونوں میں قوموں کی رہنمائی کر سکیں یہ اصول اس کی کتاب میں موجود ہیں۔ جو یورپ کی "جنگ سی سالہ" کی وحشیانہ کارروائیوں سے متاثر ہو کر ۱۶۲۵ء میں لکھی گئی۔

اب ہمیں چند اور واقعات کا جائزہ لینا ہے جنہیں موجودہ جمعیت الاقوام کے وجود سے بہت گہرا تعلق ہے جب سوہوویں صدی میں ہنری ہتھ شاہ انگلستان، فرانسس اول شاہ فرانس اور چارلس پنجم شاہ سپین و شہنشاہ مقدس رومن سلطنت کے درمیان لڑائیاں ہوئیں تو یورپ کی سیاسیات میں توازن قوت کا اصول قائم ہوا۔ یہ اصول ایک فوری مصنف فیلون نے نہایت مختصر مگر واضح الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:-

”یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگر کمزور سلطنتیں طاقتور سلطنتوں کے مقابلے پر متحدہ نہ ہوں۔ تو وہ طاقتور سلطنتیں ان کو شکست دے کر ان پر قابو پا لیں گی“

اس اصول پر چلتے ہوئے یورپ کی سلطنتوں نے کوئی چہار دہم شاہ فرانس اور نپولین کے خلاف جو عمل کیا اس کا مفصل ذکر ضروری نہیں مختصر یہ کہ ان دنوں مکیرون کی شکست اور تباہی کا باعث یہی توازن قوت کا اصول تھا۔

نپولین کی شکست کے بعد انگریزوں اور روس کی تحریک پر شاہ فرانس میں یورپ کی طاقتوں نے بل کر ایک مجلس دول قائم کی جس کا عام نام اتحاد مقدس ہے۔ یورپ کے بادشاہوں نے بل کر یہ عہد کیا کہ وہ ایک دوسرے سے کبھی نہیں لڑیں گے۔ مذہب عیسوی کے اصولوں پر کاربند رہیں گے۔ اور اپنی اپنی رعایا کے ساتھ عدل و انصاف روا رکھیں گے۔ بظاہر یہ ایک نہایت اچھا عہد نامہ تھا۔ مگر حقیقت یہ کہ لازم تھا کچھ عرصے کے بعد یہ اتحاد مقدس اور اس کا ساتھ اقدس غائب ہو گیا اور دنیا کو اس کے پودے میں چند مطلق العنان بولابھوسوں کی ٹولی نظر آنے لگی جس کا کام محض استبداد کو فروغ دینا اور آزادی جمہور کو سب کرنا تھا۔ اس طرز عمل کی بدترین صورت میٹرنک وزیر اسٹریا کی کارروائیوں میں ملتی ہے۔

”اتحاد مقدس“ کے اس ردیے کے خلاف انگلستان میں کیننگ اور امریکہ میں پرڈیمنٹ مندر نے احتجاج کیا۔ کیننگ وزیر اعظم برطانیہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اتحاد مقدس کے ارکان ہر ایک ملک میں آزادی کی روح کو کھلنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب اتحاد مقدس نے سپین کی تحریک آزادی کو دبانا چاہا۔ تو کیننگ نے اپنا مشہور نظریہ مداخلت پیش کیا۔ اسی طرح مندر نے امریکہ کی یورپ کے اور یورپ کی امریکہ سے سیاسی جملہ تعلق کا اعلان کیا۔

اس سیاسی ارتقا کے پہلو پہلو بین الاقوامی قانون کا بھی ارتقا ہوا جس کی وجہ زیادہ تر انگریزی عدالت بحری کے جج ولیم سکاٹ (لارڈ سٹویل) کے وہ فیصلے ہیں جو اس نے وقتاً فوقتاً صادر کئے اس کا قول ہے کہ اگرچہ بحری عدالت کی قانونی طاقت ایک ملک میں محدود ہے مگر اس کا قانون ایک غیر محدود بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک جج کو چاہیے کہ وہ اپنے ملک کی فوری سیاسی ضرورتوں سے متاثر نہ ہو۔ اور ان کو پورا کرنے کی غرض سے متضاد فیصلے صادر نہ کرے بلکہ انصاف سے کام لے کر ایسے اصولوں پر چلے جو ہر موقع پر ہر ملک میں روا رکھے جاسکیں۔ لارڈ سٹویل نے اپنا ہر ایک

فیصلہ انہی انصاف کے اصولوں پر صادر کیا۔ اور اسی وجہ سے اسے بقائے دوام کا استحقاق ہے بین الاقوامی قانون اور خصوصاً بحری قانون کے معاملے میں لاطنٹوکیل کے بعد امریکن کلاسٹوری اور مارشل بھی قابل ذکر ہیں۔

اس آتھائی مسئلے میں جس کا ذکر اب تک ہوا ہے موجودہ جمعیت الاقوام کی تشکیل ہو رہی تھی اس جمعیت کی بنا کو گسٹاٹائی آفری زایدوس کے ہاتھوں لگی گئی۔ زار نے اپنے وزیر خارجہ کاوٹ مورادیف کی وساطت سے ۲۴ اگست ۱۸۹۸ء اور دوبارہ ۱۱ جنوری ۱۸۹۹ء کو پیرس میں صلح کو صلح عمومی کو خفیہ سطح کی دعوت دی ابتدا میں تو اس دعوت پر کسی نے توجہ نہ کی مگر ۲۴ مئی ۱۸۹۹ء کو ایک سو سی فائیدہ کی صدارت میں ہائی بیگ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں چند قراردادیں منظور کی گئیں اور چند تقریریں ہوئیں۔ مزید برآں ایک اور کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی گئی جو ۱۹۰۱ء میں ہیگ میں ہوئی اور دوسری ہیگ کانفرنس کہلاتی ہے۔

ہیگ کانفرنس کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات تقریر کی تعبیر ہے۔ یہ تقریر ۱۸۹۹ء میں ہیگ میں تیار ہوا اس کے لئے آئین دروازے پر جتنی نے مہیا کئے تھے سرکسٹے نے تو بے آیا کھڑکیوں کے لئے رنگین شیشے برطانیہ نے دئے لیشی پرے جاپان نے محمدان چین نے اور کوسٹمی جنوبی امریکہ نے اس تقریر کو آج بھی ایک انتہائی خصوصی حاصل ہے کیونکہ اس میں بین الاقوامی عدالت کا اجلاس ہوتا ہے ہیگ کی مختلف کانفرنسیں اسی میں ہوئیں ایک کانفرنس جنگ عظیم سے پہلے ہوئے دلی تھی جو جنگ کی وجہ سے نہ ہو سکی۔ شاید اقبال نے اسی کو بر نظر رکھا کہ کہا ہے :-

اب ہاں ہوس منم کدہ صلح عام ساخت رقصید گرد او بواہائے جنگ و عود

دیدم جو جنگ پردہ ناموس اورید جز لیسفلک الدملہ وخصیصہ مبین بود

جنگ عظیم بھی بالکل تازہ واقعہ ہے۔ اس کی تباہ کاریوں کی تفصیل بے سود ہے اگر کسی نے ان کا صحیح اندازہ لگایا تو سطر کبریٰ بیچ کی تعصیفات موجود ہیں۔ خلاصہ یہ سمجھئے کہ بہت سے مغربی مصنفوں کے خیال میں ایک ایسی ہی جنگ دنیا میں اور ہو جائے تو انسان تہذیبی تمدن بلکہ نسل انسانی کا فائدہ ہو جائے گا اندیشہ ہے۔ بلکہ اندیشہ دہان جنگ ہی میں پیدا ہو گیا تھا چنانچہ حکومت برطانیہ نے فی مور کیٹی کو ایک جمعیت الاقوام کی تجویز پر غور کرنے کے لئے مقرر کیا اس کمیٹی کی رپورٹ پر موجودہ لیگ کے عہد نامے کا بہت مدد کا انحصار ہے عہد نامہ پرینڈینٹ ولسن کے ایما سے منظور کیا گیا اور ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو حیکہ عائدہ ملا جو کی برسی تھی۔ اس پر تیس قوموں نے متفقہ کر دئے۔

ممتاز حسن

جو میں نے صرف کیا وہ میرا تھا۔

جو میں نے رکھا وہ کھو دیا۔

جو میں نے دیا وہ اب بھی میرا ہے۔

گلچیں

لسنت

گاؤں بسنت نہیں اب دیری شکھ آنند کی آئی بیری
 ساری دُنیا ہے دل شاد
 آیا بُور اور پکی بیری آئی فتلی آم میں کیری
 بن بستی سب ہیں آباد
 کوئل سنے نہ میری تیری کوک کوک لگاوے پھیری
 ہر دے وا کے پیتم یاد
 سن تو سکھی تو، تُو چیت چیری اسی سے ہو پریم سے میری
 برہ کی آگ کرے برباد
 سکھی یہی آسے میری رکھوں مندر واگھی کی دیری
 جب بھارت ہوئے آزاد
 ہند دیش پر چھپائی اندھیری کر پریشورین اجیری
 سن لے بھارت کی فریاد
 یہی دعا ہے داتا میری ملے ہند دیش کو سکھیری
 اُجڑی نگر ہو آباد
 سید مقبول حسین احمد پوری
 لے لینی ہر شاد و تلندے میں چراغ

اُردو شاعری اور ملکی سربسہ

(۳)

کسی زبان کی شاعری کسی مخصوص طبقہ کی خوشنودی کے لئے اپنی فطرت و طبیعت نہیں بدل سکتی ایک طرف تو غزل اپنی شوقی و بیباکی سے ہلچہ دھونا خود کشی کے مراد خیال کرتی ہے دوسری طرف سومیر و پریت کے دیوتا طنز نہ کلام برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے دونوں میں مصالحت ہو تو کوئی بخوار و دشنامی سومیر و پریت کی سیر کرنے سے قبل پروا نہ آزادی جانتی ہے وہ دیوتا کی بارگاہ کے آداب و مراسم سے ناواقف ہے ہندو منہیات اور دیو مالا کے لفٹے اور در وایتیں اس کے لئے بالکل اجنبی و مانا نوس ہیں اگر اس کی زندگی مشربی و آزادہ رومی میں کوئی رکاوٹ پیش ہو تو وہ دیوتا کی دربار کی طرف رخ کرنا بھی پسند نہ کرے گی طنز شوقی و بیباکی صنف غزل کی امتیازی صفتیں ہیں کیا کوئی تدبیر ایسی ہے کہ شاہد غزل طنز و بیباکی اور شوقی و رنگینی کے ادصاف سے دست بردار ہوئے بغیر دیوتا کی سمجھا میں باریاب ہو سکے، کیا اس ملک کے باشندے جن کا جنون مذہبی میل کی قبی اور باجے کی آواز پر نایک دوسرے کا گھلا کاٹ لینے سے دریغ نہیں کرتا وہ اپنے دیوتاؤں کی شان میں طنز نہ کلام یا بے نیکی باتوں کے سننے کی تاب لا سکتے ہیں، اردو شاعری دیوتا کی بارگاہ میں دست بستہ ہو کر اپنی زبان پر ہر سکوت لگا کر حاضر ہونے سے بھی بہتر سمجھتی ہے کہ نہ وہ سومیر و پریت کی طرف رخ کرے اور نہ اس پریت کے جیل نشین اس کی محفل میں داخل ہوں۔

اب تک ہندو دیو مالا کی صرف ایک ہستی رادھا نے اردو ادب کی محفل طرب میں حاضر ہونے کے لئے آمادگی ظاہر کی ہے۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اس سے سوائے ناچ کے اور کوئی کام نہ لیا جائے اور پہلے سے نومن تیل کی فکر کر لی جائے لیکن نومن تیل کی مشعلیں ملائے اور رادھا کے ناچنے کے لئے اتنی وسیع جگہ درکار ہے کہ غزل کی بہتیت میں جو صرف دو مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اس کی گنجائش تکلیفی مشکل ہے۔ اس لئے غزل کی محفل رادھا کے ناچ سے بھی محروم ہی رہا گی ہے البتہ اکبر الہ آبادی نے اپنی ایک محفل میں طربی مشکوکوں سے رادھا کے ناچ کا انتظام کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہے

تو می ترقی کی رادھا پیاری میٹھی ہے پہننے جوڑا بھاری
نومن تیل کی فکر ہے طاری چند سے کی تحریک ہو جاری

اگرچہ یہاں رادھا کے ناچ کے لئے نومن تیل کا بھی انتظام کر لیا گیا ہے لیکن غزل پکاراٹھتی ہے کہ اس و بہتیت محفل سے مجھے کوئی سروکار نہیں یہ تو قطعہ کے زمین ہے سچی بات تو یہ ہے کہ زمین غزل میں نہ نومن تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی۔

خیز غزل میں نہ سہی قطع کی زمین میں تو عظیم الطبع دادھانے اپنے ناچ سے اہل محفل کو محفوظ و مسرور کر دیا۔ لیکن ہندی دیو مالاکے دوسرے دیوتا تو اردو شاعری کی کسی مجلس میں شریک ہونا پسند نہیں فرماتے کیونکہ وہاں نہ انکی آرتی اور پوجا پٹھ کا سالانہ ہے نہ ان کی رلوبیت والہ بہیت کا کافی احترام۔ علاوہ برس غزل کی محفل رنگین نہ میدان جنگ ہے نہ کشتی بازی کا اکھاڑہ جہاں رستم دھرباب یا ارجن دھیم کو دعوت دے کر نیزہ بازی تیر اندازی یا پہلوانی کا تماشا دیکھا جائے۔ البتہ دنیا کی بے ثباتی دے اعتبار کا اور قوت و شوکت کی ناپائیداری سی بیان کرتے ہوئے شاعر کبھی کہہ دیتا ہے کہ

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے ۔ ۔ ۔ ایک نقط نام ہی نام باقی ہے

لیکن ارجن اور دھیم کے پرستار کہیں گے کہ دیوتا غیر فانی ہوتے ہیں۔ انسانی روپ عمارت کرنے پر بھی وہ جام توتوش نہیں کرتے بلکہ لوگوں کی نظر سے اُن کا لوپ ہو جاتا ہے ارجن اور دھیم مرے نہیں بلکہ اپنے بقیتین بھائیوں کے ساتھ زندہ سو میر و پرست پر چلے گئے شاعر نے جو کام رستم اور سام کی قوت و توانائی کی بے ثباتی سے لیا اور جو نتیجہ اخذ کیا۔ ان کا دھیم اور ارجن کے قصہ سے انجام پانا ممکن نہیں۔ قصائد میں مدوح کو رستم و اسفندیار سے زیادہ دلدار اور طاقتور دکھایا جاسکتا ہے اس قسم کا مبالغہ منافع و بدائع میں داخل ہے جس کا مقصد محض زینت کلام ہے لیکن شاعر کو ارجن اور دھیم کے معاملے میں اتنی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی بھلمان مدوح کو تو محض غیریت۔ اجنبیت اور زمانا لوہیت کی بنا پر ہندو و ہندوستانی سوراؤں کی تشیل سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ اور اگر کسی ہندو مدوح کی قوت و طاقت کو دھیم اور ارجن سے بالاتر دکھایا جائے تو اس کے ہنسی جذبہ کو طعنے لگنے کا اندیشہ ہے۔ البتہ فنون کی ذریعے جہاں رستم دھرباب کی داستان بیان کی گئی ہے وہاں منظوم اردو جہا بھارت میں ارجن اور دھیم کے کارناموں کا بھی استقصا ہو چکا ہے لیکن شعریت سے نہ سہرا بے رستم کی منظوم داستان کو کوئی تعلق ہے۔ نہ جہا بھارت کے منظوم ترجمہ کو غرض کہ داخلی شاعری اور خصوصاً غزلیات میں ہندو و ہندوستانی کردار و اشخاص کو ایرانی و عربی ابطال کے پہلو میں جگہ دینا شعریت و معنی آفرینی کو کند چھری سے ذبح کرنا ہے۔ علاوہ برس غزل کی لالہ سنبھل فریحاں و نگرس و نقشہ بر روشاد بید و چنار وغیرہ کے بدلے جو ہندی پھول پودے پیش کئے گئے ہیں مثلاً کلب برکش اکشے بٹ کو کاہیلی۔ جٹا دھارئی سورج کھی وغیرہ ان کا نام سننے ہی غزل پکارا اٹھتی ہے۔ کہ میری زبان نہیں۔ یہ میرے محاورہ دردمزور و مختلف ہیں مگر میرے پہلو میں رکھے جائیں۔ تو ہمیشہ غار بن کر کھٹکتے رہیں گے میری ساری نیکیوں دلچسپی، شعریت، لطافت اور نزاکت کا خون ہو جائے گا میں جس زبان کی شاعری کا دودھ پی کر پی اور جوان ہوئی ہوں اس زبان کی بعض عجیبہ ترکیبیں و تعلق و تخیل الفاظ جب میری طبع نازک پر گراں گذرتے ہیں۔ تو ایک اجنبی زبان کے خواہ وہ میری ہسیا ہی کیوں نہ ہو تخیل کی رخت اور کیفیت و نامطوبع الفاظ کو میری نازک مزاجی کب برداشت کر سکتی ہے؟

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لیلی و مجنوں شیریں و فریاد گل و بلبل شبنم و پردانہ۔ سرد و شمشاد و بگس و موسن کوہ طور و کوہ انوند۔ دجل و فرات۔ قیصر و کسریٰ جمشید و فریدون۔ خضر و سکندر۔ ازل و نگہانی کا رخ۔ صورت۔ پیرا ہن یوسف۔ چاہ کنگان

پانچ شہر غزلات آپ جیواں اور اس قسم کے سینکڑوں نام جن سے اردو شاعری کی محفل سہجائی جاتی ہے۔ ہزاروں باسیکڑوں پہلوئیں سو بندھتے آئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر لفظ کے ساتھ بیشمار تلازمات اشارات تعلیمات، ایتنافات، خیالات، تصورات اور واقعات وابستہ ہو گئے ہیں جس طرح تربیب کی ایک کڑی پھینچنے سے تمام کڑیوں میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح ان میں سے کسی لفظ سے گوش کشا ہوتے ہی اس کے تمام تلازمات، ایتنافات و توابعات حافظہ کی نعیم شعری سطح سے ابھر کر حسی خیال کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ لارڈ میکائے نے ملٹن کے شاعرانہ الفاظ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف ان پر بھی صحیح اترتا ہے اگرچہ ان الفاظ کے لغوی معنی ظاہر مغہوم معمولی ہیں لیکن ہر لفظ کے اندر دیرائے معنی پوشیدہ۔ وہ معمولی لفظ نہیں بلکہ متر کے پتھر ہیں ان کے زبان پر اتنے ہی ماضی مبدل بہ حال اور بعد چیزیں قریب ہو جاتی ہیں جن کے نئے نئے پیکر ملوہ گر ہونے لگتے ہیں دماغ کو طے فرمودوں کو اکھاڑ باہر کرتا ہے یعنی بھولی بسری باتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے خوابیدہ داستانیں اور فانیے سیدار ہو جاتے ہیں لیکن ان کا مرفاد بادل استہلال کر دے طو کو سیر و پریت سے یا بلبل کو کوئل سے یا مینوں کو نل سے بدلوان کی آن میں سارا طلسم ٹوٹ جائیگا تمام حکواریاں غائب ہو جائیگی دفتر معنی کا باب بند ہو جائے گا۔ ساری پچاسیاق مفقود ہو جائیں گی تلافیات و ایتنافات کی رنجیٹ جائیگی، ان نسون کا رانہ الفاظ کو تبدیل کر دینے کے بعد بھی جو شخص سائنقہ طلسمی مناظر دہرایا کہ ہم آغوش نظروں کے لیے توقع کرے گا۔ اس کو دسی ہی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑے گا جیسی العنابد کے قاسم کو دریش آئی تخبیں جیکہ جادو کے دروازہ کو کھل گئیں کھل جو کھل چنا کھل موگ“ وغیرہ کہہ کر کھولنا چاہتا تھا حالانکہ وہ صرف ”کھل ہم ہم“ کے متر سے وابہ تھا۔ اگر ان الفاظ کو شعر میں نہ باندھ کر یونہی یکے بعد دیگرے بان پر لایا جائے تو بھی ہم نام کے ساتھ ذہن کے سامنے ایک سنگین طلسمی پردہ آتا جائیگا جس پر مختلف انسانوں مختلف حکایتوں اور مختلف واقعات کے نقوش ثبت ہو گئے اور دماغ صوبہ تحریر کی تماشگاہ بن جائے گا جب انفرادی الفاظ میں اس قدر طلسمی اثر کوٹ کر بھرا ہوا ہے تو شعر میں بند ہونے پر وہ نہ معلوم کیا قیامت برپا کریں گے۔ ان منترنوں کو ہندی الفاظ سے بدل دینے پر شعر کا سارا سحر کارانہ اثر نائل ہو جائے گا۔

انگلستان کے مشہور نقاد مسٹر ابراہامی کا قول ہے کہ صرف واقعات کو منظوم کر دینا شاعری نہیں بلکہ محض نظم نگاری ہے۔ شاعری کی پہلی ضروری صفت فسون کا رمی ہے۔ فسون کا رمی ”کا کام صرف میں مسرودہ جو کرنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی اس کے دلیف میں شامل ہے کہ وہ ہمارے چشم بصیرت میں ایسی روشنی پیدا کرے کہ ہمارے نگاہ میں عالم حیرت میں بھی اشیاء کے ظاہری پردوں سے گذر کر ان کے بطن و دروں تک پہنچیں اور پراسرار حقائق و ریاضت کر سکیں۔ ایتر فسون کا رانہ صفت کی موجودگی کے کسی کلام میں شعریت کی اصل روح پیدا نہیں ہو سکتی لیکن اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ شاعری کا ہر لفظ اور ہر فقرہ ساحرانہ ہوتا ہے بسا اوقات طویل مسلسل فقروں میں محروں کی سیریں پڑھ لینے پر بھی کوئی ہنسٹو کر کہ فقرہ نہیں ملتا اور ہم اکتا کر کہنے لگتے ہیں کہ شاعر نے کاوش و کاہش تو سخت کی ہے لیکن اس کے کلام میں شعریت کی روح مفقود ہے مگر مستقل مزاج قاری صبر تحمل سے کام لیتا ہے اس کی نگاہیں گرم تلاش رہتی ہیں بالآخر بعد بسا ارتقا رعب ساحرانہ فقرہ مل جاتا ہے تو اس پر حیرت و بخود کی حالت طاری ہو جاتی ہے یہ ساحرانہ لفظ یا فقرہ صرف ایک ہی سطر یا بیت میں گرمی ترپا اور نشیزیت پیدا نہیں کرتا بلکہ اپنے آگے پیچھے (دراورد گرد کی تمام

سطوں اور بیتوں میں برقی لہر دوڑا دیتا ہے۔ زبان کے تار بول و دیں جادو کا رنگہ انتر بھر دیتا ہے اور پورے کلام کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے دنیا کی ٹرس ٹرس مشہور رزمی نظموں مثلاً ہوسر کی آتیا اور طین کی فردوس گم شدہ کی غیر معمولی کامیابی کا راز یہی ہے بند کے بند پڑھتے جاؤ قلب میں نہ اہنزا پیدا ہو گا نہ سوز و گداز لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایسے اشعار ملتے جاتے ہیں گئے جن میں درد اور کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے انہیں درمیانی اشعار کی ساحرانہ قوت آس پاس کی بے کیف سطروں میں بھی حرارت اور چمک پیدا کر دیتی ہے طویل نظموں کی پر نسبت مختصر نظموں میں جادو کے الفاظ اور فقرے زیادہ دیکھنے میں آتے ہیں اسی بنا پر ایمرسن کو تسامع ہوا اور اس کی شتاب کاری نے نتیجہ افسردہ کر لیا کہ طویل نظموں پر شاعری کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا وہ عموماً منقطع واقعات ہوتی ہیں جن میں کیف و اثر نہیں پایا جاتا البتہ کہیں کہیں ایک آدھ شعر دیکھنے میں آ جاتا ہے جس کی اہنزا زسی قوت بغیر کلام کی بے اثر شری کی کلائی کا سامان مہیا کر دیتی ہے طویل نظموں کے یہی جیدہ جیدہ اشعار صحیح شاعری کے ضمن میں آ سکتے ہیں لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے جو الہامی اشعار ملتے ہیں ان کے ساحرانہ الفاظ اور فقرے ترشے ٹوٹے ہیرے کی طرح چھوٹے پڑتے ہیں اور ان کے پرتو سے ارد گرد کی چیزیں بھی چمکنے لگتی ہیں اور جو شعر پہلے دیکھے معلوم ہوتے ہوں ان میں اب بھی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

اد پر مذکور ہو چکا ہے کہ طویل نظموں کے مقابلہ میں مختصر نظموں زیادہ علمی الفاظ کی حامل ہوتی ہیں یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ غزل کا ہر شعر غزل کا آزادانہ مختصر نظم کے ہوتا ہے ایک شعر کو دسے شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ہر شعر بذاتِ خود ایک جملہ نامہ یا کلام مغیدہ ہے۔ اس لئے یہاں ایک شعر کا فلسفی لفظ یا ساحرانہ فقرہ دوسرے شعر کو متاثر نہیں کرتا جس شعر میں کوئی فسون کا راز لفظ و ترکیب نہ ہو وہ بودا پرست اور بھسپھسا ہو گا غزل کے ہر شعر میں فسون کاری کا علیحدہ علیحدہ سامان ہونا چاہئے ارد کے شعرا مختلف مسائل سے کلام میں غوی و دلکشی پیدا کرتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو اکثر ادیب شاعر میں ساحرانہ اثر اور فسون کا راز نہ عمل کا مرکز فارسی کی دہی لطیف و دلپذیر ترکیبیں ہوتی ہیں جن کو وطن پرست طبقہ غیر ملکی زبان سے تعبیر کرتا ہے مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ۛ

نام اُن کا آگیا جو کہیں دقت باز پرس	ہم تھے کہ اڑ گئے صدف محشر لئے ہوئے
کس کے خرام ناز نے قربیں دل ملا دیا	چمن سے سوراخ تھا میں اکے مجھے جگادیا
سوالِ اصل پر ہلنا پری رتھے ابرد کا	اشعارہ ہولت عاشقانِ رشتا آہو کا
کرم کچھ کج ہے ساتی کا دھرب ابھیز	کہ جرمہ جرمہ ہے موجِ نغم سحری
شور محشر امیر کو نہ جگا	
سو گیا ہے غریب سونے لے	

رشکِ فغان کی لائے رقیب آفرینیاں محشر نے خفتگانِ زمیں کو جگا دیا

ذرا ہو گرمی صحبت تو ناک کر دے چرخ
مراسرور ہے گل خندہ شکر کا سا
حریف ہے جگر جو صبر در نکل کی صحبت میں
نیا ز ناز کا جھگڑا اگر دغا ایک جرأت میں
ہنگامہ گرم کن جو دل ناہموں تھا
پیدا ہر ایک نالہ سے شور و لشور تھا
ہوا یہ سینہ کھسکا زار و دشت غم میرا
کہ آیا پاؤں آغشتہ ہو کر ب یہ دم میرا

ان اشعار کی تمام خوبی خط کشیدہ الفاظ کی ریشہ منت ہے بعض جگہ خیالات نہایت معمولی تھے لیکن فارسی ترکیبوں کی ندرت اور لطافت نے انہیں بہت اعلیٰ و ارفع اور پر کیف و دلکش بنا دیا۔ مسطر ابھر کر آہی اسی قسم کے فقرہوں کو مسودات و انوش خیال کرتے ہیں لیکن دراصل وہ صرف جادو کا نہیں بلکہ مسیحا کی کام کرتے ہیں مردہ اشعار میں جان و حیا دینا ان کا ادنیٰ کرشمہ ہی۔ قدماں تمام گروں سے واقف تھے چنانچہ مکتوب نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ لاساتہ کی غزلوں میں بھی صرف وہ تین ہی اشعار راہبانی ہوتے ہیں جو سامع کے احساسات کو مشتعل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں غزل کا بقیہ نصاف فارسی کی چٹ دلدازہ ترکیبوں کے خبیثہ سے بڑا کر دیا جاتا ہے الغرض جو الفاظ اور فقرے اردو شاعری کے تمام حسن و خوبی کا منبع ہیں جو دناویز ترکیبیں شعر کی جان ہیں اور اپنے فنوں کا راز ان سے سامعین کو مسکور و بخود بنا دیتی ہیں، اگر کامیاب سرمایہ ملی کی خوشنودی کی خاطر انہیں سے دست بردار می اختیار کر لی جائے تو اردو کا ذخیرہ شاعری بالکل مریں کا سد بخائیگا جس کی کوئی قدر قیمت نہ ہوگی۔

لیکن فارسی ترکیبوں کے اعجاز و انحصار اور سحرانہ اثرات و غیبیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے تاریخ ادبیات اردو کے فعل مصنف شکوہ سچ ہیں۔ کہ اردو کے قدیم غزل گو شعرائے فارسی کی نامانوس اور شاندار ترکیبوں کے آگے بھاشا کی شیرینی اور نزاکت کو نظر انداز کر دیا جو چیز اردو شاعری کی گلی میں پڑی ہو اس کو نامانوس قرار دینا گویا چند پر دھول ڈالنا ہے ممکن ہے کہ بھاشا کی شاعری میں کسی حد تک شیرینی اور نزاکت پائی جاتی ہو لیکن یہ ایک محدود ذائقہ اور گننام شاعری ہے ایک محدود مخصوص خطہ ایک کے باہر سے کون جانتا ہے مگر فارسی شاعری کی لطافتوں اور نزاکتوں کی ایک عالم میں محوم ہے فارسی شاعری کو دنیا کے کلاسیکل پچر (ادب العالیہ) میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے جہاں نکلے بان کی شیرینی اور نزاکت کا تعلق ہے۔ دنیا کی کوئی زبان اس کی بھاشا کے مقابلہ کر سکتی ہے بھاشا کہاں کی ایسی ترقی یافتہ زبان ہے کہ وہ فارسی جیسی ہمہ گیر و شہرہ آفاق زبان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے اس میں اتنی قوت و گیرائی کہاں کہ وہ اردو شاعری کے لئے نمونہ کام کاام دیتی اور پر بیان ہو چکا ہے۔ کہ بھاشا کی عشق پر شاعری الہام و الفاظ کا نتیجہ نہیں ہوتی اور اس کا طرز اظہار بالکل مصنوعی و غیر فطری ہوتا ہے اثر کے لحاظ سے بھی اس کا زامزادہ وادہ و قیغ نہیں بھاشا کی شاعری کے متعلق عجیب غریب ذمہ داران بیان دیکھنے میں آتے ہیں عام طور پر مشہور ہے کہ بھاشا کی شاعری میں عاشقانہ احساس کی اس قدر شدت اور گرمی پائی جاتی ہے کہ دنیا کی شاید ہی کوئی زبان اس کی حریف بن سکے لیکن یہ غلو آمیز بیان صداقت سے اتنا ہی بعید ہے جتنی نور سے ظلمت۔

ماہرین فن کا خیال ہے کہ وہی شعر نہایت پُر اثر اور کیف آور ہوتا ہے جسے پڑھ کر انسان محسوس کرے کہ یہ میر کی ملی

آواز اور قلبی پکار کی صدائے بازگشت ہے جو شعر سامع کے خیالات و جذبات کے آئینہ دار نہیں ہوتے وہ کیفیت اثری بالعموم معراہوتے ہیں۔ غالب نے اسی نکتہ کو اس شعر میں بیان کیا ہے

دیکھنا تو میر کی لذت کہ جو اُس نے کہا

میں نے یہ جاننا کہ گویا بھی میرے دل میں ہے

اسی لئے اساتذہ سخن اپنے شخصی و انفرادی تجربات و ذہنی و ادراکات قلبیہ کو بھی عمومی رنگ میں پیش کرتے ہیں مضمون شعر

کا عامۃً اللورد ہونا بہت بڑا ضعف ہے میرا دردِ درد کے اشعار کی نشتر تین و پنجیت کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہ بیان تو کرتے ہیں اپنے ذاتی تجربات لیکن طریقہ بیان ایسا اختیار کرتے ہیں کہ ہر شخص انہیں اپنے حالات و واقعات کے مطابق پاتا ہے۔ مثلاً میر کا ایک شعر ہے

کہتے تو ہویوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا

سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

عاشق شدت انتظار سے تیار ہو کر عشق کے خلاف ٹکائے گا ایک دفتر تیار کر لیتا ہے اور دل میں سوچتا ہے

کہ ملاقات ہونے پر خوب چلی کٹی سداؤں گا لیکن جب معشوق آتا ہے تو اس کے رعبِ حق سے عاشق کو سخت کلامی کی ہمت نہیں ہوتی۔ بلکہ خود عاشق کا دوفرشوق اسے بجائے شکوہ بھی کہ عجز و نیاز کے اظہار پر مجبور کرتا ہے یہ معاملہ صرف عشق جنوں پرورد کے بادیہ پیماؤں ہی کے ساتھ پیش نہیں آتا بلکہ ہر شخص کو جو کسی کافر یا اسے غلطی پر بہت بھی محبت رکھتا ہے اس کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا فی الحقیقت یہ ایک عامۃً اللورد و واقعہ ہے۔

اب بھاشا کی عشقیہ شاعری پر غور کیجئے اس شاعری کو مردانہ جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں صرف عورتوں کے

جذبات و حیات کی مرد کوئی کی جانب سے ترجمانی کی گئی ہے۔ جب تک مرد خود کو عورت نہ تصور کر لے اس وقت تک یہ شاعری اس کے ذہنی حالات و دلی کیفیات کے مطابق نہیں ہو سکتی لیکن مرد کا اپنے اوپر عورتوں کے جذبات و احساسات طاری کر لینا خلافِ فطرت اور محال ہے۔ اس بنا پر بھاشا کی عشقیہ شاعری مرد کے جذبات و عاید حیات لطیفہ کو مشتعل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ارد و غزل کے اکثر اشعار عشق مجازی و عشق حقیقی دونوں پر منطبق ہوتے ہیں لیکن بھاشا کی شاعری میں عشق حقیقی یا تصوف کی مئے و آتش کی تندگی بہت کم پائی جاتی ہے۔ یہاں شاہ حقیقی کے ساتھ بھی اظہار محبت کا وہی مجہول انفعالی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو نئی دہلی دہن اختیار کرتی ہے خود کو گولہنِ زخم کر لینا ممکن ہو تو ہو لیکن دہن کے حقیقی جذبات و احساسات اپنے اندر پیدا کر لینا غیر ممکن ہے ہر طور بھاشا کی شاعری نہ مردانہ جذبات کی ترجمانی کرتی ہے نہ بچھنے والے کے احساسات کی آئینہ داری۔

بھاشا کے حامی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی آبادی صرف مردوں ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ نصف آبادی صنفِ نازک کی ہے مرد کے جذبات کی ترجمانی اگر نہیں ہوئی تو کیا ہر جہاں ہی کیا کم ہے کہ دنیا کی نصف آبادی کی تسلی و تسخنی کا یہاں کافی سامان موجود ہے لیکن جب

کوئی شریف قانون بھاشا کے دلولیز و پرجوش اشعار سنتی ہے تو کائن پر ماتہ دھرتی ہے اور کہتی ہے کہ ماشا و کلائیہ نالرو شیون اس باحیا مخلوق کا نہیں ہے جو عورت کہلاتی ہے مردوں نے اپنے جی سے تمام بے شرمی کی باتیں گھڑ کر ہماری سوائی و دنیا کا سامان اکٹھا کر لیا ہے ہم بھی اپنے رازدروں کو اس طرح طشت از بام نہ کرتے۔ اور نہ کبھی اپنے درد و دل کا ڈھنڈورا بجاتے جب تک کسی عورت کے دیدہ کا پانی نہ گر جائے۔ وہ ہرگز مردوں کی سمجھ میں نہیں بل دکھانے پر آمادہ نہ ہوگی ہماری بغیت بسائی اور شرم و حیا ان باتوں کو زبان پر لانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتی جنہیں بھاشا کے ظالم شاعر نے ہماری طرف منسوب کر دیا ہے ہم چاہے ہیں مجبور ہیں بے بس ہیں کریں تو کیا کریں مردوں کے بوجی میں آیا بے دھڑک کدیا قلم ان کا۔ زبان ان کی ہماری غت خود داری کا کچھ پاس نہ کیا۔ پھر یہی ہم ڈکھے کی چوٹ کھتے ہیں۔ کہ بھاشا کے شاعروں نے جو کچھ ہرزہ سر لائی کی ہے۔ وہ ہماری زبان نہیں۔ ہماری پکار نہیں ہمارا انداز زبان نہیں یہ تمام امور ہماری فطرت و طبیعت کے منافی ہیں۔

ان حالات کے مد نظر بھاشا کی عشقہ شاعری محض مصنوعی بے اصل اور غیر فطری نہیں تو اد کہیا ہے دعویٰ کیا جاتا ہوا اس شاعری میں احساسات کو مشتعل کرنے کے لئے انتہا درجہ کی شدت و حرارت پائی جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کے جذبات کو براہیگت کرتی ہے۔ کیا وہ ہمارے جذبات کا لیدر احساسات لطیفہ میں جنش و حرکت اور دل و دماغ میں اپتران و انبساط پیدا کرنیکی قوت و صلاحیت رکھتی ہے، ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ شباب کی سرستوں سے مغلوب ہو کر جب کوئی ماہ جیس اپنی ایللی چال چال دکھائیگی۔ تو لامحالہ ناز برداروں کے خرمن صبر و سکون پر یکبارگی گرائیگی جب کوئی کافر از خود پیش قدمی کرے گی، آغوش محبت کھولے گی مقررہ سی و چھینی دکھائے گی دست نمنا دراز کرے گی۔ تو لازمی طور پر دوسری جانب سے ہوس کی دلفس پرستی استقبال کے لئے آگے بڑھے گی غرض کہ ایک نوخیز مجبور کی درد سر لائی طرف جذبات کیغذہ و خواہشات مغلیہ بھی کو براہیگت کر سکتی ہے البتہ قرون وسطیٰ کا کوئی مبارز (ناٹ)، اگر بھاشا کے اشعار سننے تو بہت ممکن ہے کہ وہ صنعت نازک کے نال و شیون سمو بتیاب ہو جائے اس کے دل میں بجائے جذبہ شہوانی کے رحم اور ترس کا احساس پیدا ہو اور وہ اُس کی امداد و اعانت کے لئے آگے بڑھے مختصر یہ کہ بیاہن کیسے کیل دن بہار کے یا پھار و چھار دوسری ہنیاں البیلیہ ستیاں یا اسی تماش کی اور شاعری کا سارا کارنامہ یہی ہے کہ وہ یا تو نوجوانوں کے جذبہ ہوسنا کی کو اشتغال دے یا معر و سنجیدہ لوگوں کے دلوں میں ترس اور رحم کا احساس پیدا کرے علاوہ بریں بھاشا کوئی ایسی ہنڈیہ تمدن اور ترقی یافتہ زبان بھی نہیں ہے۔ اور نہ اس کا دامن ایسے علمی و ادبی خزانوں سے معمور ہے۔ کہ اردو کو اس سے خوشہ چینی کی ضرورت لاحق ہو۔ اردو ادب شاعری کو براہ اعتبار سے بھاشا پر ترجع و نفوق حاصل ہو۔ اس لئے اس کی خود داری و حیت ہرگز اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے سے کمتر درجہ کی زبان کو اپنا خضر راہ سمجھے اور اس کے نقش قدم پر چلے۔

آج کل ملک میں کئی زبردست علمی ادارے قائم ہوئے ہیں جو اپنا مقصد اردو کی اصلاح و ترقی بتاتے ہیں لیکن وہ تجویزیں پیش کرتے ہیں ان پر عمل کرنے سے اردو زبان ترقی کرنے کے بجائے رو بہ زوال ہو جائیگی اور اس کا بیخ بنی ہوئی ہے

پستی کی جانب مائل ہو جائے گا۔ ان کی پہلی مہلک تجویز یہ ہے کہ اردو ادب شاعری سے جہاں تک ممکن ہو فارسی و عربی الفاظ خارج کر دئے جائیں اور ان کی جگہ ہندی کے الفاظ استعمال کئے جائیں ان کا خیال ہے کہ اردو زبان کی زمین ہندی ہے جس پر محض خوشنمائی کے لئے عربی و فارسی کے سیل پوٹے بنائے گئے ہیں۔ اگرچہ ادب شاعری میں الفاظ و ترکیب کی خوشنمائی و دلنمائی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے بلکہ بعضوں کے نزدیک مشاطگی کو افادت پر تفریق چل ہے تاہم عربی و فارسی کے الفاظ صرف سیل بوٹوں ہی کا کام نہیں دیتے۔ بلکہ ابتدا ہی سے وہ اردو ادب شاعری کی جان ہیں جو اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں اور جزو بدن بھی بن گئے ہیں۔ ان کا اخراج گویا جہد شاعری سے جان کو جدا کرنا اور اسے مردہ بنانا ہے نثر سے ان کا اخراج اگر ہلاکت آور نہیں تو کم سے کم اعصاب و جوارح کی قطع و برید کے باعث ضرور ہے اردو میں اعلیٰ و لطیف جذبات اور بلند و نازک خیالات کی ترجمانی کے لئے عربی و فارسی الفاظ ناگزیر ہیں کوئی زبان اگر صرف کاروباری ضروریات کے لئے استعمال ہوتی ہو اور محض بول چال تک محدود ہو تو معمولی لفظوں سے کام چل سکتا ہے لیکن اس میں علمی و ادبی شان پیدا کرنے کے لئے اس کو عام روش سے بالاتر بنانے کی ضرورت ہے جو زبان صرف عین دین اور سودا سلف کے لئے استعمال ہوتی ہو اس سے شاعر کا کام نہیں چل سکتا شاعر ایسے الفاظ منتخب اور ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے جو جذبات و حسیات میں توجہ و ظلم پیدا کر سکے۔ اس لئے اس کو کسی قدیم کلاسیکل ٹھیکر کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے چنانچہ یورپ کی تمام ترقی پذیر زبانیں یونانی و لاطینی میراث ادب کو اپنے لئے خضرارہ سمجھتی ہیں۔ لطیف نازک اور پیچیدہ خیالات کے اظہار کے لئے اس سے استمداد کرتی ہیں علمی و حکمیاتی اصطلاحات تو زیادہ تریونانی و لاطینی ہی کی مدد سے بنائی جاتی ہیں واضح رہے کہ ہر نئی زبان اسی قدیم ادب العالیہ کا سہارا ڈھونڈتی ہے جو اس کی فطرت طبعیت و ہئیت و ساخت کے مطابق ہوتا ہے فارسی و عربی اردو کے ساتھ اور سنسکرت ہندی کے ساتھ میل کھاتی ہے۔ اس لئے ہر دو زبانیں اپنے ساتھ میل کھانے والی قدیم السنہ سے استفادہ کر رہی ہیں نئی زبان کے ارتقا و ترقی کا یہی قدرتی طریقہ ہے۔ آج کل یہ خیال دیا کی طرح پھیلا ہوا ہے کہ مملکت نے اردو زبان کو فارسی و عربی کے ادق و مغلق الفاظ سے اور پینڈوز نے ہندی کو سنسکرت کے سخت و غیر مانوس الفاظ سے گرا بنا کر دیا ہے لیکن جو صاحب نظر ہیں وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے فطری قانون سانی اصول کے تحت عمل میں آ رہا ہے اس میں سچاے حاملوں اور پینڈوز کے تعصب کو مطلق دخل نہیں اعلیٰ اور شاندار خیالات اپنے اظہار کے لئے پر شکوہ و جزیل الفاظ کے متقاضی ہوتے ہیں البتہ سادہ و بسیط خیال کے لئے سادہ و معمولی الفاظ کافی ہیں خیال اور لفظ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ماہرین نفسیات جانتے ہیں کہ کبھی مجرد خیال بغیر لفظی جامہ کے ہوائے دماغ میں رونا نہیں بٹتا اعلیٰ خیال اعلیٰ لباس میں اور سادہ خیال سادہ لباس میں جبکہ اگر ہوتا ہے شیخ عبدالقادر صاحب دیرمخزن کا بیان ہے کہ جب زمانہ میں ڈاکٹر اقبال کی نظیں مخزن میں شائع ہوئیں کرتی تھیں اس وقت بعض لوگوں کو شکایت تھی کہ وہ بہت ادق اور شکل الفاظ استعمال کرتے ہیں نامی کی سنجیدہ ترکیبوں کی وجہ سے ان کا کلام عام فہم نہیں ہوتا۔ یہ شکایت ڈاکٹر اقبال تک پہنچا دی گئی جس پر انہوں نے مجبوراً ہی کا اظہار کرتے

ہوئے فرمایا کہ اعلیٰ دارف خیات سہل اور سادہ الفاظ میں ادا ہو ہی نہیں سکتے خیالات کی جدت و ندرت شاعر کو نئی نئی ترکیبیں تڑا پر مجبور کرتی ہے مرزا غالب بھی اپنے کلام میں صرف شوکتِ حُرالت پیدا کرنے کے لئے قصداً فارسی کی پیچیدہ اور انوکھی ترکیبیں استعمال نہ کرتے تھے۔ بلکہ وہ اس امر پر نظرِ جامعور تھے۔ ایک تو ان کی طبیعت ہی مشکل پسند واقع ہوئی تھی دوسرے ان کا فکر فلک پر اڑتا تھا اور عام پست سطح پر شازادہ نادر ہی اترتا تھا۔ اس لئے خیالات کی بلند میٹری طریقہ کی مناسبت سے ان کے پیرائے بیان میں بھی علویت۔ ندرت اور نزاکت پائی جاتی ہے اردو زبان جب تک محض بول چال کی زبان تھی اس کا ذخیرہ الفاظ نہایت سادہ سہل اور محدود تھا۔ لیکن جوں جوں اس میں علمی ادبی شان پیدا ہوتی گئی اس کی لغت بڑھتی گئی اور خیالات کی رفعت و لطافت کے ساتھ ساتھ شاندار الفاظ اور خوشنما فارسی ترکیبوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اسی اصول پر ہندی زبان کھڑی تھی ہوئی ادبی ترقی کے ساتھ خیالات میں نزاکت و لطافت پیدا ہوتی گئی جب نازک و لطیف خیالات کے اظہار کے لئے معمولی بول چال کے لفظ کافی ثابت ہوئے تو ہندی نے سنسکرت کے خزانے ادب سے خوش چینی شروع کی اب اگر اردو زبان فارسی و عربی عناصر سے اور ہندی زبان ان چیزوں سے جو سنسکرت سے ماخوذ ہیں محروم کر دی جائیں تو دونوں کے ادبِ شاعری پر زلزلہ آجائے گا دونوں محض قصہ کہانیوں کی زبان بن جائیں گی۔ دونوں کی نگہ دو حرف پکھٹ میسے اور سسرال کی باتوں اور ساسِ نند کی شکایتوں تک محدود ہو جائے گی ان میں اعلیٰ علمی ادبی و تنقیدی مضامین کے بیان اور باریک موخیا و فلسفیانہ و حکیمانہ نکات کے اظہار کی مطلق صلاحیت باقی نہ رہے گی۔

ہندوستان میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو محض ادب کو سیاست کا میدان تصور کرتے ہیں وہ ہندوستان کی مختلف انسل قوموں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے ایک مشترکہ زبان کا وجود ضروری سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مشترکہ زبان (نگوا فرینک) اس نہت تک معروضِ وجود میں نہیں آسکتی جب تک ہندوستان کی دو حریف زبانیں یعنی اردو اور ہندی اپنی غیرت و اجنبیت دور کر کے ایک دوسرے سے معاہدہ نہ کریں لیکن دونوں کے لئے بغیر اپنی اپنی خصوصیات ترک کئے ہوئے کسی تکمیل محال ہے علاوہ بریں ان کو آپس میں معاہدہ کرنے کے لئے اس پست سطح پر اترنا پڑے گا جسے متبادلِ سو فیادِ خفیت اور ابا زاری کہتے ہیں منظر و چالاک ہندی جانتی ہے کہ اتحاد و اتفاق کا خوش آئند خیال اس نفاقستانِ ہند میں کبھی شرمندہ عمل ہونے والا نہیں اس لئے وہ سنسکرتِ کمزور موزن سے ایک قدم پیچھے ہٹنا بھی گوارا نہیں کرتی لیکن سادہ لوح اردو کو مشترکہ زبان بننے کا سبز باغ دکھا کر اس امر پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے شاندار ایرانی محفل میں دیسی ٹاٹ کا پوند لگا لے اسی قسم کی ایک ہلاکت بار کو شش کا خواہ دیتے ہوئے حضرت نیاز فتحپوری فرماتے ہیں کہ ہندی تو اپنے تری ماں پر کا کے اونچے سنگھاس سے کیسا بچ بھی نیچے نہ اتری لیکن بچا بڑا کونہ ماہی کا عالیشان کاخ چھوڑ کر تھامی کے کس خانہ میں منتقل ہونے پر مجبور کیا گیا اہل زبان چلاتے ہی وہ گئے کہ اردو کی لسانی خصوصیات کے لحاظ سے یہ جدتِ ترکیب بہت بڑی بدلتگوئی ہے اگر ایسی ادھی ترکیبیں جاری رہیں تو قریب ہی مہینہ کے بعد اردو کا جنازہ بکس جائے گا تھامی کے معنی چھ ماہی کے تپاس پر وہ روم ہونگے جو کسی کے مرنے کے تین مہینہ کے بعد ادا ہتے ہیں یہ نشانِ جو اس حقیقت کی کہ کس طرح فارسی کی طبع و خوشنما ترکیبیں معمولی خیال کو نہایت بند کر دیتی ہیں لیکن دیسی یا ہندی آمرتِ ترکیبِ بلند

معنی کو پست و خفیت بنا دیتی ہے بات یہ ہے کہ فارسی غصہ ترک کر دینے اور بیسی چیزیں قبول کر لینے صلاح دینا تو نہایت آسان کام ہے لیکن اس پر کاہنہ ہو کر کوئی اعلیٰ ادبی تنقیدی علمی یا فنی کا نام پیش کرنا ناممکن ہے۔ تاہم دلی زبان میں بڑی کوششوں اور جانکامیوں سے صرف قصہ کہانی یا مختصر سافذ لکھا جاسکتا ہے۔

بزم ادب میں اصول سیاست آج کرنے والوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ایک مشترکہ زبان اختیار کرنے کا یہ طریقہ قدرت نہیں کہ اردو یا ہندی کو اس کی اعلیٰ علمی ادبی منزل سے بچے کھینچ کر عام بازاری سطح پر پہنچا دیا جائے تاکہ ملک کی اکثر آبادی اسے سمجھ سکے اور صرف لین دین کے معاملات میں اسے استعمال کرے ادل تو ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں مختلف نسلیں اور مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں اور مختلف بولیاں بولتے ہیں ایک مشترکہ زبان کا خواہہ دیکھنا ہی بے سود ہے بنگالی۔ اڑیائیگی۔ ملیالم۔ تمل۔ کشری۔ مرٹی بولنے والی قوموں نے کبھی اردو یا ہندی کو بطور مشترکہ زبان کے اختیار کرنے کے لئے آمادگی ظاہر نہیں کی ہے۔ صرف شمالی ہند کو بعض عربوں ہی میں ایک مشترکہ زبان کا خواہہ دیکھا جاتا ہے۔ ریاست حیدرآباد کی بات ہی اور ہے یہاں اردو کو سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل ہے یہاں ذریعہ تعلیم اردو ہونے کی وجہ سے ہر قوم اور ہر فرقہ کا بڑھا لکھا شخص عام اس سے کراس کی مادری زبان مرٹی ہو یا کوئی اور زبان اردو سے واقفیت رکھتا ہے اگر گل ہند کے لئے ایک مشترکہ زبان کا قیام ممکنات سے بے بسی تو یہ کیا ضرور ہے کہ پچھلے اردو ہی کو آزمائشوں میں پھنسا کر اس پر قطع کر دیا جائے ہندی بھی تو اردو کی سب سے زبردست حریف ہے اس لئے حرکت کے عناصر سے پاک کر کے نچے سطح پر لائے اور مشترکہ زبان بنانے کی کوشش کیوں نہیں کی جاتی۔ دوسری قومیں ہوشیار اور دور اندیش ہیں۔ وہ کسی ناممکن العمل فرضی و خیالی بات کی تکمیل کے لئے اپنی زبان کی صورت و ہیئت بگاڑنا پسند نہیں کرتیں علمیان ہندی کا بلند حوصلہ ہندی کو اس کی تمام خصوصیات قائم رکھ کر ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانا چاہتا ہے لیکن اردو کے سادہ لوح علمبردار اپنی زبان کو مشترکہ زبان بنانے کی انگنگ میں اس کی تمام اغلیا زسی خصوصیات سے دست بردار ہو جانے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔

مشترکہ زبان کے قیام کے متعلق ہمارے سامنے امریکہ کی بہترین مثال موجود ہے جس سے اہل ہند ہدایت و بصیرت حاصل کر سکتے ہیں جب امریکہ دریافت ہوا تو مختلف یورپی ممالک کی فاضل آبادی جو زیادہ تر مغربی پمیشل تھی تلاش در زنگار میں جوت جوت دہاں جاہسی بعض امریکی جا کر اس لئے آباد ہو گئے۔ کہ ان کے ہاتھائی شوق کے لئے دہاں وسیع میدان عمل موجود تھا۔ الغرض یہ لوگ اپنے اپنے دیس کی بولیاں بولتے تھے۔ مبرور زمانہ جب ان کو ایک متحدہ قوم بننے کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے مقدس لہو سے آزادی خریدی۔ تو ان کو ایک مشترکہ زبان کی بھی ضرورت پیش آئی۔ لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے اپنی بھانت بھانت کی بولیوں کے اختلاط و آمیزش سے کچھ ٹی بیار نہیں کی بلکہ انگریزی جیسی مہذب ترقی یافتہ زبان کو مع اس کی قدیم روایات تعلیمات اور فنی و معدنی اصول کے اپنی مشترکہ زبان تسلیم کر لیا اور سب نے متحد ہو کر اس کی ترقی کے لئے انہیں قواعد و ضوابط کے مطابق کوشش شروع کر دی جن پر خود اہل انگلستان کا بے ہمتیہ مگر اہل ہند بھی محض دکھائے

کے لئے نہیں بلکہ غلوس و دیانت کے ساتھ ایک مشترکہ زبان اختیار کرنا چاہتے ہوں تو اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ وہ انہی پہلے زبانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہو پھر ان کا فرض ہو گا کہ وہ اس منتخب زبان کی ترقی کے لئے متحدہ طور پر انہیں اصول و قوانین کے مطابق کوشش کریں جو اس کی نظرت ساخت اور طبیعت سے مل سکتے ہوں یعنی اگر وہ ہندسی کو مشترکہ زبان قرار دیں تو اس کے ارتقاء و ترقی کے لئے سنسکرت ہی کا سہارا دھوئیں۔ اور اگر اردو کو مشترکہ زبان بنائیں تو اس کے علمی و ادبی خزانہ کو بڑھانے کے لئے اس کی عادت، نظرت، ہیئت مصوت کے مد نظر عربی و فارسی سے استفادہ کریں۔ اور اس کی شاندار روایات و تعلیمات کو برقرار رکھیں۔

بعض حضرات کو "خالص اردو" لکھنے کا خط سمایا ہوا ہے۔ "خالص اردو" کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کلام میں کہیں فارسی عربی یا ترکی لفظ نہ آئے جائے۔ اس لزوم والا یلزم پر ندانی سلیم اپنی ہنسی ہو کہ نہیں سکتا۔ "خالص اردو" نتیجہ کے لحاظ سے کوہ کنڈ و کاہ برآوردن کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ بعض وقت تو وہ نہ اردو نظر آتی ہے نہ ہندسی اور اس پر پیرنیل صادق آتی ہے کہ "دھوبی کے کتے بن گئے"۔ گھر کے نہ گھاٹ کے "اس قسم کے کلام کے لئے کوئی اصطلاح بھی ہندسی وضع کی گھڑنی چاہئے تھی۔ یہاں "خالص لفظ عربی اور اردو" لفظ ترکی ہے۔ علاوہ بریں ایسی زبان کو جو عربی و فارسی الفاظ سے بالکل مبرا ہو "خالص اردو" سے نفرد کرنا اردو زبان کی پیدائش اور تاریخ ارتقاء سے ناواقفیت و عدم آگاہی کا پتہ دیتا ہے کہ نہ اردو زبان عربی و فارسی ترکی ہندسی الفاظ کے اختلاط سے معرض وجود میں آئی ہے "خالص زبان" اسی کو کہتے ہیں۔ جو اہل زبان بولتے ہیں اردو کے اہل زبان بغیر کسی تکلف و تعین کے جو بولی بولتے ہیں وہی "خالص اردو" ہے اور تکلف و تعین اور انتہام و التزام کے ساتھ جو زبان استعمال کی جائے۔ وہ غیر خالص ہے ہر شخص جانتا ہے کہ اردو کے اہل زبان عام بول چال میں سینکڑوں عربی و فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ شاعر کا تو کچھ کہنا نہیں "کلام میں حسن و خوبی اور کشش و اختصار پیدا کرنے کے لئے جو پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے وہ روزمرہ کی بول چال اور عوام کی روش و عمارت بہت بلند ہوتا ہے وہ کلام میں رفعت و طرخی لطافت اور جذبہ اثر پیدا کرنے کے لئے عربی و فارسی کے شاندار و بڑھتی الفاظ اور لطیف و دلپذیر ترکیبیں استعمال کرنے پر مجبور ہے ہندوستان میں صدیوں تک فارسی کا اقتدار و تسلط قائم رہنے کی وجہ سے ایسی زبانوں کو بھی اپنا دامن جبراً کشادہ کر کے بہتر ہے عربی و فارسی کے الفاظ قبول کرنے پڑے ہیں ایسی صورت میں "خالص اردو" سے عربی و فارسی الفاظ کا اخراج سخت مشکل و تیزاثر ہے انکے بغیر کلام دلیسا ہی بے مزہ ہو گا جیسا طعام بے نمک ہر شاعر و توجہات و حیات کو مشتعل کرنے کے لئے ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے جو دروش عام سے بلند تر ہو لیکن "خالص اردو" کے موجد کی عجیب ذہنیت روزمرہ کے الفاظ و محاورات سے بھی دست بردار ہو کر پست و قندیل زبان اختیار کرتی ہے۔ اور شاعری کو لزوم والا یلزم کا پابند کر کے ایسے مشکل و خیز بنا دیتی ہے۔ نام نہاد "خالص اردو" میں بھی تک انشا پر دازمی کا کوئی اعلیٰ نہ پیش نہیں ہوا ہے۔ اس طرز خاص کے موجد نے قفا و قفا صرف و تین صفوں کے مضمون تحریر کئے ہیں جن میں نگہٹ سسرال، میکے ساس، نند شادی، بیاباہ موتے وغیرہ متعلق برائی اور فرودہ باتیں درج ہیں اسی طرح ان کی نظموں میں بھی بجز پست و قندیل اور متوقیا و خیالات کے کبھی اعلیٰ تخیل یا لطیف جذبہ کے

نمونے دیکھنے میں نہیں آتے، یہ مسئلہ امر ہے کہ فارسی کی دلاؤ ترکیبوں میں شعر کو آسان بنا دیتی ہیں لیکن خالص اردو کا شیدائی بلند خیال کو اپنے ضعیف و تبدیل الفاظ کے ذریعے سخت اثری تک گرا دیتا ہے شخص یہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ اگر تشریک کے بدلے ڈولجی اور زحمت کے عوض کھکھیر کا لفظ باندھا جائے تو شعر کس قدر بے کیف پھسپھسا اور کھکھیز بن جائے گا بہر حال خالص اردو لکھنے کی کوشش کسی سیاحی یا عارضی صحت پر مبنی نہیں ہے جیسا کہ سوجہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ محض جدت طرزی کی خواہش اس عجیب غریب طرز کی محرک ہے لیکن اس طرزی اور انوکھے بن کے لئے جس قدر خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے وہ نتیجہ کے اعتبار سے صرف کوہ کندن دکاہ برآوردن کا حکم دھکتا ہے۔ فارسی کے بعض قدیم یا وہ گوشترا بھی جدت اور طرزی کے خط میں اپنے اد پر مہل پابندیاں عاید کرتے تھے کوئی اپنے کلام میں صرف غیر منقوط الفاظ کا التزام کرتا کوئی صرف نقطہ دار حروف لانے کی فکر میں ہوتا کوئی ایک حرف نقطہ دار اور ایک بے نقطہ استعمال کرتا کوئی صرف ایسے حروف لایا کی کوشش کرتا جس کے اد پر ہی نقطہ ہوں کوئی اس کے برعکس نیچے نقطہ دارے حروف استعمال کرنے میں مہمک ہوتا اس قسم کی مہل اور وقت کش پابندیوں کا شمار صنائعِ لفظی میں ہوتا تھا۔ اور ان کے لئے شاید ارم اصطلاحیں گھڑی گئی تھیں مثلاً مستطوطہ جملہ۔ رتظا۔ خیفاء۔ فوق النقا۔ تحت النقا۔ مقطع موصل واسع الشفتین اصل الشفتین متون منقوط۔ توش وغیرہ ان غیر ضروری پابندیوں کی وجہ سے اظہار خیال میں جو رکاوٹیں پیش ہوتی ہیں وہ اہل نظر کو پوشیدہ نہیں لزوم بالا یلزم کی مہل صنعتوں میں خالص اردو کی صنعت ایک جدا اضافہ ہے جس شاعر کو قدرت کی جانب سے طبع رواں کی دت عطا نہیں ہوتی وہ اتنی قسم کی مہل صنعت گرمی کو جو دت طبع کی علامت سمجھ لیتا ہے اور اس پر بفر کرتا ہے اسی فاش کے شاعر کی نسبت حافظ طیار رحمۃ نے فرمایا تھا کہ "صنعت گریت آطبع رواں ندارد" موجودہ زمانہ کا نقاد ایسے مہل و دیگر صنائع و بدائع کو شائبہ سخن کرنے پر زیادہ کمال نہیں بلکہ بدنامستہ قرار دیتا ہے "خالص اردو" بھی خرابا داب کا بدنامستہ ہے اس میں نکافات کا کوئی پہلو ہے نہ مستطوطی کا خالص اردو کا سودا جس قدر جلد دور ہو آنا ہی بہتر ہے۔

خاتمہ سخن پر سر مایہ ملی کے حامیوں سے ہماری التماس ہے کہ وہ اردو زبان کو قدرتی اصول کے مطابق ترقی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں۔ وہ خود بخود ان چیزوں کو اپنے اندر جذب کر لے گی جنہیں اس کی طبیعت قبول کرتی ہے عام اس سے کہ وہ دیسی ہوں یا بدیشی ہوں یا بیملکی مقامی ہوں یا غیر مقامی جو چیزیں اس میں جذب کیئیں ہو کر اس کا جزو بدن بن جائیں گی؟ وہ اس کا ذاتی سراپہ کہلائیں گی۔ زندہ زبان ساکن جامد شے نہیں ہے۔ بلکہ وہ روز بروز ترقی کرتی اور آگے بڑھتی رہتی ہے اور وہ زبان میں بھی ترقی و اضافہ کی بہت گمانش ہے لیکن اس میں صرف دیسی چیزیں بٹھوس دینے کا نام ترقی نہیں ہے نئی چیزیں خود دیسی ہوں یا بدیشی ایسی جو فی جہاں جن سے کلام کی لطافت یا کبیرگی اور زنجینی میں فرق نہ آنے پائے اگر اردو شاعری ایک طرف لکھتے بٹ کلب کرشن کھکھیر ڈولجی سمجھو تو وغیرہ کی ثقافت برداشت نہیں کر سکتی تو دوسری جانب اس کی نزاکت کو طغیت کا رانہ طرز۔ گدا رنگی شاعر لاؤت آئیر ہمسائے شفا پاش۔ تقدیس اسکا کام بزم زمیں۔ رض حیا بار وغیرہ جیسی نادر ترکیبوں کی گراں سنجی بھی گوارا نہیں غرض کہ اردو شاعری کو نہ دیسی چیزوں سے نفرت ہے نہ بدیشی شایا سے بلکہ اسے نفرت ہے ان چیزوں سے جو اس کی فطری نزاکت اور طبیعت

لطافت کے خلاف ہوں وہ ان اشیاء سے پرہیز کرنا چاہتی ہے جن سے اس کو رنگ لگ جانے کا اندیشہ ہے صحت بخش ہندی غذا کا وہ ہر وقت خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس کا دامن تعصب رنگ نظری کے دھبوں سے پاک ہے ابتدا ہی سے وہ تنہا فراخ دلی و کشادہ دینی کے ساتھ عربی فارسی ترکی برہمی ہندی پنجگالی اور انگریزی جہنستان کے پھولوں کو حب قدرت اپنے دامن میں جمع کرتی رہی ہے البتہ کاٹھن سے دامن بچانا اس کا قدیم شعار ہے اس کے خرمن میں دیسی ذخیرہ کی کمی نہیں لیکن جو ملی چیزیں اس کے پہلو میں غار بن کر کھلیں ان سے کنارہ کشی ہی مناسب ہے اس کی نظر دیسی اور بدیسی کے اعتبار سے بہت بلند ہے اس کا خزانہ بے شمار جواہرات سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ان کی حقیقی قدر قیمت سے واقف ہے سرکاری ملی کے حامی دیسی جواہر کو اگر انقدر اور بدیسی کو کم از خیال کہتے ہیں لیکن اردو شاعری کی نظر بلند ہے۔ وہ سچ اور پاسداری سے کسی شے کی قیمت نہیں لگاتی۔ اس لئے وہ حاسیان، سرائیکی کے معیار، قدردانی کو غلط سمجھتی ہے وہ دیسی خنزیریں کو بدیسی جواہرات پر محض ملی ہونے کی وجہ سے ترجیح نہیں دے سکتی اور نہ دونوں کو ہم پل تصور کر سکتی ہے ابن لوقتی مصلحت کو شہ ہزار چلاتی رہے کہ دیسی چیزوں کو بھی اپنی محفل سجاد اور شاندار فیض ملی کارناموں کے پہلو میں بودی اور پست ملی کارگزاریوں کو بھی جگہ دو لیکن اردو ادب شاعری کی انصاف پسند طبیعت مصلحت و ذلت سے مغلوب نہیں ہوتی۔ وہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے پہلو پہلو بٹھانے سے صاف انکار کر دیتی ہے اس کی اس نصف شاعری مردانگی اور بے تعصبی کے بدل نظر سرائیکی کے مصلحت کو ش حاسیوں سے ہماری آخری گزارش ہے کہ وہ اردو ادب شاعری پر رحم کرے اسے سجدہ زار کی شکل کش سے باہر کھیں کسی سیاسی معاشرتی یا قومی سماجی مقصد کے درپردہ اس کی شعریت رنگینی لطافت اور دلکشی کا خون نہ کریں اور حضرت جویش کی نصیحت کان دھ کر زمین سے

بہر خورشود سی اغیار یگانوں کو نہ چھیڑ

صرف اپنے پہ چڑھتی ہے وہ تلوار نہ بن

محمد حسین ادیب

تم غرت و خود داری پر یقین نہ کر سکو گے۔

جب تک تم خود اسے حاصل نہ کر لو گے۔

اپنے آپ کو پاکیزہ و خوش دل بنا لے رکھو۔

تم وہ دیکھو جو جس میں سے تم دنیا کو دیکھتے ہو۔

قرآنی بعض لوگوں کو بہت پسند ہے کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے وہ بغیر قابلیت کے مشہور ہو جاتے ہیں
(برنارڈ شا)

غزل

اُس نے گویا نہ مانی میری
اُس نگاہ غلط انداز سے پوچھ
تجھ کو مجبور و فدا کر دے گی
میں کہ ہوں کشتہ بے مہر و دت
نہ امٹکیں ہیں نہ امیدیں ہیں
ناز پروردہ ناکامی ہے
میں ہوں گم گشتہ راہ الفت
سُن تولی رام کہانی میری
خلش درد نہانی میری
مری آشفۃ بیانی میری
ہے غزل مرثیہ خوانی میری
کیا جوانی ہے جوانی میری
تپش سوز نہانی میری
بے نشانی ہے نشانی میری

سرور! اے موفقی! اظالم
ہے غزل رشکِ فغانی میری

سروری

غزل

کیا بتلا میں تم کو، عاشق کیوں کڑختے کیوں دیتے ہیں؟
کروٹ بدلی آہیں کھینچیں اٹھ بیٹھے پھر لیٹ رہے
دیکھ آئے تصویر بنائی ہجڑے کچھ پھر دیکھ آئے
سر پھوڑیں یا جان گنوائیں ملنا اُس کا مشکل ہے
کاش کسی دن تم بھی دیکھو کیا حسرت کا وقت ہو وہ
ان غم کے اردو کو صدے ایسے ہی کچھ ہوتے ہیں
اپنی تو شب یوں کٹتی ہو سونے والے سونے میں
اب تو کام ہی پکڑا ہے وقت اسی میں کھوتے ہیں
اور کریں کیا مجبوری میں بیٹھے دل کو دیتے ہیں
جب ہم صبح کو اٹھ کر پہلے منہ اشکوں سے دھوتے ہیں
کیا کچھ کچھ بس نہیں چلتا، دلجوئی کا کام نہیں
تیری حالت سُن کے سیفِ دل کے ٹکڑے ہوتے ہیں

سیفی نوگا نومی

لاٹری

ایک کشادہ مکان ہے جس میں بہت سی فزاد بیٹھے ہیں اگرچہ ان سب میں بظاہر کوئی تعزین نہیں مگر یہ غور دیکھنے سے یہ دو فرقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں ایک فرقہ کے کپڑے دوسرے فرقے سے قدرے کم قیمت اور زیادہ گھسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں یہ لوگ ایک دھیر عمر کی عورت کو امی جان کہہ کر پکارتے ہیں جو ایک کٹھڑی میں رہی ہے ان سب کی آپس میں ایسی بے تکلفی ہے کہ یہ ایک گھرانے کے معلوم ہوتے ہیں دوسری طرف ایک نوجوان لڑکا ہے جو بسکی کا قمیص پہنے ہوئے ہے جن لوگوں سے وہ ہم کلام ہو بھی لاسکے لحاظ سے اول لڈکے فرقے سے زیادہ ممتاز ہیں ایک چھوٹا لڑکا داخل ہوتا ہے،

تھکا دہیں باتیں سننا، لاٹری کے متعلق کہتا تھا۔

لڑکا۔ سلام علیکم۔

آپا جان، کیا لاٹری کے متعلق؟

امی جان۔ علیکم السلام۔ ظہیر آج اتنی دیر سو

ظہیر کہتا تھا کلکتہ میں ایک لاٹری چمکتی ہے گزشتہ

آئے ہوا سکول تو کبھی کا بند ہو گیا ہوگا۔

سال اس میں ایک بڑی جماعت کے لڑکے کے نام ایک لاکھ روپے جکے

ایک لڑکی۔ امی جان یہ بازار میں کھینڈا رہتا ہے

اور پر سال ہی ایک کوچہ ان تھا اسے پچاس ہزار روپے ملے

آپ اسے کچھ نہیں کہتیں۔

صغرا۔ پچاس ہزار روپے؟

لڑکا۔ آپا صغرا تم ہر وقت میرے پیچھے پڑی رہتی ہو

امی جان۔ اے یہ لوگ بڑی نہیں ہاتھتے رہتے ہیں

میں کبڑے سے آیا ہوں (دبستہ نکت پر رکھتے ہوئے) روز تو

لاکھ اور ہزار اسب دھوکا ہے۔

اتنی جلدی آجاتا ہوں۔

آپا جان، نہیں امی جان بالکل صو کا تو نہیں تو ہا ہوگا

صغرا۔ پرسوں کیا ہوا تھا پانچ بجے گھر پہنچا تھا۔

یہ باتیں ہمارے سکول میں بھی ہوتی تھیں میرا تو خیال ہے شاید وہ اخبار

اور پھر کل صبح فوجی ہی سکول چلا گیا تھا۔ تو نہیں کسی کا کہا

میں چھاپ دیتے ہیں اور پھر یہاں کیا رہنا ہے ولایت میں تو ہر ملک

مانتا۔

میں جڑی جڑی لاٹریاں نکلتی ہیں۔

ایک بڑی لڑکی۔ صغرا تو بھی تو ہر وقت اس کے

امی جان، تو اپنے نام آپ ہی نکال لیتے ہو گئے ہم نے

محلے کا مار ہوئی رہتی ہے کیوں ظہیر آج کیوں دیر ہو گئی؟

تو کبھی اپنے جاننے والوں کے نام کچھ نکالتا نہ دیکھا۔

ظہیر آج اپنا سکول ہی دیر سے بند ہوا تھا

صغرا۔ امی جان یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لوگ کچھ جانتے

آج ہمارا ایک ماسٹر جو ہمیں ڈرائنگ پڑھاتا ہے اس کا اخیر کا گھنٹہ

ہی ہو گئے جولاٹری ڈالتے ہیں

امی جان۔ خاک جانتے ہیں یہ جولاٹری دہلی میں بھی
تھی۔ پار سال اس میں شیا کے آبجی نے سنا ہے پانچ پانچ روپے -
کے پانچ نام ڈالے تھے ایک بھی نہ بھلا۔

ظہیر گرمی جان کسی کا نام تو نکلتا ہے یہ جو کوچوان
کے نام پچاس ہزار اور اس لڑکے کے نام ایک لاکھ روپے نکلا تھا اس
میں کہاں دھوکا تھا چچا اکرم سے پوچھ لیجئے۔

امی جان۔ دھمنی کے ددے کے کنا سے بیٹھے تھے بکنا
پوش کو غلبہ کے کہیں اکرم تمہیں معلوم ہے یہ لاکھ روپے او
پچاس ہزار روپے کی لاٹریوں کا؟

اکرم۔ بھابی جان سننا ہوں کہ انگلینڈ میں روز کسی
ٹائمنٹ یا کسی ہوٹل ڈرائیور یا کسی مزدور کے نام دس ہزار پونڈ
کبھی پانچ ہزار پونڈ مل آتے ہیں۔

ظہیر دیکھا میں نہ کہتا تھا.....

صغرا۔ اچھا چپ رہ.....

امی جان۔ تم کبھی بات بھی کرنے دیا کرتے ہو؟ اور اکرم
سے، ان کے ملک میں مزدوروں کے نام مل آتے ہو گئے یہاں
میں نے تو کبھی سنا نہیں۔

اکرم۔ نہیں نہیں یہاں کبھی ایسا ہو جاتا ہے
مگر یہاں لاٹریوں میں لوگ دھوکے بہت کرتے ہیں کسی دفعہ تو
داخلے کے روپے ہضم کر جاتے ہیں لاٹری کا نشان بکسٹینج تا
آپا جان۔ واقعی یہاں کے لوگ بہت کینے لگتے ہیں
اکرم۔ حقیقت یہاں کے لوگوں میں تجارتی فائنڈنگ

نہیں ہوتی ہر شہر میں لاٹریاں کھول بیٹھے ہیں اگر کسی کے نام بھل
جھی آئے تو اسے اصل سے بہت کٹتے ہیں میں نے ایسے کسی

تھے سنے ہیں

ظہیر مگر چچا جان طرک کہتا ہے کہ ایک جینے میں
ایک بہت بڑی لاٹری دہلی سے بھگنے والی ہے بٹے بٹے لوگ
اس میں ٹکٹیں لے رہے ہیں۔

اکرم۔ شاید گرمی نے اخبار میں اس کا ذکر نہیں
پڑھا۔ ہر آج صبح سے میں نے اخبار بھی تو نہیں دیکھا صبح گایا
گیا اب آیا سو (دینی طرف) رشیدہ ذرا اخبار تو اٹھا لانا۔

ظہیر امی جان میرا تو جی چاہتا ہے کہ ہم بھی لاٹری
ڈالیں۔ شاید مل آئے۔

امی جان۔ اسے جانے دے۔ تو تو ہر مصالح

بھیلاؤ رہے۔

صغرا۔ امی جان کیا پتہ ہے بھل ہی آئے۔

آپا جان۔ مجھے تو کوئی اسید نہیں لاکھوں آدمی

ڈالیں گے ہمارے ہی نام بھگنے گی کیا؟

ظہیر تو آپا جان کسی کے نام بھگنے ہی گی نا اس
کوچوان کے نام بھی بھل ہی آئی تھی۔

امی جان (آہستہ سے) وہ تو انگلیات ہو رہے کوئی
مفت تھوڑے مل رہے ہیں اپنے خرچ تو پورے ہوں۔
لاٹری کی بھی دیکھی جائے گی۔

اکرم۔ ٹھیک ہے بھابی جان یہ واقعی
لاٹری بھگنے والی ہے۔ فقط در در پے ٹکٹ ہے لکھا ہے
یہ بڑے اہتمام سے بھگنے کی سرکاری بینک کے ماتحت ہوگی میرا
خیال ہے یہ لاٹری شاید ٹھیک ہی ہو۔

امی جان۔ اکرم ان کا کوئی اقتدار نہیں سچ لاکھ
آدمی اگر لاٹری ڈالیں تو لاکھوں سے ایک اتفاق ہو سکتا ہو

اس میں ڈیڑھ روپیہ درملاولیس دو ہوجائیں گے۔
 صفرا۔ امی جان سچ جی، میرے پاس خود تیرہ آئے
 جمع ہیں میں نے عید کے پیسے بھی خرچ نہیں کئے تھے سب
 جمع کر رکھے ہیں ایمان سے، امی جان دیکھئے کتنے ہوئے
 ایک دوپہ، ایک دوپہ ادراپانچ آئے بس گیارہ آئے اور چاہئیں
 آپا جان کیوں امی جان یہ تو کتنے ہی پیسے ہو گئے
 امی جان۔ رہنے لے تو بھی نہرا تیرا بھی دل کیا
 ہو گا اتنی مصیبت سے تو انہوں نے پیسے جمع کئے ہیں اور
 یوں لاٹری میں ضائع کر دوں۔ لا تو صفرا میں خود ایک دوپہ
 ڈال کے تجھے دوپونے دو روپے کے سلیپر ہی لے دوں۔
 صفرا۔ واہ امی جان! میں کیوں اپنے پیسے دل
 پھلی دفعہ بھی آپ نے میرے پیسے لے کر مجھے دھچکا لے دیا
 تھا میں نہیں دیتی سب کو تو آپ لے دیں اور میرے سلیپر
 میرے سپیوں سے میں نہیں دیتی!
 امی جان۔ دیکھا نا لاٹری پر ضائع کرے گی
 یوں نہیں خرچ کر لیتی۔
 اکرم! دھڑے، کیوں بھابی جان کیا ارادہ ہو
 ڈالیں گی یا نہیں
 امی جان۔ کہاں بہکم روپے کہاں ہیں۔
 اکرم۔ تو اس میں بہت سے روپے تو نہیں مائیں
 فقط دو روپے ڈال دیجئے۔ دو روپے کیا ہیں۔
 امی جان ہاں ہاں ہے تو کچھ نہیں گمراہوت
 پاس ہی نہیں۔
 ظہیر۔ چھانچاں ذرا ان سے کہہ دو۔ یہ تو مانستیں
 ہی نہیں دو روپے ہی ہیں نا۔ ہوا کیا؟

کہ تہہ رانام نکل آئے فقط روپے ضائع کرنے ہیں۔
 اکرم۔ مگر لوگوں کے نام نکل بھی تو آتی ہے یہی ظہیر جو
 کہہ رہا تھا آکر چوہان اور اس غریب طالب علم نے ٹھیکہ تو نہیں
 لے رکھا تھا نہ ہی اتفاق بنے نکل ہی آئی ہیں نے بھی آج تک
 لاٹری نہیں ٹٹی لی اس دفعہ ڈال دیتے ہیں دو روپے ہی میں نا
 کوئی پردا نہیں
 امی جان۔ ہوں!
 صفرا۔ امی جان
 امی جان۔!
 صفرا۔ امی جان!!
 امی جان! کپڑا بیٹے ہوئے، ہوں!
 صفرا۔ امی جان جلد ہو بھی ڈال ہی دیتے ہیں
 کیا حرج ہے۔
 آپا جان۔ صفرا تجھے کیا ہو مانتا ہے کہہ جو دیا کہ
 نہیں ڈالیں گے بس رٹ لگائے جائیگی۔
 ظہیر مگر آپا جان ذرا دیکھو تو وہی اس غریب روکے
 کے نام نکل ہی آئی تھی اتنے روپے آخر!
 امی جان۔ تو ایک دفعہ نکل آئی تھی کہ روز روز
 لوگوں کے نام ہی نکلتی آئیگی۔
 صفرا۔ کیا پتہ ہے امی جان بس اس دفعہ ہی
 دیکھو نا شاید کیا پتہ ہے۔
 امی جان۔ تو روپے کہیں سے نکالوں بھی ظہیر
 کی فیر بی بی ہے۔ تیرے پاؤں میں جوتی نہیں تیری جیچ اپنے
 روپے الگ مانگتی ہے روپے ہوں تو انہیں نہ دیئے جائیں
 ظہیر۔ امی جان میرے پاس گٹھ آئے جمع ہیں

دوسرا دن شام

(دوبی دقت اور سب کچھ دیسے ہی)

صغرا۔ امی جان مجھے تو یقین ہوتا جاتا ہوا لاٹری ہمارے نام ہی نکلے گی۔

امی جان۔ کیوں وہ کیسے؟

آپا جان۔ امی جان اس کی بھی منتی ہو جسے سکوں سے آئی ہے دس دفعہ مجھ سے پوچھ چکی ہے لاٹری ڈالی ہے کہ نہیں۔ لاٹری کب نکلے گی؟ پاگل ہے!

امی جان۔ تو زہرا کیا ہوا۔ آخر کبھی ہے۔

زہرا۔ تبھی آپ نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔

ظہیر۔ (درد سے سے ابھی ابھی اگر) امی جان!

امی جان!! ذرا ادھر تو کھجھو جانے دو آپا جان کو اور

آپا صغرا کو ان کو تو اور کوئی کام ہی نہیں کس وقت لاٹری

بھیجی تھی؟ چچا جان نے خود ڈالی تھی؟

امی جان۔ ہوں۔۔۔۔

صغرا۔ تو ظہیر یہ بھی پتہ ہے کہ کب نکلے گی؟

ظہیر۔ ماسٹر کتنا عطا کہ ایک مہینہ کے اندر اندر

نکل آئے گی۔

صغرا۔ اف! ایک مہینہ!!

ظہیر۔ تو کیا ایک دن میں نکل آئے۔

صغرا۔ نہیں تو مگر۔۔۔۔

ظہیر۔ بس ایک مہینہ ہی تو ہے ایمان سے

اگر لاٹری نکل آئے تو میں تو ایک سائیکل خرید لوں اتنی

دور سکول جانا پڑتا ہے۔

صغرا۔ امی جان جلد ڈال دو (آہستہ سے) اگل بارہ آنے ہی کی کمی ہے آپا جان سے لے لیجئے ان کے پاس تو بہت کچھ ہے

زہرا۔ جی رسی بہت کچھ کی خالہ میرے پاس کہاں پڑا

امی جان۔ زہرا کیوں ایسا تلخ بولتی ہے۔

زہرا۔ تو امی جان میرے پاس کون سے روپے پیسے

ہیں آپ جانتی ہیں کل سوا دو روپے تھے وہ اپنے آج پانچ

دن ہوئے لے لئے تھے۔ تو میرے پاس کونسا خزانہ باقی

رہ گیا۔

امی جان۔ تو وہ کچھ سے چھوٹی ہونہ زہرا کی کہہ دیتا

زہرا۔ نرمی سے وہ ہانٹنے والی ہے، صرختو دیکھو۔

ظہیر۔ جلد جانے دو آپا جان۔ اب گیارہ ہی آنے رہ

گئے ہیں بس امی جان ڈال دیجئے شاید آہی جائے کتنے روپے

آئیں گے۔ توہ! اتنے!!

صغرا۔ جلد امی جان میں روز کا پیسہ نہ لوں گی

آپ لاٹری ڈال دیں۔

ظہیر۔ اچھا امی جان میں بھی نہ لوں گا اب تو ڈال دو

زہرا۔ نہ لے گا اور تو تو تو ایک کے دو لے کے

چھوڑے گا۔

ظہیر۔ نہیں آپا جان خدا کی قسم نہیں لوں گا۔

زہرا۔ اچھا تمہیں نہ کھا یا کر۔

امی جان۔ بھئی تم نے تو ناک میں دم کر دیا ہو

(اکرم سے) اکرم کب ڈالو گے۔ یہ تو جینے نہیں دیتے۔

اکرم۔ اچھا تو بھائی جان۔ آپ بھی مان گئی ہیں

کل صبح ڈال دیں گے ضرور۔

ظہیر تو آپا جان ایک انعام توڑا ہی ہوتا ہے۔
کئی ہوتے ہیں۔ اول۔ دوم۔ سوم اور معلوم نہیں کتنے کوئی
بھی نکل آئے تو کمال ہو جائے۔

صغرا۔ سچ آپا جان ذرا سوچو تو سہی مکر صاف
ہو جائے، درسی ہو جائے ہشتین ہو جائے، قرض اتر جائے
کپڑے بن جائیں، تو بہ تو بہ امی جان کچھ تو جنت ہی بن جائے
ظہیر۔ امی جان آپا صغرا تو یونہی کہتی ہیں ان کا کیا
ہے۔ ایمان بے سائیکل کی سخت ضرورت ہے بس سائیکل
پر آتے ہیں آج کل تو قیمت بھی کچھ نہیں۔

امی جان۔ اچھا اچھا اب کان مت کھاؤ دیکھا
جائے گا۔

صغرا۔ امی جان میرا خیال ہے۔ رضا یوں کے لئے
ایک ٹرنک ضرور لے لینا چاہئے۔ لکٹی پر لکھ رہے ہیں
خواب ہو گئی ہیں۔ آپ میرا لحاف اوپر ڈال دیجیے میں بالکل خراب
ہو گیا ہے۔

زہرا۔ کس طرح خراب ہو گیا ہے، اس پکسل نہیں
پڑا رہتا۔ اور کچھ کاٹھکی چادر۔

صغرا۔ تو کیا ہو اچھ بھی نچلے گا ورنہ تو خواب ہی
رہتا ہے۔ ادراپ تو اس میں کچھ رہا بھی نہیں کتنے سال کا پیرا ہو
گیا ہے۔ امی جان اگر میرا لحاف نیا بن جائے تو . . .

امی جان۔ سچی کچھ ہو جائے گا بعد میں لوگ نہ لینے
دو کہ "تو کپاس کوئی سے ٹھم لٹھا!"

ظہیر۔ آپا صغرا اگر نکل آئے تو ایک گراموفون نہ لے
لیں۔ کتنے کو آتا ہو گا،

صغرا۔ پتہ نہیں کیوں امی جان کتنے کو آتا ہو گا؟

صغرا۔ اب بکول دور ہو گیا کیوں نہ ہو بڑا کرکس نہ
خرید لیں میں تو کہتی ہوں پہلے تو امی جان مجھے ایک اعلیٰ
گرگانی لے دیں پھر میرے کپڑے سارے بچھٹ گئے ہیں
دو جوڑے ذرا اچھے بنادیں باقی ایک دھممو کی ہی سہی
ظہیر۔ آپا صغرا کو دیکھنا امی جان ذرا ہر وقت
کپڑوں کی ٹوپی رہتی ہے اتنے کپڑے ہیں پھر بھی کپڑے
ہی کپڑے میں تو یہ کہوں گا کہ مرغیوں کے دہلے جالی
دار بنا لینے چاہئیں۔ مٹانے اپنے دہلے ایسے بنائے ہیں
کہیں نے کبھی نہیں دیکھے۔

زہرا۔ بس ظہیر کو تو لٹوں کا، مرغیوں کا، لٹکوں کا
ہر وقت خیال ہوتا ہے میں تو امی جان سے کہوں گی اگر شاید
نکل ہی آئے جس کی کوئی امید نہیں۔ تو ایک شین خریدیں
امی جان۔ آج روپے تو بیچ دے اب جب تک
نام نہ نکلیں گے ان کے لئے اور کوئی کام نہ ہو گا۔

صغرا۔ تو امی جان کیا حرج ہے اگر نکل ہی آئے
تو اس کمرے کی سفیدی ضرور کرالینی چاہئے۔ اور ایک نری ہو
ظہیر۔ امی جان جب کبھی منظور مجھ سے ملنے آتا ہو
تو ایمان سے ایک کرسی بھی نہیں گھر میں ہوتی اور چھپا جان سے
مجھ مانگتے شرم آتی ہے۔ میرا خیال ہے دو تین کرسیاں
ہوں تو بہت اچھا ہے۔

امی جان۔ سب کچھ ہی ہو جائے جو لوگوں کا دنیا
ہے۔ وہ نہ دیا جائے۔ میں تو کہتی ہوں اگر نکل ہی آئے۔ تو
جن جن کا دنیا ہے انہیں دے دوں۔ پھر دیکھی جائے گی
زہرا۔ آپ بھی ان کی طرح خیال کرنے لگ گئیں
کہ ضرور نکل آئے گی۔

دی اور تو نے بھی مجھے تو اس بات کا بہت افسوس ہے۔

صغور! چلو اعلان جانے دیا کیا ہو سکتا ہے ہماری قسمت ہی نہیں ہے۔
زہرا! کہتے انعام پچھو! کھائی مر کا تھا۔ وہی کل آتا تو کیا تھا
امی جان! زہرا! کہہ دو! یہی نہ تھا وہ یہوں بیٹھا تھا اسے کیا
دروں کی پروا اور ادھر جھٹ تمارا!

صغور! اچھا! اٹھو! سانس لیتے بچے، زہرا!۔
امی جان! ابلیز کو کچھ بھی ہو گی! آتا ہو گا مجھے تو نہیں سوچتا ہے کہ ہو گی۔
زہرا! یہ نہ تو تھوڑا سا درد ہے کہ کچھ بھی ہو گی! گھر کی کسی چیز پر
ڈیڑی کا گلا لٹے گی تو کبوس کی کانیں بھڑن! میں نے کہا ہونہر صغور ہے۔
امی جان! صغور! بہت اچھی بیٹی ہے کچھ دے در ہے تو لا کر بیٹیں
نہی لکھا ہوا دل دیتی ہے بچے کی گلدہ تو تھا تھا اب بھی ہوتا جائے گا۔
زہرا! انا ہی آؤں کیا ہو گا وہ بھی تو ہیں نہیں کھانا بھی نہیں ملتا۔
صغور! دیا جان! دھر چکا جان بھی تو! ناس کس پاس لگے گی بہت
کچھ تھا بچ سو اور آگئے۔

امی جان! صغور! یہی ایسے ہوا کہ تیرا بیٹا میں بیٹے سے ہی
کہتی تھی نہیں نے بہت مجبور کیا تھا۔

صغور! چلو اعلان جانے دیا کیا ہو سکتا ہے تو یہی آئے تھے طبع عاقل
نے تو بہت کل سودہ آٹھ آئے جمع کئے تھے اس بھلا جمع ہوتے تھے۔
بڑی کل سے دیک دیک کر کے کہنے پر جمع کیا کرتا تھا۔

امی جان! اب اتنا ہی ہو گا۔ زہرا! میں کہتی ہوں ہم اسے نہیں
امی جان! کیسے نہ بنائیں! دل اس کا پھلا

سوال ہی تو تھا ہے پھر کرم تانا ہے گا۔ زندہ سے سن لے گا۔
یہ کیسے ہو سکتا ہے نہ تو فرنگ مانے گا۔ صغور! یہ بہت معصیت ہو

زہرا! یہ آواز ہر کسی کی کیسے سی ہے باتیں کرتا ہے
ظہیر! (اندھرتا ہوئے) سلام میک + فیاض محمود

امی جان! معلوم نہیں زہرا وہ تیری پہیلی ختم کر کے
ابنے اسی ابھی لیا ہے کہنے کو کیا ہے؟

زہرا! وہ تو اسی روپے کا ہے پیٹیں ملا کے کہتے
تھے ڈیڑھ سو کوا جاتا ہے۔

ظہیر! تو کیا ہے لاٹری تو کسی ہزار کی کھلتی ہے۔
زہرا! پل بے رہنے دے بڑا! کہیں کا!

صغور! ایمان سے آبا جان! لطف ہی آجائے اگر بچا
ہو تو کیا مزا ہے۔

زہرا! اچھا! اچھا! اب کام کرو میں تمہاری طرح بیکار نہیں
ہوں! بچے ظہیر! انار سے پیاز لانے پیاز ختم ہے میں مصالح میں لوں

ایک ماہ بعد

(شام کا وقت ہو ظہیر ابھی کولن سو نہیں آیا)

صغور! امی جان! ہماری قسمت ہی ایسی ہے مجھے کچھ بھی
کہیں کنگ تھا تھا کہ آخر ہمارے ہی نام کیسے نکل آئے گی! اوتنے لوگ
ہیں ان کے نام کیوں نہ نکلے گی اور پھر.....

امی جان! مجھے تو اس بات کا درد ہے کہ ظہیر! آئے گا تو
اسے کتنا صدمہ ہو گا! اسے تو یقین ہو چکا تھا کہ ضرور باغیہ زہرا سے نام
ہی نکل آئے گی۔

زہرا! اور ہر سب سے زیادہ کہ کھلی تو چھ اکر کم کے نام خواجہ تھے
جسے کا انعام ہی تھا! مگر پانچ سو روپے بھی پانچ سو ہوتے ہیں آخر۔
صغور! کچھ نہ! امی جان! چکا جان کے پاس تو آگے ہی اتنے
روپے ہیں۔ ان کے نام نکلا بھی تو کیا۔

امی جان! اور کچھ ظہیر! چائے لے اپنی پونجی بھی ساری دے

راحت کدہ

Good

(۳۱)
مٹے خاموش آوازِ مجھ کے جس میں نفی
کہاں میں اب شبابِ عاشقِ حق کے آتش میں نفی
بس کٹ کر آوازِ اول یاد کا عشقِ باقی ہو
کچھ نرسو میں کچھ آپس اور کچھ اندر میں نفی

(۳۲)
یہ کیا سچ دلوں کے گیس کر دیا
رنگِ جنوں کو اور جی کچھ پتھر کر دیا
پھر بھر دیا مجھ میں سوزِ گدازِ غم
پھر سازِ دل کو سوز سے لبریز کر دیا

(۳۳)
فصلِ بہارِ غم نہ گئیں سے مست ہے
گھٹیوں و گل باد میں سفرِ بدست ہے
اس نغمہ زارِ دلیں گرجن میں گو
پچھے پایِ دل کی صدمے شکر ہے
اثرِ صہبائی

(۳۴)
ایک غابِ پریشاں کو نہ ہم کٹنے کی پیری
فضائے ہر چھائی ہوئی ہے تبدیلی پیری
کفِ فاکسٹروفیسر ہے قلبِ شہزادان
بس اک آہِ مسلسل کہ گئی ہو زندگی پیری

کانسٹنٹ گینارڈ

اُن کی شادی محبت کی شادی تھی۔ شادی کے بعد دونوں میاں بیوی بڑی گرمجوشی سے ایک بیٹے کی آمد کرنے لگے اور یہ نفعی سہمی اپنی ماں باپ کی تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے قبل از وقت دنیا میں آسموجود ہوئی۔ ماں مگٹی اور باپ نے اس صدمے کی تاب نہ لاکر خودکشی کر لی۔

کانسٹنٹ گینارڈ بے نظیر بچہ تھا لیکن تقدیر اُس کے خلاف تھی۔ مدرسے سے وہ انٹر مٹا تھا۔ اگرچہ ہمیشہ دہ بے قصور ہوتا تھا۔ دوسرے لڑکوں کی بہ نسبت اُسے زیادہ کام کرنے کو دیا جاتا اور جس سزا کے مستحق دوسرے طالب علم ہوتے وہ بھی کسی دیکسی جیلے اسی کے حصے میں آتی۔ اسی وجہ سے امتحان کے دنوں میں وہ اکثر بیمار ہو جاتا کرتا۔ جب اُس نے اپنی تعلیم ختم کر لی تو وہ ایک سکھ اور متی مشہور ہو چکا تھا۔

نبی کے امتحان میں اُس نے ارزاہ ہمدردی اپنے ساتھی کے لئے بھی پرچہ لکھا جو قبول کر لیا گیا لیکن خود وہ نقل کرنے کے جرم میں امتحان کے کمرے سے خارج کر دیا گیا۔

ایسے نامور واقعات اگر کسی دوسرے شخص کو پیش آتے تو وہ بد اخلاق ہو جاتا لیکن کانسٹنٹ گینارڈ ایک تشریف انسان تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ خوشی غمی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اس لئے اُس نے اپنی ناکامی کو شجاعت کے ذریعہ سے فسخ کرنے کی ٹھٹھالی۔

جس کارخانے میں وہ ملازم تھا ایک دن اُس میں آگ لگ گئی جب اُس نے اپنے آقا کا اس چہرہ دیکھا تو بے خوف ہو کر بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود پڑا کہ قیمتی کاغذات اور نقدی وغیرہ بچا سکے۔ اُس کے بال جل گئے اور بازو اور ہاتھ جھلس گئے لیکن اپنی جان پر کھیل کر وہ صندوق کو توڑنے اور نقدی وغیرہ کو اُس میں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ بالکل اُس نے محسوس کیا کہ کوئی اُس کو باہر کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔ دو سپاہی اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔

ایک مہینہ تک مقدمہ چلنے کے بعد اُسے چوری کے جرم میں پانچ برس کی قید کا حکم سنایا گیا۔ قید خانے میں بغاوت ہو گئی اور باغیوں کے حملے سے ایک محافظ کو بچانے کی کوشش میں اُس نے نالائمانہ طور پر خود اُسے اڑکھا لگا کر بچا دیا۔ باغی اُس محافظ پر ٹوٹ پڑے اور اُسے قتل کر دیا۔

کانسٹنٹ گینارڈ کو بائبل کے جلا وطن کر کے کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا لیکن اپنی بے گناہی کی تعویث پاکر وہ

کسی طرح بچ نکلا اور بعد فراش میں آکر کسی دوسرے نام سے رہنے پہنچے گا۔ یہ سمجھ کر کہ اپنی حکمت سے اس نے قسمت کو ہر دیا ہے اس نے نیکی کے کام ایک مرتبہ پھر شروع کیے۔

ایک دن ایک مینے میں اس نے ایک گھٹ گھوڑے کو بیچھا جو گاڑی سمیت ایک خندق میں گرنے کے قریب تھا۔ یکا یک وہ گھوڑے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا جس کا بیچہ یہ ہوا کہ اس کی کلائی ٹم کھا گئی، ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور ایک پسلی شدید طور پر زخمی ہوئی لیکن گھوڑا اور گاڑی بچ گئی۔ مگر گھوڑے نے پلٹ کر ہجوم کی طرف رخ کیا اور ایک بڑھے آدمی، دو عورتوں اور تین بچوں کو روند ڈالا گاڑی کے اندر کوئی نہ بچا۔۔۔۔

بہادر می کے کاموں سے مایوس ہو کر کانٹنٹ گینارڈ نے خاموش اور پر اس طریق پر نیکی کرنے کا فیصلہ کیا، اور دنیا کی مصیبت کو کم کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا لیکن وہ روپیہ جو وہ نادار عورتوں کو مدد کے طور پر دیتا ان کے شوہر نہایت بے دردی سے شرب خانوں میں اڑا دیتے۔ غریب مزدوروں کو اس نے گرم کپڑے تقسیم کئے لیکن وہ سخت موسم کو برداشت رکھنے کے عادی تھے، اس لئے وہ کھانسی زکام وغیرہ میں مبتلا رہنے لگے۔ ایک آواز آئے کہ تو اس نے اپنے گھر میں رکھا جس سے مجھے کچھ آدمی ہڑک کے مرض میں گرفتار ہو گئے۔ ایک دلچسپ نوجوان نے جس کے لئے اس نے ایک معقول رقم خرچ کر کے فوج میں جگہ حاصل کی بعد میں قلعے کا نقشہ دشمن کے ہاتھ فرو کر دیا۔

کانٹنٹ گینارڈ نے خیال کیا کہ روپے کا عام استعمال فائدے سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔ اس لئے نیکی کو یوں ہیکا رکھوئے کہ بجائے اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی دولت کو ایک ذات واحد کے لئے مخصوص کر دے چچا اس نے ایک حیم روٹی لے کر اپنے پاس رکھی جو خوبصورت تو قطعاً نہ تھی لیکن بعض اعلیٰ صفات سے تصدیق تھی۔ ایک باپ کی سی شفقت کے ساتھ اس نے اس بیٹی کی پرورش کی۔ آہ! اس نے اس سے اتنی مروتانہ محبت اور اتنی شفقت کا بڑا ڈالیا کہ ایک شام روٹی نے اگر اپنے قبضے اس کے قدموں میں گر دیا اور اس سے اپنے عشق کا اظہار کرنے لگی۔ اس نے اسے سمجھایا کہ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھا اور اگر اب میں تمہاری اس تریغیب کو قبول کر لوں تو مجھے ایسا محسوس ہوگا جیسے میں کسی بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔

اس نے ایک باپ کی طرح اس کے سامنے دلیلیں اور معذرتیں پیش کرتے ہوئے بیعت کر کے کی کوشش کی کہ جسے وہ غلطی سے عشق سمجھ رہی ہے وہ درحقیقت اس کے احساس کی بیداری ہے۔ مگر اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لئے بہت جلد ایک شوہر تلاش کر کے اس کی شادی کر دے گا۔

دوسری صبح اس نے دیکھا کہ وہ اس کی دہلیز پر روہ بڑی ہوئی ہے۔ اس کے بعد کانٹنٹ گینارڈ نے نیکی سے دست بردار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور کھانسی کے اسٹندہ

یہی کرنے کی بجائے وہ صرف بدی کے روک سینہ پر اکتفا کرے گا۔

اس واقعے کے کچھ دیر بعد اتفاقاً اُسے ایک ایسے جرم کا علم ہو گیا جو اُس کے ایک دوست سے سنا دہونے والا تھا۔ فہم دوست کو مناسبت آسانی کے ساتھ پولیس کے حوالے کر سکتا تھا لیکن اُس نے جو جرم کو نقصان پہنچا ہے بغیر جرم کا اذکار مناسب خیال کیا۔ چنانچہ اُس نے اُس کی تنجاویز کے تمام ناکے بند کر دیے اور اُس وقت کا انتظار کر لگا جب وہ اُس کی کوششوں کو کا اعدم کر کے رکھ دیتا۔ لیکن اُس نیشیت کو اُس کا علم ہو گیا اور اُس نے اپنے کام کو کچھ ایسے طریق پر جاری رکھا کہ جرم تکمیل کو پہنچ گیا، مجرم بھاگ گیا کا سنسٹ گیا، روڈ گرفتار کر لیا گیا۔

کاسٹنگ ڈائریکٹر کے خلاف سرکاری وکیل کی تقریر دلائل و براہین کا ایک شاہکار تھی۔ اُس نے مزے کی تمام گزشتہ زندگی پر تبصرہ کیا۔ اُس کا تباہ حال بچپن، اُس کی مدرسے کی سرزیش، اُس کا امتحان سے اخراج، پہلی ہی چوری میں اُس کی جرات، قید خانے کی بغاوت میں اُس کی کمروہ سازش، اکال کو ٹھٹھری سے اُس کا بھگائ نکلنا اور پھر ایک دوسرے نام سے فرانس میں آکر رہنا، یہ تمام منازل اُس نے بیان کر ڈالیں۔

اس کے بعد مقرر اپنی عدالتی لسانی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ اُس نے کہا کہ مرنے سے تمام عمر نیکی کو ایک پالکھنڈ بنا سٹے رکھنا، اُس نے شریف گھروں میں فصل اندازی کی، اپنی نفسانیت کی تسکین کے لئے وہ غریب عورتوں کے شوہروں کو روپیہ دے کر شہزادوں میں بھیج دیتا تھا۔ اُس نے اپنی فیاضی کا ایک ڈھونگ بنا رکھا تھا۔ لوگوں کو تحفے دے کر وہ جھوٹی شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ وہ نہ خواجہ مخیہ نفع کے پردے میں ایک دیونو خواہ تھا۔

پھر اُس نے ذرا خوف آمیز لہجے میں اُس کی تسکینی ہوئی عیار یوں کا پول کھولنا شروع کیا۔ اُس نے کہا کہ وہ ایک لنگا کادی ہے جس نے ایک دیوانے کتے کو محض لوگوں پر چھوڑنے کے لئے اپنے پاس رکھا۔ وہ ایک شیطان ہے جس کو بدی سے صرف بدی ہونے کے باعث اُس ہے۔ اس نے ایک دفعہ اپنی جان پکھیل کر ایک بلیگٹ گھوڑے کو روکا۔ کس لئے؟ صرف یہ تا شاہدیکھنے کے لئے کہ یہ وحشی جانور نجوم میں گھس کر بڑھے آدمیوں کو زور و خور توں اور نفعے پچوں کو کس طرح کچلتا ہے۔

اے کیا ایک ایسے شخص سے نیکی کی کچھ توقع ہو سکتی ہے؟ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ اس نے ہزاروں ایسے جرم کئے ہوں گے جن کے متعلق ہمیں کبھی علم نہ ہو سکے گا۔ اس امر کے لئے ایک ہزار اور ایک وجوہ موجود ہیں کہ جس جماعت نے قلعے کا نقشہ بیچ کر فرانس سے غداری کی اس کے ساتھ یہی شریک تھا۔ اور وہ بنیم لٹکی جس کو اس نے پالا اور جو ایک دن اس کے دروازے میں مری ہوئی پائی گئی اس کو اس کے سوا اور کس نے قتل کیا ہوگا؟ یہ قتل یقیناً بدکاری، ادا باشی اور بے غیرتی کے انہیں ناپاک افسانوں کا ایک باب تھا جن کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔

اصلاح ادب

کے ساتھ دصوت دترنی کی تزیین کرتی ہیں بجا
زمانے کی ہر شے کے اندر زبان میں بھی برابر
انقلاب آتا رہتا ہے نئی نئی ضروریات کے ساتھ
الفاظ بھی نئے نئے پختے پختے جاتے ہیں جن میں
بعض تو ادبی اعتبار سے صحیح ہوتے ہیں بعض
غلط لیکن غلط بھی اس قدر تیزی کے ساتھ
رد و بدل پکڑتا ہے کہ عام لوگوں کے عام
لوگوں کے علاوہ لغات بھی اس طرح ہوتے اور
کھینچے گئے ہیں گویا وہی غلط الفاظ کسالی اور
فصح قرار پاتے ہیں انہیں غلط الگ کہتے ہیں
مگر جو غلط الفاظ عام ہیں ان کو محدود دیتے ہیں
اور لغات کے احوال میں نہیں آتے، وہ غلط
کے غلط ہی رہتے ہیں ان کو غلط الاعوام کہتے
ہیں یہ اس مقصد سے مراد لکھنا کہ الفاظ کی اصلاح اور
ادبی اصلاح ہے۔ بشرے زیادہ نظم میں
انڈھیر چاہتا ہے۔ اور نظم کا سدا بہار نہایت
نارک ہے جس کے لئے زیادہ اعتبار اور
توجہ کی ضرورت ہے۔

(نشار)

مجھے اردو کی بے شمار کتابیں اخبارات
اور رسالے دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور
ریج بھی خوشی اس لئے کہ اردو پیار سی اردو
کا دائرہ اثر وسیع تر ہو رہا ہے اور رائج اس
لئے کہ صرف چند کتابوں ایک کچھ اخبار
اور ایک درساؤں کے سوا کسی میں بھی نئی
زبان کا خیال نہیں لکھا جاتا۔ اور نظم کا لفظ
ہی ملاحظہ ہے۔ ضرورت تھی کہ کوئی حلیل اللہ
شاعر وحید العصر و بیا در سلم الثبوت محقق
ادب خدائے بان کے اس نہایت اہم پل
کی طرف توجہ دینے لگیں جب میں نے ہر حرف
سکوت، جمود کا عالم دیکھا تو اپنی محدود بھی
استعداد کے باوجود مدخل اردو کی محبت سے مجھ پر مرکب
اس بہم باشان کام کو انجام دینے کا بیج کر لیا۔
دبیہ التوفیق۔

اس مضمون کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری
رہے گا اور نشر و نظم میں عوام کی نادر توفیق کے
باعث جو ادبی و دعویٰ غلطیاں ملے گا کسی یا
رہی ہیں، ان کی اصلاح کی جائیگی تاکہ اردو کا
معیار ادب بگرنے نہ پائے اور صحت و صفات

نثر

فقہرہم نے تبادر خیالات کے لئے ایک تجربہ قائم کیا ہے
اصلاح ہم نے مبادر خیالات کے لئے ایک تجربہ قائم کیا ہے
وجہ۔ تبادر کوئی لفظ نہیں۔ تبادر بر وزن
تفاعل یا مبادر بر وزن مفاعلہ صحیح ہے۔
فقہرہ "پیام مشرق" میں فلسفے کے سوا شعریت بھی
کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے

اصلاح "پیام مشرق" میں فلسفے کے علاوہ نثر
بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

وجہ۔ "سوا" وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں کسی
چیز کی نفی مقصود ہو مثلاً خدا کے سوا کوئی معبود نہیں" اضافے
کے موقع پر علاوہ بولتے ہیں۔

فقہرہ۔ اس فرض کی ادائیگی آپ کے ذمے ہے
اصلاح۔ اس فرض کی ادائیگی آپ کے ذمے ہے
وجہ۔ "ادائے" ادائی آئے گا۔ جیسے "صفائی"
تصفائی۔ "می" سے پہلے "گ" کسی قاعدے سے درست
نہیں۔ اور یہ سستشی ہے۔ نہ غلط العام۔ اسی طرح "ناراضی" کی
جگہ "ناراضگی" بھی غلط ہے۔

فقہرہ۔ اردو زبان دن بدن ترقی کر رہی ہے۔
اصلاح۔ اردو زبان روز بروز ترقی کر رہی ہے۔
وجہ۔ دن بدن اصل میں "دن بہ دن" تھا اور
"بہ ناراضی" ہے اس لئے ہندی اور فارسی کی ترکیب درست نہیں
فقہرہ۔ آج ۲۸ جمادی الاول ہے میں انشاء اللہ
۲ جمادی الآخر کو حاضر خدمت ہو چکا۔

اصلاح۔ آج ۲۸ جمادی الاولیٰ ہے میں انشاء اللہ
۲ جمادی الآخر ہی کو حاضر خدمت ہوں گا۔

وجہ۔ جمادی ثمنوت ہے اس لئے اس کی
صفت بھی ثمنوت ہی آتی چاہئے جمادی الثانی "۲ جمادی الثانی"
بھی غلط ہیں کیونکہ اول تو یہ عربی میں استعمال نہیں دوسرے ثنائی
دہاں آتا ہے جہاں اس کے بعد ثالث بھی آئے۔
فقہرہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حادثہ زیادہ سے مصون
دامون رکھے!

اصلاح۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حادثہ زمانہ سے
مُصُون دما مون رکھے۔

وجہ۔ مُصُون "بر وزن مَقُول اجوف" ادسی
ہے مہرزالعین نہیں۔ اس کا مادہ صَوْن "ہے صَیَان"
نہیں۔ یہ اصل میں مَصُون و ن تھا

فقہرہ۔ میں نے آپ کے مضمون میں صرف
ایک فقرہ ایزا دیا تھا۔

اصلاح۔ میں نے آپ کے مضمون میں
صرف ایک فقرہ زیادہ کیا تھا۔

وجہ۔ ایزا "کوئی لفظ نہیں باب افعال کو
ایزادہ" آتا ہے جو اردو میں مستعمل نہیں۔ ایزادی
غلط در غلط ہے۔

فقہرہ۔ آپ نے کیوں خاموشی اختیار کی ہوئی ہو
اصلاح۔ آپ نے کیوں خاموشی اختیار کر رکھی ہے
وجہ۔ "نے" کے ساتھ "ہوا" ہوئے یا ہوئی
کا استعمال قواعد کے رُوسے غلط ہے۔

فقہرہ۔ کتاب کو پڑھا گیا۔

اصلاح۔ کتاب پڑھی گئی۔

وجہ۔ فعل مجہول سے پہلے کو نہیں آتا لیکن جب مفعول المسمیہ فاعل کے ساتھ ایک اور مفعول آئے تو "تو" ضرور لکھیں گے مثلاً مصنف کو تہذیب دینا گیا۔ اگر فعل مجہول ہو۔ اور دوسرا مفعول بھی نہ آئے تو "کو" کا لکھنا یا نہ لکھنا دونوں طرح صحیح ہیں مثلاً کر کے کو آراستہ کیا گیا۔ اور کر کے آراستہ کیا گیا۔ دونوں درست ہیں۔

بے شک قواعد میں یہ لکھا ہے مگر مستند فصحا اس کی پابندی نہیں کرتے مثلاً حضرت انسؓ مرحوم لکھتے ہیں۔ کہ

لے حشر امتیاز کہ ہم میں شہید ناز

مردوں کی طرح ہم کو اٹھایا جائے گا

یہاں قواعد کے مطابق ہم اٹھائے نہ جائیں گے ہونا چاہئے تھا۔ لیکن زبان کے اعتبار سے حضرت قرآن کا پیراں قدر بلند ہے۔ کہ کوئی قواعد مرتب کرنے والا ان پر حرف گیر نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ان کا کلام سامنے رکھ کر قواعد بنانے چاہئیں۔ غرض میری ذاتی رائے یہ ہے۔ کہ ایسے موقع پر "کو" کا لکھنا یا نہ لکھنا ادیب یا شاعر کے ذوق پر منحصر ہے۔

فقہ۔ صحیح خیریں ان کا معمول تھا۔

اصلاح۔ صحیح خیریں ان کا معمول تھی۔

وجہ۔ صحیح خیریں ثنوت ہے۔ اور فعل ناقص ذکر کیا۔

میں اس کے تابع ہوا کرتا ہے۔ نہ کہ برعکس۔

فقہ۔ انسان کو چاہئے کہ بہتہ تحصیل علم اور بہتہ نصرت ہے۔

اصلاح۔ انسان کو چاہئے کہ بہتہ تحصیل علم بہتہ

میں مصروف رہے۔

وجہ تحصیل مضامینے اور علم اور بہتہ زور نوں مل کر مضامین اس لئے اس فارسی ترکیب میں ہندی کا حرف عطف نہیں آسکتا۔

فقہ۔ سعیدہ اور طاعون نے کہا امی جان! اب ہم سب کی

اصلاح۔ سعیدہ اور طاعون نے کہا۔ امی جان! اب ہم سب کی

وجہ۔ جمع حکم میں مذکر و مؤنث کا صیغہ ایک ہی اندک

ہوتا ہے، مؤنث کے لئے جمع مؤنث کا صیغہ نہیں بولتے۔

فقہ۔ وہ فوق البجرک لباس پہن کر نرم اور بکے

اجلاس میں شامل ہوا۔

اصلاح۔ وہ نرم برق لباس پہن کر نرم اور

کے اجلاس میں شامل ہوا۔

وجہ۔ فوق البجرک کی ترکیب غلط۔ فوق عربی اور بکر

ہندی سب سے اسی طرح قریب المرگ بھی غلط ہے کیونکہ قریب عربی

ہے۔ اور مرگ فارسی اس کی جگہ قریب مرگ لکھنا چاہئے۔

فقہ۔ مذہب اسلام میں تمام شے چیزیں حرام ہیں

اصلاح۔ مذہب اسلام میں تمام نشہ آور چیزیں

حرام ہیں۔

وجہ۔ نشہ فارسی ہے۔ اس سے عربی قاعدے

کے مطابق منہی بنا لینا صحیح نہیں اسی طرح قرآن اور چرچ

بھی غلط ہیں۔

نظم

شعر اپنے فانی کا ہے شاد ہوا آپ ہی

ذوہ ذہ عالم امکان کا

اصلاح۔ شاد فانی ہے خود ہی اے۔۔۔

ذرة ذرة عالم ایکباد کا
یا

شاید حق ہے زبان حال سے
ذرة ذرة عالم ایکباد کا

وجہ۔ پہلے مصرع میں تناظر درملکی سی تعقید،
دوسرے مصرع کی ترکیب "عالم امکان" حالت اضافت میں
نون کا اعلان غلط ہے۔ اور معنائی اس سے "عالم ایجاد"
بہتر ہے۔ اسی طرح "دل جان" حالت عطف کو بھی "دل جان"
یعنی اخفائے نون سے ماندھنا چاہئے۔

مصرع۔ ہو اگر تعلیم اچھی خوب تربیت بھی ہو
اصلاح۔ ہو اگر تعلیم اچھی تربیت بھی خوب ہو
وجہ۔ "تربیت" (بہ تشدید یا) غلط سے "تربیت"
(بفتح یا) بر وزن "تعب" لکھنا چاہئے اسی طرح "تعب" سے
غلط اور "تعب" صحیح ہے۔
اشعار۔

غیر سے لکھو ادیا خط کا جواب کیا خط نقدیر نقاظ کا جواب
وفا نہیں آتے۔ نائیں خوش ہیں خیرجی بے تو دیا خط کا جواب
بن گئی کیا تجھ پر قاصدِ اخیر ہے؟ منہ سے کچھ بھوٹ کیا لایا جواب
اصلاح۔ پہلے دونوں شعر ٹھیک ہیں تیسرے
شعر کا دوسرا مصرع یوں ہونا چاہئے۔ منہ سے کچھ بھوٹ
لا خط کا جواب۔

وجہ۔ مطلع میں "دیا" اور "تھا" تافیہ اور خط کا

جواب ردیف ہے۔ دوسرے شعر میں بھی تافیہ ردیف
ٹھیک ہیں لیکن تیسرے شعر میں "لایا" تافیہ اور نقطہ جواب
نہیں ملتا حالانکہ اس میں بھی پہلے دونوں شعر کی طرح خط

کا جواب "ردیف اور کوئی صحیح تافیہ لانا چاہئے تھا۔ پہلے
دونوں شعر عرب کی وضاحت کے لئے لکھے گئے ہیں۔
شعر۔

وہ راہ میں ہیں مٹا ہے اب گئے کر گئے
کدھر کا غم ہے۔ اد جان بقدر انہیں
اصلاح۔

وہ راہ میں ہیں اب گئے کر گئے دم بھر میں
کدھر کا غم ہے۔ اد جان بقدر انہیں
یا

وہ راہ میں ہیں اب گئے کر گئے دم بھر میں
کدھر کا غم ہے۔ اد جان بقدر انہیں
وجہ۔ "تس" کا اعلان غلط ہے۔ دوسرے
مصرع میں "تس" غم سے یہ خامی بھی رفع ہو گئی۔ اور
شعریت بھی قائم رہی۔
اشعار۔

نغمہ نے بن گیا، سوزِ عداوت ہو گیا
نالہ دل چکیاں بٹنے کے قابل ہو گیا
پہلے وہ سفایاں تو خیر سے پیدا کرد
آپ خیر باندھ کر سمجھے کہ قابل ہو گیا
اب کہاں جاؤں کسے پائیں کدھر کہہ ہو گئی
رودھنا چھوڑ دے دنیا ہم کو شکل ہو گیا

اصلاح۔ پہلا شعر ٹھیک ہے۔ اگرچہ دوسرے
مصرع میں تناظر کی خامی موجود ہے۔ دوسروں ہونا چاہئے

پہلے وہ سفایاں تو خیر سے پیدا کریں
آپ خیر باندھ کر سمجھے! میں قابل ہو گیا

وجہ پائیے میں" یا تو کا اعلان غلط ہے اسی طرح
 "پائیں اور دھیان" میں بھی جو ہندی میں بار کا اختراع ہی چاہئے
 مصرع مجھ کو دھوکا ہے ترانقش کف پا دے گا۔
 اصلاح۔ یہ ترانقش کف پا مجھے دھوکا دے گا۔
 وجہ۔ دھوکا اور دے گا میں بہت بعد ہو گیا جس
 تنقید پیدا ہو گئی۔ تافید اور در دلیت کو لاکر پڑھنے سے نہایت
 مکروہ ذم کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔

شعر۔ میں نے ہر لکیر کی لکیر پر کیا ہے غور۔
 چھو بھی نہیں گئی ہے ترے پرہیز کی بڑ
 اصلاح۔ ٹوٹکا بڑ بھول بھول جس زار دہر کا
 چھو بھی نہیں گئی مے گل پرہیز کی بو
 وجہ۔ ہر لکیر گل میں ایک خوشبو نہ ہکت کے لئے
 غور کرنا اچھا نہیں۔ دوسرے مصرع میں ہے خوشبو۔

شعر جو انی بھی تجب شے ہے کہ جب تک یونشا اس کا
 مزہ ہے سائے پانی میں شراب ارغوانی کا
 اصلاح۔ جوانی بھی تجبے ہو کہ اس کا شہ ہے جب تک
 مزہ ہے سادے پانی میں شراب ارغوانی کا
 وجہ۔ شارب و زنی دنا غلط ہے نہ نہ بد و زن نہ
 (بہ تشدید شین) اماندھنا چاہئے اس غزل میں ارغوانی جوانی
 وغیرہ تافید اور کا در لیتے۔ لہذا اس شعر میں ردیف کے طے
 اور فنا نے کے لئے کا نقص موجود ہے۔ شعر۔

خون کیا آتش دوزخ سی کہ اوزانہ شک دیکھے سر پہ کمر و اسیر کا کمر
 اصلاح۔ خون کیا آتش دوزخ سی میں زارہ شک
 سر پہ ہے روز جزا دامن ترک کا کمر
 پہلے مصرع میں کہ آواز دوسری تھی مے خنجر میں

تیسرا ہوں ہو تو بہتر ہے سے
 اب کہاں جائیں کہے جاہل کھڑے ہوئیں
 تو جو اپنے چاہئے۔ دالوں سے غافل ہو گیا

وجہ۔ دوسرے شعر میں شکر گز ہے یعنی پہلے
 مصرع میں کر د اور دوسرے میں آپ لکھا ہے۔ نیز دوسرا
 مصرع تناظر کی غامی رکھنے کے علاوہ قواعد کے رُرد سے بھی غلط
 ہے۔ یا تو یوں ہوتا کہ "آپ بخیر اماندھ کر سمجھ کے غافل ہو گئے اگرچہ
 تناظر بھی موجود ہوتا ہے لیکن اس طرح ردیف قائم نہیں رہ
 سکتی تھی یا اصلاح مذکور کے مطابق کہ کی جگہ میں ہونا چاہئے
 تھا۔ اور یہی ٹھیک ہے میرے شعر کا تافید غلط ہے کیونکہ
 جب مطلع میں تاسیس درخیل کی تید ہے تو تمام شعاریں لازماً
 تید ہونی چاہئے تھی یعنی شکل "دل نہزل" وغیرہ نہیں لا
 سکتے بلکہ "غافل نازل" "محل" وغیرہ لائے چاہئیں۔ میر
 عرض اس لئے کہ خوب سمجھیں گے پہلا شعر غزلوں کی جفا
 کے لئے لکھا گیا ہے۔

شعر۔ اُن مری دخت تے قربان بھی دلی
 دامن کو سنبھالا تو گر گیاں نہیں ملتا
 اصلاح۔ اندر سے یہ جو ش جنوں دل دھشی
 یا دامن کو سنبھالا تو گر گیاں نہیں ملتا
 صد تے ترے اسے جو ش جنوں دل دھشی
 دامن کو سنبھالا تو گر گیاں نہیں ملتا
 وجہ۔ پہلے مصرع میں غامی کے علاوہ ہی جاؤں
 اور دوسرے میں کو خوش ہو۔ شعر۔

دل کو مرغوب میں تھلے لفظ پھر سنا دیا ہے پایے لفظ
 اصلاح۔ دل کو مرغوب میں تھلے لفظ پھر سنا دیا ہے پایے لفظ

فروعِ نظر

ہر شے میں مجھے تیری تصویر نظر آئی
پردہ تھے چہرے سے اٹھتا تو سہی لیکن
پاتا ہوں ارادوں میں ہاتھ اس کے اشارے کا
بیدار نمی مستی بھی اک خوابِ پشیمان تھی
دُنیا تیری صورت کی تفسیر نظر آئی
ہر شخص کو اپنی سی تصویر نظر آئی
تدبیر کے پردے میں تقدیر نظر آئی
جب بند ہوئیں آنکھیں تغیر نظر آئی
پر مجھ کو ندامت بھی تغیر نظر آئی
رحمت نے تو غصیاں کو کوثر میں دیکھ غلط

میں خوں کا آسدا اپنے الزام دھڑوں کس پر؟
قابل نہ نظر آیا شمشیر نظر آئی!

اسد ملتانی

غزل

تیری نظر نے دل کو مے لے لیا دیا
میں اس جہاں عشق میں دُردمند ہوں
جس شے پہ کی نگاہ اُسے دل نہ لایا
مجھ کو نہ کیوں مالِ محبت پہ ناز ہو
جس نے نگاہِ رحم کے قابل بنا دیا
بہرِ فناء میں دل کے سفینہ نے ڈوب کر
ہر موج بے قرار کو ساحل بنا دیا
اس زندگی کو میسے تھیلے آپ ہی
آسان بنا دیا۔ کبھی شکل بنا دیا

ناکامیوں نے دل میں جگہ پا کے کاظمی
بہر آرزو کو جذبہ باطل بنا دیا
کاظمی (ہردوئی)

شبِ حرمِ مال

ختی شام بلاخیز غضبِ ناک ہوا نہیں
 وہ رقصِ بلاؤں کا وہ جنگِ ابرہہ ہوا کی
 بجلی کے کڑکنے سے فلک کا پڑا تھا
 اس حال میں اک دردِ غم و یاس کا مارا
 وہ اُس کا عذابِ غم پنہاں سے ترپنا
 چھوٹی ہوئی بنضیں، الم انگیز نگاہیں
 اندوہ و غم و یاس میں دم توڑا رہا تھا
 اُن کتنی المِ ناک و غم انگیز تھی وہ رات
 آتی تھیں ہر اک سمت سے پُر ہول صدائیں
 وہ رعد کے نالے وہ جوں کی خیز اُدا سی
 اور سینہ گیتی میں بھی اک حشرِ بپا تھا
 اک خانہ تارکی میں بے جاں سا پڑا تھا
 وہ نالہ دل شکوہ بے مہرِ دنیا
 جوشِ غم و حرماں میں وہ ڈوبی ہوئی تھیں
 جز ذاتِ خدا اور کوئی پُرساں نہ تھا اُس کا
 اے رازِ حریں کتنی بلاخیز تھی وہ رات

محمد جمیل خان راز

غزل

وفا یا فریبِ وفا چاہتا ہوں
 جو بہت بڑھچکھ کو سنبھالیں دُعا
 تبسم ہے برحقِ مہرِ سادگی پر
 متناس ہے چلی ہوئی آرزو کی
 توجہ پر لرزاں تغافلِ سونا لاں
 فقط ایک جلوہ فقط اک تبسم
 نہ ہے حُسنِ مقصد کہ ہزل میں زیبا
 کوئی زلیبت کا آسرا چاہتا ہوں
 کسی کی نظر سے گرا چاہتا ہوں
 محبت بشرطِ وفا چاہتا ہوں
 ترپتا ہوا دُعا چاہتا ہوں
 خدا جانے میں اُن سو کیا چاہتا ہوں
 گناہ و فاکِ سزا چاہتا ہوں
 محبت کی نشوونما چاہتا ہوں
 زیارِ دردِ دلی

یونانی غلام کی سرگزشت

میں یونان میں پیدا ہوا۔ ایسے والدین بہتر نہیں غربت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے میں اپنے والدین کا کلوتا ٹیٹا تھا جب میں بیس برس کی عمر کو پہنچا تو مجھے والدین کا انتقال ہو گیا۔ اب مجھے اپنے لئے ذریعہ معاش کی فکر ہوئی اس سے پہلے بھی میں ایک ہیوٹی شرب فروش کی ملازمت کر چکا تھا۔ چنانچہ میں پھر سی کے پاس ملازم ہو گیا۔ جب مجھے وہاں کام کرتے ہوئے تین سال گزر گئے۔ تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو میری زندگی کو خوشحالی اور موجودہ دنیا ہی کا موجب ہوا۔

جس وقت کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ ان دنوں میں نے اپنی محنت اور میاں رومی سے اپنے آقا کو ایسا خوش کر دیا کہ پھر وہ بھی عرصہ میں اس کا منظورِ نظر ہو گیا۔ بعض دفعہ وہ صرف شراب خانے کا انتظام میرے سپرد کر دیتا۔ لیکن کبھی کبھی مجھے خود ہی تمام کام کرنا پڑتا۔ اس وقت میرے ذمہ شراب کو چھان کر صاف کرنا اور اسے ہر طرح سے تیار کر کے بازار کے لئے قابلِ فروخت بنانا تھا۔ میرے ماتحت یوٹوپیا کا ایک حبشی غلام بھی کام کیا کرتا تھا۔ وہ ایک نہایت طاقتور گراڈیل اور جلد ہی شخص تھا بعض دفعہ میرے مالک کے لئے اس سے کام لینا تو قیماً دشوار ہو جاتا۔ اسے زبردست سے زبردست مزاد می جاتی۔ لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ غضبناک اور ڈھکیٹ ہو رہتا۔ جب کبھی میں اس کا کوئی قصور معلوم کرتا تو جوبے پردائی کے ہاش اس سے سرزد ہوا ہو تو اس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگتے۔ مجھے ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں کسی قوت وہ مجھے جان ہی سے نہ مار ڈالے۔ میں نے اپنے مالک سے کئی دفعہ التماس کی کہ وہ اسے ملازمت سے علیحدہ کر دے لیکن چونکہ وہ نہایت مضبوط اور قوی آدمی تھا اور جب مرضی شراب کا ٹیٹے سے بڑا لپٹا بھی بکری کی مدد کے اٹھالے جاتا تھا۔ اس لئے میرے مالک کو اس کا لالچ میری سپیم التماس کے باوجود بھی حبشی کو علیحدہ کرنے سے باز رکھتا۔

ایک صبح جب میں شراب خانے میں داخل ہوا۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ حبشی غلام اس کپڑے کے قریب غافل سو رہا ہے جو میں نے اُسے فوراً صاف کرنے کے لئے دیا تھا۔ اور جس کی اس وقت شدید ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ضرور اسے اب تک مٹا کر چکا ہو گا۔ مگر اس کی غفلت دیکھ کر مجی میں آیا کہ مار مار کر اس کی تمام مستی نکال دوں۔ لیکن اس کو سزا دینے کی مجھے خود جرات نہ ہوئی۔ اور میں اپنے آقا کو بلالایا۔ تاکہ وہ اس کے طرزِ عمل کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لے۔ میرا یہودی آقا اس کی غفلت اور مستی دیکھ کر سخت برہم ہوا۔ اس نے ایک کڑھی اٹھا کر زور سے حبشی کے سر پر مار دیا۔ ماری حبشی فعدہ کی۔ مائے جنت بھر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن جب اس نے میرے بجائے آقا کو ہاتھ میں لکڑی لئے ہوئے دیکھا۔ تو وہ جڑ بڑا لئے ہوئے پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ اور اسی ہی آقا

سے جاتی دفعہ کہہ گیا: "انتباہ پٹ کرو میں بھی یہاں کام نہیں کروں گا۔" میرا آقا شراب خانے سے باہر چلا گیا تو عجبیہ میرے پرکھ پڑا کہ تم نے میرے خلاف کیوں اطلاع دی تھی۔ وہ لکڑی کا ایک ساٹا کچڑ کرکھ پر جھپٹا کر لے کر اس سے پاش پاش کر کے میں جلدی سے کچے کی آڑ میں ہو گیا۔ اُس نے مجھ پر چڑھ کر کہا۔ رستے میں ایک کلبھاڑی بڑی تھی جب میں نے اپنی مدافعت کے لئے ہاتھ پیراٹھ ڈالا۔ اُس وقت مجھ سے ایک سٹول سے ٹھوکر کھا کر زمین پر پان گرا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی اپنی کلبھاڑی سے اُس کے الیمیج ب لگائی کہ اُس کی کھوپڑی بالکل بھٹ گئی۔ ادب ادب وہ میرے قدموں میں مڑ رہا تھا۔

اس واقعہ سے میں سخت دہشت زدہ ہو گیا۔ اگرچہ میں نے جو کچھ کیا تھا محض اپنی جان بچانے کی خاطر کیا تھا۔ ادب میں اپنے آپ کو بالکل خجی مجاب خیال کرتا تھا تاہم مجھے معلوم تھا کہ میرا آقا مجھ کی موت پر بہت رنجیدہ ہو گا۔ اور ممکن تھا کہ وہ غصہ میں آکر مجھے کو قصود اور گھبرانا چونکنا اس وقت کوئی ایسا آدمی بھی موجود نہ تھا جو میری بے گناہی کی شہادت دے۔ اس لئے بہت ممکن تھا کہ میں قانون کے شکنجے میں بری طرح جکڑا جانا بخوڑی دیر سوچنے کے بعد مجھے یہ تدبیر سوچی کہ عجبیہ کی لکھڑی چکھنے کے لئے اس طرح پٹ کر یہاں آئندہ کام نہ کروں گا۔ اس لئے میں اپنے آقا کو بہت آسانی سے یقین دلانے لگا کہ وہ ملازمت ترک کر کے بھاگ گیا ہے۔ اور اس عرصہ میں اُس کی لاش کہیں چھپا دوں گا۔ لیکن یہ بھی تو کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس کی لاش کو باہر نکالنے میں مجھے اپنی پوری فتنے کام لینا پڑا۔ مگر خسر کار میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس کی لاش ایک کچے میں ڈال کر اڑاں کا ڈھکنا کیوں سے بڑھ کر اُسے گود میں رکھ لیا جہاں مجھے آئندہ سال کی کڑی کے لئے اُس کو شراب سے سحرنا تھا۔ جب یہ کتیا اپنی جگہ پر رکھ دیا گیا۔ تو میں نے ایک لمبی نلی کے ذریعے سے تالاب کی شراب اچھے اس کو بھر دیا۔ اس میں نے صبر کیا کہ ایک بھاری بوجھ میرے نارغ سے اتر گیا ہے۔ یہ کہ کافور عرصہ تک اس راز کے افشا ہونے کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔

میں اپنا کام ختم کر کے بیٹھا بھی تھا کہ میرا مالک بھی شراب خانہ میں آ موجود ہوا۔ اور اس نے دریافت کیا کہ عجبیہ کہاں ہے۔ میں نے جواب دیا: "وہ ملازمت چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔" وہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ وہ یہاں آئندہ ہرگز کام نہ کرے گا۔ میرے آقائے اس کی گرفتاری کے لئے پولیس میں اطلاع دے دی تاکہ وہ اپنے بہترین نوکر کو کہیں کھو نہ بیٹھے کچھ عرصے کے بعد جب "فرار شدہ" عجبیہ کا کچھ پتہ چلا۔ تو یہ خیال کر گیا کہ اُس پاگل نے غصہ کی حالت میں خودکشی کر لی ہوگی۔ اس کے بعد نہ تو اُس کے متعلق کچھ کہا گیا نہ مانا گیا۔ پہلے کی طرح میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ چونکہ میں اس وقت شراب خانے پر پوری طرح سے مسلط تھا۔ چکا تھا اس لئے مجھے امید دلاتی تھی کہ میں کسی نہ کسی دن چپکے سے اپنا بوجھ اٹھا کر شراب خانے سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

جب بہار کا موسم پھر شروع ہوا۔ تو میں بھی اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں ترکی سپاہ کا سردار مجھے آغا کھتے آ موجود ہوا۔ یہ لوگ عام طور پر نہایت ظالم اور خود مختار ہوتے تھے جہاں جانے ایک تہلکہ مچا کر دیتے۔ وہ آغا بھی انہی میں سے ایک تھا۔ وہ شرابی تھا۔ اور ہمارے بہترین گاہکوں میں سے ایک تھا۔ چونکہ اس کے تمام مصاحب عوام سے روشناس تھے۔ اس لئے وہ ان کو

شراب خریدنے نہ بھیجتا۔ بلکہ وہ خود ہمارے شراب خانے میں آکر ایک کپا پسند کر لیتا۔ جسے ایک پاکی میں رکھ کر اس کے پردے گر کر دے جاتے جس سے یہ ظاہر نہ ہو کہ مقصود ہونا کہ آخانے کوئی نئی خانوں حرم میں داخل کی ہے میرے آخانے آفا کو شراب کے وہ سب کپے دکھائے جو اس سال کی فروخت کے لئے تیار کئے جا چکے تھے۔ اور دو قطاروں میں رکھ دئے گئے تھے۔ اس نے ددین کپوں کی شراب پیتی لیکن اس کو پسند نہ آئی۔ اور کہنے لگا۔ دوست ایسے شراب ہی قوم سے جہاں تک ممکن ہو ہمیشہ بدترین بل سب سے اگے کھتی ہے میرے خیال میں جو شراب تم نے مجھے دکھائی ہے۔ اُس سے بہتر کھلی قطائیں ہوں گی۔ ذرا اپنے یونانی سے کہو تو کہ مجھے اُس کپے کی شراب چکھائے۔ اُس نے اُس کپے کی طرف اشارہ کیا جس میں مشی بند تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جو بھی آفا وہ شراب چکھے گا۔ اُن کا منہ مزہ ہو جائے گا۔ اور وہ اُسے فوراً تھوک دے گا۔ اس لئے میں نے جلدی سے اس شراب کا ایک گلاس بھر کر آفا کو پیش کر دیا۔ اُس نے اس کو چکھا اور پھر نہایت حیرت استعجاب سے اس کو ردشی میں لے جا کر فور سے دیکھنے لگا۔ اُس نے اُس کو بھر چکھا۔ اور پھر اُسے لے کر بیٹا شروع کر دیا۔ پھر وہ میرے مالک کی طرف مخاطب ہو کر یوں گویا ہوا۔ کیوں بے ہودھی کئے تو مجھے میرے دھوکا دینا چاہتا تھا جب تیرے پاس ایسی خوش ذائقہ مزے دار اور لطیف شراب موجود تھی۔ جسے بہشت کی حویں بھی مزے سے گھونٹ گھونٹ پیتیں۔

آخانے مجھ سے پوچھا کیا یہ سب شراب ایک ہی قسم کی نہیں؟ میں نے جواب دیا۔ ہاں جناب یہ سب ایک ہی قسم ہے۔ آفا کہنے لگا۔ ۱۲ چھانڈا اس کو چکھو تو۔ اور پھر اسے چکھو تو تم مجھے پہلے پیش کر رہے تھے۔ جو بھی آخانے شراب کا گلاس منہ سے لگایا اس کا چہرہ متحیر ہو گیا۔ اور کہنے لگا کہ بمعنی واقعی یہ شراب تو بڑے مزے کی ہے لیکن میں حیران ہوں کہ کیا بات ہے پھر اس کو چکھو تو۔ بلکہ اس شراب کے چکھنے کو ذرا بھی نہ چاہتا تھا۔ میں نے نہایت بددلی سے تھوڑی سی چکھ کر اس کی تائید کر دی۔ آفا کو وہ شراب ایسی پسند آئی کہ اُس نے پھلی قطار کے ددین کپوں کی شراب چکھ ڈالی یہ اُمید کرتے ہوئے کہ شاید اُسے ایسی ہی شراب کچھ اور مل جائے۔ جب اُسے ایسی شراب نہ ملی۔ تو اس نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ اس کپے کو گھر لے جائیں اُنہوں نے وہ کپا پاکی میں رکھ دیا۔ اور اُسے اٹھالے گئے۔

تم اس خوف کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جو میں نے اس وقت محسوس کیا جب کہ غلام شراب کا وہ کپا اٹھالے گئے۔ میں نے سوچا کہ اب میری جان کی خبر نہیں۔ مجھے فوراً سمہنا سے بھاگ پانا چاہئے میں نے اندازہ کر لیا کہ کتنے عرصہ میں آفا کی شراب تم ہوگی۔ اور اس کے مطابق نہایت سرگرمی سے تیاری شروع کر دی میں نے اپنے آقا سے کہ دیا کہ میں جا رہا ہوں کیونکہ مجھے جڑ بھٹکت میں ایک رشتہ دار نے بلایا ہے تاکہ میں اس سے مل کر کوئی کامد بار شروع کر دوں میرا مالک جس کا گناہ میرے بغیر شکل بخلا مجھے وہیں طہرے پر ضامنہ کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں اپنی ضد کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں اس کے پاس ہی رہوں۔ تو وہ مجھے اپنا حصہ دار بنانے پر تیار ہے۔ لیکن میں نے اس کی یہ بات نہ مانی شراب خانے کے دروازے پر ذرا سا کھٹکا ہوتا۔ تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ کہ کہیں آفا اپنے سپاہیوں کے ہمراہ مجھے گرفتار کرنے تو نہیں آ رہا۔ مجھے اگلے دن روانہ

ہونا تھا کہ میرا آقا ہاتھ میں ایک دستاویز لے کر اٹھتا ہوا اور مجھ سے یوں کہنے لگا تیس شاید تہیں خیال ہو گا کہ میں نے صرف تمہیں سفر سے باز رکھنے کے لئے اپنا حصہ اربانے کا وعدہ کیا ہے۔ اور دراصل میں تم کو دھوکا دے رہا ہوں لیکن شک و دو کر کرنے کے لئے میں یہ دستاویز نکال رہا ہوں جس کے دوسرے سرے سے تم میرے جیسے کے مالک قرار دے گئے ہو۔ دیکھ لو اس پر تقاضی کی مہر تصدیق بھی ثبت ہو چکی ہے۔

آقا نے کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور میں اٹھا کر کرتے مجھے واپس کرنے ہی کو تھا کہ کسی نے زور زور سے شراب خانہ کا دروازہ کھٹکھٹا کر ہمیں دہشت زدہ کر دیا۔ سپاہیوں کی ایک جماعت جو آغا نے ہماری گرفتاری کے لئے بھیجی تھی۔ اندر داخل ہوئی مجھے تو معلوم ہی تھا کہ اصل بات کیا ہے میں اپنے دل میں اپنے آپ کو بہت بُرا بھلا کر رہا تھا کہ میں خوراک کیوں نہ بھاگ گیا بات یہ تھی کہ آغا کو وہ شراب ایسی پسند آئی کہ اس نے میرے انداز سے پہلے ہی چٹ کر ڈالی۔ شراب کے کپے کے تیسرے حصے میں تو غلام ہی سما چکا تھا۔ اس لئے شراب کا اس قدر جلد ختم ہونا لازمی امر تھا۔ اب میرے لئے ذرا کا کوئی اسکان نہ تھا میرا آقا جو اس حقیقت سے آناشتا تھا بالکل مطمئن تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے سپاہیوں کے ساتھ ہوا لیا۔ لیکن باوجود دہشت کے میرا دل پھٹا جاتا تھا۔

جب ہم دہلی پہنچے تو آغا نہایت غصہ سے میرے مالک پر برس پڑا۔ اور کہنے لگا "دو سو دس کتے کیا تو ایک یا تہا مومن کے پاس دھوکے سے شراب کا ایک ایسا لپٹا زورخت کرتا ہے جس کا دو تہائی حصہ بھی بھرا ہوا نہیں۔ خوراک تو نے اس میں بھاری بھاری کیا چیز بھر دی ہے؟"

میرے آقا نے کہا صاحب میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا بالکل بے تصور ہوں "آغا نے جواب دیا اچھا کپا غالی تو ہو چکا ہے۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ذرا اپنے یونانی کو بھیجو کہ اندر لے آئے تاکہ اس کو میری موجودگی ہی میں کھولا جائے۔ دو سناہی اندر لانے کے لئے روانہ کر دئے گئے جب وہ پاس آئے۔ تو آغا نے مجھے کپے کا ڈھکنا اکھاڑنے کے لئے کہا۔ اب مجھے اپنی موت کا پورا پورا یقین ہو چکا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ آغا سے مقابلے میں آقا سے زیادہ ناماوض ہے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ کالے حبشی کی لاش پہچانی جائے گی تو فوراً میرا مالک برسی ہو جائے گا۔ اور مجھ پر اس کے قتل کا الزام ثابت ہو جائے گا۔ میرے ہاتھ کا پٹہ یہ ہے تھے جب میں آغا کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں کپے کا ڈھکنا اکھڑ گیا۔ حبشی کی لاش دیکھ کر سب حاضرین دہشت زدہ ہو گئے۔ میں بھی اس کو دیکھتے ہی نہایت خوفزدہ صورت بنا کر پیچھے ہٹا۔ تاکہ مجھ پر سے رہا سہا شک بھی دور ہو جائے۔ لیکن یہ بات بہت عجیب تھی۔ کہہ جائے اس کے کہ حبشی کی لاش بدستور سیاہ رہتی۔ وہ بالکل سفید ہو چکی تھی۔

"خدا یا تیری پناہ۔" میرے مالک کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "اے خدا میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" ایک لاش لے لے خدا میری مدد کر۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ کیوں چیریں؟ تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ "دانش میں اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ میں خدا کو حاضر ناظر مان کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کے متعلق

”کچھ علم نہیں۔“

جب ہمارے درمیان پینگوین ہو رہی تھی۔ تو آغا میرے مالک کو نہایت غصہ ناک لگا ہوں سے گھوڑا محتاجن سے آغا کی بے پناہ نفرت اور عقارت ظاہر ہو رہی تھی۔ باقی تمام ماہرین اگرچہ خاموش تھے لیکن اُن کے بشرے سے ظاہر تھا کہ وہ میرے آقا کو چرچنے پھاٹنے میں بھی کوئی دوزخ نہ کریں گے۔

میرے آقا نے کہا اے آغا میں خوشی اس کپڑے سے دوسرے تیل کر دوں گا لیکن میں لاش کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ آغا جواب دیا: ”یہی سہی میرا غلام اس کپڑے کو ابھی لے آئے گا۔“ معطرے ہی عرصے میں غلام شراب کا ایک گپٹا لے کر آجوا ہوا۔ میرا آقا سے کہنے لگا۔ گو ایک غریب یہودی کے لئے یہ بڑا بھاری نقصان ہے۔ تاہم میں یہ بیعت آپ کی مذکر کرتا ہوں۔“ اور اس نے واپس جانے کے خیال سے اپنی ٹوپی اٹھالی۔

آغا نے جلا کر کہا ”مگر جاذب شہابی شراب مفت ہی میں پیغم نہیں کر دوں گا۔“ میرے آقا نے کہا: ”اچھا تو پھر آپ مجھے اس کی قیمت بھی ادا کریں گے۔ آپ بڑے انصاف پسند ہیں۔“ آغا نے تیزی سے جواب دیا: ”ابھی تم کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور اپنے نوکر دوں سے کہا کہ وہ اس شراب کو کپڑوں میں بھر دیں۔ جب شراب کا گپٹا خالی ہو گیا۔ تو آغا نے اس کا ڈھکنا اُترا دیا پھر اُس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ میرے آقا کو اٹھا کر اُس میں بند کر دیں اُس وقت میرے آقا کی حالت نہایت قابل رحم تھی میں اپنے آپ پر لعین بھیج رہا تھا کیونکہ میرے پاس اپنے آقا کو قصور وار ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اور میں جانتا تھا کہ میرے کئے کی سزا اس کو مل رہی ہے۔ سپاہیوں نے میرے آقا کو اٹھا کر اُس کپڑے میں بند کر دیا۔ آغا نے مجھے حکم دیا کہ تم پہلے کی طرح اس پر کیلوں سے مضبوط ڈھکنا لگا دو۔ اگرچہ میلرڈل یہ کام کرنے کو بل نہ چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اس لئے میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اب آغا نے نوکر دوں کو حکم دیا کہ وہ اس کپڑے کو پھر شراب سے بھر دیں۔ اس طرح میرا قیصو آقا جہنم کے لئے تیار کر دیا گیا۔

اب آغا میری طرف مخاطب ہو کر پوچھنے لگا: ”تم اس معاملے کے متعلق کیا جانتے ہو؟“ میں نے سوچا کہ اب میرے آقا کی جان تو لی جا چکی ہے۔ اب اگر میں اس کو کچھ بڑا بھلا بھی کہہ دوں۔ تو اُس کا کچھ نہ بگڑے گا میں نے آقا کو جواب دیا: ”مفتو میں اس کے ہوا اور کچھ نہیں جانتا۔“ کچھ عرصہ قبل ایک حبشی نہایت بڑا سراسر طریقے سے غائب ہو گیا تھا۔ اور میرے آقا نے اس کی تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ جنھو اب مجھے پورا یقین ہو گیا ہے۔ کہ اس جیلے کا بھی یہی نتیجہ نکلا گا۔ اور جب اب شراب کا وہ گپٹا اٹھا لے گئے تھے۔ تو میرا آقا بہت افسوس کرتا رہا۔ شاید اُس نے وہ کسی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ شاید میری بھی یہی گت بنتی تھی۔ شک ہے کہ اب لاری بھی میری ہی تھی کیونکہ جب میں نے یہاں سے جانے کا ارادہ کیا۔ تو وہ میرے یہیں ٹھہرنے پر مصر ہوا جب میں کسی طرح نہ مانا تو اُس نے یہ دستاویز پیش کی۔ یہ پڑھ لیجئے۔ اُس کے رُود سے میں اُس کے نفع کے تیسرے حصے کا مالک قرار دیا جا چکا ہوں۔ شاید میں اس نفع سے زیادہ دیر متعین نہ ہو سکتا۔

آغا نے جواب دیا اے یونانی یا چھا ہی ہوا۔ یہ تمہارے لئے بہت فائدہ مند ہو گا۔ کیونکہ چند شرائط پر تم اُس کی تمام کامنڈا کے مالک قرار دئے جا سکتے ہو۔ پہلی شرط یہ ہے کہ شراب کا یہ کپا جس میں یہ حرامی یہودی بند ہے تمہیں اپنے پاس رکھنا ہو گا۔ تاکہ جب میں دُعاؤں تو اپنے انتقام اور انصاف کی یاد تازہ کر کے خوش ہو گا کروں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ شراب کا یہ دوسرا کپا بھی تم اپنے پاس رکھو جس میں یہ حبشی غلام بند ہے تاکہ اس کو دیکھ کر میرا فصد تازہ ہو جایا کرے۔ آخری شرط یہ ہے کہ میں تم سے جس قسم کی بہترین شراب مانگوں تمہیں مفت دینی ہو گی۔ کیا تمہیں یہ شرائط منظور ہیں۔ یا میں تمہیں بھی اس گناہ کا ارتکاب کرنے والوں میں سے ایک سمجھوں۔

میں نے شکر کیا۔ اور یہ سب شرائط مان لیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس وقت کوئی بھی کسی یہودی کی پر دانہیں کیا کرتا تھا۔ جب مجھے کوئی کپے تاکہ یا غیر حاضری کے منتقل کچھ پوچھنا۔ تو میں پوچھنے والے کے قریب نہایت راز داری سے جا کر کہتا کہ آغا کے سپاہیوں نے اُسے قید میں ڈال رکھا ہے اور اس کے رہا ہونے تک میں یہاں کام کروں گا۔ آغا کی خواہش کے مطابق شراب کے دفوں پُتے جن میں حبشی غلام اور یہودی تاجر بند تھے۔ ایک بیچ پر سب کپوں سے ادھ سٹور کے درمیان رکھ دئے گئے۔ آغا ہر شام شراب خانے میں آتا اور گھنٹوں اس کپے کی طرف دُجس میں میلاؤا بند تھا۔ ہر گھنٹہ لگائے گا لیاں دیتا رہتا۔ اس دوران میں وہ اس قدر شراب پیتا کہ اکثر اُس کو تمام رات شراب خانے میں بسر کرتے بنتی۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ میں نے اُن کپوں کے مفید اجزاء سے کچھ کام نہ لیا۔ میں رات کو چپکے سے اُن کپوں میں سے پہلی شراب نکال لیتا اور تھوڑی تھوڑی شراب دیکھ کر کپوں میں ٹپکا دیتا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد میرے پاس شراب کا ایک گیلن بھی ایسا رہا جس میں میرے آقا اور حبشی غلام کے عرق کی تیز تر نہ ہو۔ اب میری شراب پہلے سے بہت بہتر ہو گئی۔ اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں میں ایک امیر آدمی بن گیا۔

تین سال نہایت خوشحالی میں بسر ہوئے۔ آغا میرا مستقل گاہک بن چکا تھا۔ اور کم از کم ہفتہ میں تین بار میرے شراب خانے میں آکر نشے میں چور چڑا رہتا تھا۔ اب اس کی صحبت نے مجھے بھی پکا شرابی بنا دیا۔ ایک روز اُسے کلمہ آیا کہ اپنی سپاہ کے سر سلطان کی فوج سے آئے۔

جس دن اس کی فوج کو کوچ کرنا تھا۔ وہ مجھے دروازے پر بٹھرا۔ اور اپنے عجب گھوڑے سے اُتر کر ایک آخری جام پینے آیا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ کوچ شروع کریں۔ وہ بعد میں اُن سے آئے گا۔ اس نے بے تحاشا شراب پی کر شروع کر دیا۔ ایک گلاس کے بعد دوسرا غالی ہوا اور دوسرے کے بعد تیسرا۔ ساتھ ہی وقت بھی گزرتا گیا۔ رات ہونے کے قریب تھی اور آغا صاحب پتھول نشے میں محو ہو چکا تھا۔ اُس نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اُس کو شراب خانے کے ذخیرہ میں جہاں شراب کے دونوں کپے رکھے تھے۔ لے جاؤں تاکہ وہ ایک دفعہ پھر مجھے آقا کو اچھی طرح گالیاں دے۔ چونکہ اس رات میں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی تھی۔ اس لئے میں نشے کے عالم میں آغا سے یوں گویا ہوا۔

’لے قابل ستائش آغا میرے آقا کو زیادہ گالیاں نہ دیکھئے۔ کیونکہ دراصل وہی میری خوشحالی کا باعث ہوا ہے چونکہ آپ اب جا رہے ہیں۔ اس لئے میں آپ پر ایک رانا فشا کئے دیتا ہوں۔ میرے ذخیرے میں شراب کا ایک قطرہ بھی ایسا نہیں۔ جو یا تو میرے آقا یا جشی غلام سے خوش جو دار نہ کر دیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میری شراب بہترین مانی جا چکی ہے۔‘

’ہیں! کیا!‘ آغانے بڑبڑا کر کہا جس کے لئے اب نشے کی حالت میں بولنا بھی تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ اچھا لے تیرا تیری سزا موت ہے۔ تو بھی اپنے مالک کی طرح کیفر کردار کو پہنچے گا۔‘ تو ایک مومن کو ایک گنہگار کا ذکر کے غرض الی شراب پلانا مارا۔ اے دجال! تو ضرور موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔‘

وہ ٹپک کر میری طرف بھاٹکیں اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور نشے کے عالم میں وہ دم سے زمین پر آگرا۔ اور پھر نہ اٹھ سکا میں نے سوچا کہ یقیناً وہ جوش میں آئے پر بھی یہ واقعہ نہ بھولے گا۔ اور میں اس کے انتقام کا شکار ہو جاؤں گا۔ موت کے خوف نے اور شراب کے نشے نے مجھے بتا دیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں نے فوراً آغا کو گردن سے پکڑ کر ایک کپتے میں گھیر دیا اور اس کا ڈھکنا مضبوط بند کر کے اس کو شراب سے بھر دیا۔ اس طرح میں نے اپنے غریب آقا کا بدلہ لے لیا۔ اور آغا کا قصہ ہمیشہ کے لئے پا کر گھٹ گیا۔ اس کے بعد میں صحن میں گیا جہاں آغا کا گھڑا بندھا تھا۔ میں نے آغا کی تلوار لے کر بجائے جانور کو چھٹی طرح زخمی کر کے چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنے گھر چلا جائے۔ آدمی رات کو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے آغا کے گھروالوں کو جگایا جب انہوں نے دیکھا کہ گھوڑا زخمی ہو چکا ہے اور آغا اس پر سوار نہیں۔ تو انہوں نے خیال کیا کہ آغا کو دشمن کے کسی گروہ نے راستے میں قتل کر دیا ہوگا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آغا کس وقت تمہارے گھر سے نکلا تھا میں نے کہا کہ شام ہونے کے ایک گھنٹہ بعد۔ اور میں نے انہیں بھی بتا دیا کہ وہ اس وقت شراب کے نشے سے جوڑ تھا چنانچہ وہ اپنی تلوار بھی یہیں بھول گیا ہے میں نے تلوار ان کے حوالے کر دی۔ اب میں اپنے خطرناک انداز سے ہٹائی آپ کا تھا۔ اگرچہ وہ میری شراب کا کافی حصہ پی گیا تھا لیکن میں نے بھی اس کی استعمال شدہ شراب پر سودا کر نقصان اُڑا کر لیا۔ یعنی آغا کی آئینش سے اپنی باقی ماندہ شراب خوشبودار کر لی میں نے یہ تیرا لٹا بھی ان دو کپڑوں کے ساتھ رکھ دیا اب مجھے اور بھی زیادہ نفع ہونے لگا۔ اور میری شراب دور دور تک شہور ہو گئی۔

ایک دفعہ شہر کا قاضی جو میری شراب کی شہرت سن چکا تھا۔ میرے شراب خانے میں آیا۔ اسی اس عزت انفرادی پر جھگڑا رہا۔ بجالایا۔ میں مدت سے اس کو اپنا خریدار بنا جاتا تھا میں نے اپنی کچھ بہترین شراب گلاس میں ال کر قاضی کو پیش کی۔ اور کہا تالی جاہ! یہ میرے آقا کی شراب ہے۔ مرحوم آغا اس کے بٹے سے شہید اتھے جسے چاہے تو تمام کا تمام لٹا بھی اٹھو کر لے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ کہنے لگا۔ ہاں یہ بھی خوب تجویز ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے غلام کو برتن دے کر بھیجا جائے۔ یہ بہتر ہے کہ تمام کا تمام لٹا کر ایک ہی دفعہ خرید لیا جائے۔ تاکہ انسان لوگوں کے اعتراض سے بچ جائے۔ میں بھی ایسا ہی کر دیا لیکن خریدنے سے پہلے مجھے ذرا کچھ لینا چاہئے اُس نے بہت سے کپڑوں کی شراب کھی لیکن اُس کو سب سے زیادہ پسند وہی آئی جو میں نے پیش کی تھی۔ آخر کار اُس نے ان تینوں کپڑوں

پڑنگاہ ٹالی جو سب سے اونچے رکھے گئے تھے۔ اور دریافت کیا کہ وہ کیسی شراب ہے؟ میں نے جواب دیا خالی کپے ہیں خراب، لیکن وہ اپنی چھڑی سے کپڑوں کو ٹھوکریں لگا کر کہنے لگا: "تم تو کہتے تھے کہ کپے خالی ہیں۔ لیکن یہ آواز سے تو مجھے ہونے معلوم ہوتے ہیں یقیناً ان کپڑوں میں تم نے بہتر شراب چھپا رکھی ہے۔ ذرا اس کپے کی تھوڑی سی شراب تو دکھاؤ۔"

مجھے چار دن پانچا تھیں کرنی پڑی۔ اس نے وہ شراب بھی۔ اور کہنے لگا: "واللہ یہ نہایت ہی عمدہ اور خوشبو دار شراب ہے۔ میں یہ تمام کی تمام خرید لوں گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ یہ شراب دوسرے کپڑوں کی شراب کو خوشگوار بنانے کے لئے رکھی گئی ہے۔ اور اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ مجھے امید تھی۔ وہ اس کی زیادہ قیمت ادا نہیں کر سکے گا۔ وہ پوچھنے لگا: "اُس کی کیا قیمت ہے؟ میں نے کہا: پہلی سے چار گنا زیادہ۔ قاضی چلا کر کہنے لگا: مجھے منظور ہے۔ مجھے منظور ہے۔ ظاہر ہے کہ اچھی چیز قیمت خرچ کے بغیر نہیں مل سکتی۔"

میں سخت خوف زدہ ہوا۔ اور میں نے قاضی کو صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس شراب کو فروخت نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں نے اپنی شراب کو عمدہ بنانے کا سامان تباہ کر دیا۔ تو میری تمام شہرت خاک میں مل جائے گی۔ لیکن میرے تمام مدبر بے کفایت ہوئے قاضی کہنے لگا: "میں نے تم سے قیمت پوچھی تھی اور تم عام شراب سے چار گنا قیمت پر رضامند تھے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا میں تم سے شراب خرید چکا ہوں اور اب اسے واپس نہیں دے سکتا۔ اُس نے اپنے نوکر دوں کو بلایا۔ جو شراب کے تینوں کپے اٹھا کر لے گئے۔"

میں نے دوسرے ہی دن سفر کی تیاری شروع کر دی۔ جلد ہی قاضی سے قیمت بھی وصول کر لی گئی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں اب یہ جگہ چھوڑ رہا ہوں کیونکہ مجھے زبردستی اس شراب کی فروخت پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور مجھے اپنی تجارت کے فروغ کی بھی کوئی امید نہیں رہی۔ میں نے اُس سے دوبارہ التجا کی کہ اگر تینوں کپے واپس دے دے تو میں اُس کے عوض اس کو تین دوسرے کپے مفت دے دوں گا۔ لیکن اُس نے میری ایکٹ منی۔

میں نے ایک چاروان سے چند شرائط طے کر کے اپنی کچی شراب لے دوادی۔ اور اپنا تمام سرمایہ لے کر اس سے پہلے کہ قاضی پر میرا راز افشا ہوئے پائے جزیرہ کارنیو کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن یہیں دسے میں ایک سخت آمدنی اور طوفان سے بالاپڑ گیا دو ہفتے تک ہم لگے بٹھنے کی بے فائدہ کوشش کرتے رہے۔ آخر کار اس طوفان نے ہمارے جہاز کو پھر سرنگی کی طرف دھکیل دیا جب موسم ذرا سکون پذیر ہوا۔ تو میں نے کپتان سے کہا کہ اب میں ساحل سے دھاؤں لنگر اٹاؤں اور چلا جاؤں گا۔ تاکہ مطلع صاف ہونے پر ہم فوراً اپنا سفر جاری کر سکیں۔ ابھی ہمیں لنگر ڈالے ہوئے پانچ منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے۔ کہ میں نے دیکھا کہ ساحل کی طرف سے ایک کشتی ہماری طرف آمدنی ہے جس میں قاضی اور مدلت کے دوسرے رکن موجود تھے۔ مجھے اپنی گرفتاری کا پورا یقین ہو چکا تھا۔ میں حیران تھا کہ کیا کردار کیا نہ کروں۔ دفعۃً مجھے خیال آیا کہ میں نے آپ کو کیوں نہ شراب کے ایک کپے بیچ کر کے چھپاؤں میں نے کپتان کو جلدی سے جہاز کے پچھلے کمرے میں بلایا۔ اور اسے مختصر طور پر تمام واقعات سے آگاہ کیا اور اس سے وعدہ

کیا کہ اگر وہ اس وقت میری مدد کرے گا تو میں اپنے مال کا بہت سا حصہ دے دوں گا۔

کپتان جو میری قسمی سے یونانی تھا اس بات پر رضامند ہو گیا۔ ہم جہاز کے گودام میں پہنچے اور ایک کپتے سے شراب کا مال لیا۔ اس میں داخل ہو گیا۔ اور کپتان نے اوپر مضبوط دھکنا چڑوایا۔ اس کے بعد فوراً ہی قاضی بھی جہاز پر پہنچا۔ اور میرے متعلق دریافت کرنے لگا۔ کپتان نے اسے جواب دیا کہ جناب طوفان کے دوران میں وہ دھک پر سے سمندر میں گر پڑا تھا۔ اور اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔

قاضی کہنے لگا "افسوس کہ میں اس بدعاش سے بدلہ بھی نہیں لے سکا۔ لیکن کیا تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟ ذرا بین جہاز کی تلاشی تو لوں۔"

قاضی اور اس کے مصاحبوں نے جہاز کا کونا کونا چھان مارا۔ لیکن وہ مجھے کہیں بھی نپا کر واپس چلے گئے۔ اربین نے طینٹ کا سانس لیا۔ کپتے کی گڑھی میں جو شراب سرایت کر چکی تھی۔ اس کی بدو سے میرا دماغ پھٹا جاتا تھا۔ اور میں طینٹا تھا کہ اب مجھے جلد از جلد وہاں سے رہائی ہو۔ لیکن عدا کپتان کب مجھے چھوڑنے والا تھا۔ وہ تو میرے پاس پھٹکا کنگ نہیں۔ رات کے قریب اس نے جہاز کا لشکر اٹھایا اور جہاز نڈا نہ ہو گیا۔ میں نے کپتے کے پاس دو ادیبوں کو باہر کتے سنا۔ اور میں کپتان کے ارادے سے طلع ہو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ مجھے سمندر میں ڈبو کر میری تمام جائیداد پر غصہ کر لے۔ میں کپتے کے سوراخ کے قریب (جس میں سے شراب اُلی جاتی ہے) ٹنڈا لاکر زور دے کر چلا کر حم کی التجائی کرنے لگا۔ لیکن بے سود ثابت ہوا۔ جہاز کے ادیبوں میں سے ایک نے جواب دیا: تمہارے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیے جو تم نے دوسروں سے روا رکھا تھا۔

اب میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اگر مجھے غرق ہی ہونا ہے۔ تو میرا عید سے جلد فیصلہ کر دیا جائے۔ تاکہ مجھے اس غم و اندوہ اور مصیبت سے جلد چھٹکارا حاصل ہو۔ مجھے موت کا خیال موت سے زیادہ اذیت دے رہا تھا۔ لیکن قسمت میں کچھ اور بھی لکھا تھا۔ آمدنی نہایت زور و شور سے چلنے لگی۔ اور جہاز کے ڈبنے کا خطرہ ہو گیا۔ کپتان اور دوسرے ملازم جہاز کی نگرانی میں اس تندرک ہو گئے کہ یا تو وہ مجھے بالکل بھول گئے۔ یا میری موت کسی ٹپاسن 'ن پڑوسی کر دی گئی۔

تیسرے دن میں نے ملاوٹ کو کہتے سنا کہ اگر ان کے جہاز پر مجھ جیسا بدکردار سوار ہو جیسا کہ وہ ضرور غرق ہو جائے گا۔ انہوں نے کپتے کے سوراخ کا ڈھکنا اتار دیا اور مجھے موہیں مارتے ہوئے سمندر میں بھیج دیا گیا۔ تاکہ کپتے میں بانی بھر جائے۔ اور میں ڈوب جاؤں۔ کپتے کے سوراخ میں میں نے اپنا نڈال ٹھوس دیا۔ اور کٹپا پانی میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ جب اس کا سوراخ والا حصہ پانی میں جاتا تو میں دُمان کی مدد سے اس میں پانی داخل نہ کرنے دیتا۔ جب سوراخ پانی سے باہر آتا تو میں فوراً سوراخ سے دُمان نکال لیتا۔ تاکہ اس میں تازہ ہوا داخل ہو سکے۔ کٹپا کھوتا جاتا تھا اور دُمانے دھکوں اور کپکپوں کے پیرا پیرا حال تھا۔ میں تھکا کر پور ہو گیا۔ اور میں نے چاہا کہ سوراخ میں سے دُمان نکال لوں تاکہ اس خوش زندگی کا کہیں غامدہ نہ ہو۔ دفعہ سمندر کی موجوں نے مجھے تین ایسے دھکے دئے۔ کہ میں اب دُمان کی مدد سے پانی نہ روک سکا۔ کپا ٹھکنا ہوا موجوں پر بلند ہو گیا۔ جھلکے نہ درے کسی چیز کے ساتھ ٹکرایا اور میری

تاک کو بڑی طرح چٹ آئی۔

ایک لمحہ کے بعد میں نے کچھ لوگوں کو بائیں کرنے مٹا۔ وہ کپٹے کے پاس جمع ہو گئے وہ انہوں نے اس کو کنارے کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ میں کپٹے میں غاموش رہا کہ مسادادہ میری آواز سن کر خوف زدہ ہو جائیں اور مجھے پھر مسند رک بے پناہ موجوں کے والے گردیں جب وہ ایک جگہ اکڑ گئے تو میں نے سوراخ کے قریب منہ لاکر نہایت خفیف آواز سے کہا خدا کے لئے مجھ پر رحم کئے اور مجھے باہر نکالے۔

پہلے تو وہ لوگ خوف زدہ ہو گئے لیکن جب میں نے اُن سے کئی دفعہ گوگڑا کر التجا کی اور انہیں بتایا کہ میں جہاز کا مالک ہوں اور کپتان اور دوسرے ملائوں نے مجھ سے غداری کر کے مجھے اس طرح مسند میں پھینک دیا ہے تو انہوں نے کپٹے کا دھکیلنا اکھاڑا اور مجھے رہائی دلائی۔

رہائی کے بعد سب سے پہلے جس چیز پر میری نگاہ پڑی۔ وہ میرا جہاز تھا جو ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ ہر لہر جو جہاز کو کنارے کی طرف دھکیلتی تھی ساتھ ساتھ اس کی دھمچائیاں اڑائی جاتی تھی جہاز کے بچ میں سے دھمکوتے ہو گئے تھے اور پانی میں ہر طرف جھاگ ہی جھاگ نظر آتا تھا جیسے سب کچھ مسند میں کھڑے ہوئے تیرے تھے کیونکہ جہاز کی ٹکر کے بعد جب وہ کنارے سے آگے۔ تو ساحل کے لوگوں نے انہیں پھر مسند میں دھکیل دیا تھا۔

جب مجھے ذرا ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے سپاہی میرے ارد گرد بیٹھے انگ تاپ رہے ہیں۔ اور میری شراب کا ایک گلیا نہایت سرعت سے خالی کیا جا رہا ہے۔ میرے منہ میں بھی تھوڑی سی شراب الٹی گئی جس سے مجھ میں اٹھنے کی طاقت لگتی اب اُن سپاہیوں میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ اُن کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ خدای جہاز کی تباہی کو بچ بچلے تھے۔ انہوں نے مجھے تمہارے بے پناہ گناہوں کی عجیب و غریب استائیں سنائی ہیں اب بیٹھے جاؤ اور مجھ سے سچ سچ بتاؤ اگر میں تمہارا بیان یقین کر لیا تو تم سے انصاف کیا جائے گا میں یہاں قاضی ہوں اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ تم کہاں ہو تو بیچ بیچ تلخ کاجیزہ بچیا ہے۔ اگر تم یہ جانتا چاہتے ہو کہ تم کس کی صحبت میں ہو تو ہم وہ لوگ ہیں جنہیں مابین لوگ بھری ڈاکو کہتے ہیں اب سچ سچ کہو۔ میں نے خیال کیا کہ بھری ڈاکو اُن کو میری کہانی دوسرے لوگوں سے ذرا زیادہ ہی پسند آئے گی۔ اس لئے میں نے اپنی تمام کہانی غلط بہ غلط اس طرح بیان کر دی جس طرح اب تم سے بیان کر رہا ہوں۔

وہ نہایت توجہ سے سنتے رہے جب میں اپنی کہانی ختم کر چکا تو قاضی کہنے لگا تمہارا تم نے بتایا ہے تم ایک حبشی کو قتل کر چکے ہو اور ایک یودی کے قتل جو نے کا سبب بنے ہو۔ نیز تم نے ایک آغا کو شراب میں ڈبو کر ہلاک کیا ہے اس لئے تمہاری ذہنی موت ہے لیکن میں تمہاری قابل قدر شراب کا لطف ادا کرتے ہوئے اور ایک پراسرار راز کے افشا کرنے کی بنا پر موت کا حکم منسوخ کرنا چاہتا ہوں اور دوسرے سرداروں نے طوفانی مسند میں غداری کی ہے جو کیلئے قابل معافی گناہ ہے اس لئے اُن کی سزا بھی خوری موت ہے لیکن چونکہ اُن ہی کی وجہ سے ہمیں ایسے عمدہ شراب حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے میں ذرا اور نرم ہونا چاہوں اور اب ایک ایسا حکم صادر

کرتا ہوں جس کی وجہ سے تم سب اپنی تمام عزت شائستگی میں بسر کر دو گے۔ تم سب قاہرہ میں بطور غلاموں کے بیچ دئے جانے لگے ہندو تو ہم اپنی جیبوں میں ڈال لیں گے۔ اور تمہاری شراب پی جائیں گے۔

بھری ڈاکوؤں نے قاضی کے انصاف کی داد تالیوں سے دی۔ اور ہماری کوئی فریاد نہ سنی گئی۔ جب مطلع صاف ہوا تو ہم ایک چھوٹے سے جہاز میں جھکا قاہرہ کی طرف روانہ کر دئے گئے۔ جب ہم بندرگاہ میں پہنچے تو ہم فرخندہ کے لئے پیش کئے گئے اور زبرد خرید غلام بنائے گئے۔

مہدی علی خاں

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

حسن اتفاق سے غالب متغور کا ایک غیر مطبوعہ خط مل گیا جس میں حدودِ تہجی کی تذکیر و تائید پر بحث کی ہے۔ ناظرین ہمایوں کی فضا طبع کے واسطے نظرِ خط حاضر ہے۔

سعادت و انبیا نشان مرزا یوسف لیخان کو بعد دوما کے دل نشین ہو کر تذکیر و تائید پر مکتوب نہیں لے لیا تھا۔ اس ملک کے لوگوں کو تذکیر و تذکرہ پہلے پورباس کو نوشت لےئے ہیں۔ اخیر جو میری زبان پر ہو۔ وہ میں لکھ دیتا ہوں اس باب میں کسی کا کلامِ ثبوت اور برہان نہیں ہے۔ ایک گونہ لکھے جان لیا ایک ثبات لکھے جان لیا۔ اس کا قاعدہ مضبوط نہیں البتہ تذکرہ بر تانت نوشت، راج نوشت، دال ان نوشت۔ سے نئے نوشت۔ سب تذکرہ صوط نوشت، مرغ مذکر، مزنت تانت کاف لازم سم فون مذکر، داد ہی سی نوشت، لاملت حرف خود میں نہیں مگر لولنے میں مذکر بولا جائے گا۔ مثلاً لاملت کہا خوب کھاس کھاس گئے کیا خوب کھاسی ہے۔ مذکر ہی گئے خزاہ خداوند زادہ کا مخفف ہے کیونکہ فارسی میں عربی نہیں لے دو کا دندہ تھا خزاہ اور خزاہی ملوث صاب زادہ اور صاحب زادی ہے مگر گزشتہ تانتا ترک کرے۔ فتنہ ناکا لغت نہیں ہو سکتا عربی بھی نہیں۔ دندہ اردو ہے جیسا کہ میں لکھتا ہے۔ کہ درستم جسے دیکھ رہا ہے۔ فق۔ شعر لے حال کے کلام میں نظر نہیں آتا کیونکہ لفظ عربی اصل ہے۔ فارسی اردو میں مستعمل۔ دونوں زبانوں میں کم سمجھی باش اور ہر سمجھی مکانی فقیر آتا ہے ایران میں تکبیرا صاحب شہ ہوئے۔ مگر تکبیر لفظ مرکب ہے ہندی اور فارسی سے مگر مخفف کمال کا دھیمہ یعنی باش وہ چھوٹا گونہ کیونکہ خرد کے تلمذ رکھیں مگر تکبیر کہلاتا ہے۔ مگر یعنی چھانسی انگریزی لغت ہے۔ (غالب مزاح صاحب کی) *small* جسے مراد ہوگی۔ (فرخ) انگریزی زبان پر ہنگامہ میں سربس سے اور تذکیر میں لکھ رہا ہے۔ رواج پایا ہے۔ مگر یہ وضع کیا ہوا تو جہاں گیا کہ ہے جہاں تک کہ ہند میں اہل ہند کیا جانتے تھے۔ کون کون کیا ہے۔ معنی مفرد بلفظ جیسا کہ جگہ میں اچھی طرح نہیں سمجھا معنی مفرد معانی جمع اور یہ اردو کے عام معنی ہیں آخر کر کے تین کلاس شعر کے معنی کیا ہیں یا اس شعر کے معنی کیا خوب ہیں اس میں فرض نہیں کیا جاتا خاص نام کی زبان میں ہیں سی ہے معانی کی جگہ سے جوتے ہیں۔ اُرت لفظ ہندی اصل لفظ ہے۔ ہائے مضمرہ بعض مذکر بولتے ہیں بعض نوشت۔ ۱۰ شعر بہت اچھا ہے صاف دہوار !

راقم غالت

سید فرخ حیدر

نوٹ :- خط میں تاریخ مرقوم نہیں۔

کلامِ ناجور

مری زندگی جو کشاکشِ غمِ زندگی میں سر ہوئی
یہ ہے احترامِ جنوںِ عشق، یہ فرضِ مذہبِ عشق ہے
تو کہا یہ عشق نے آدھری زندگی کو سنوار دوں
تجھے ہم صغیرِ افس کی قید میں کیا نویدِ بہار دوں؟
کہ بہارِ عمر کو سو گوار بہارِ بن کے گزار دوں
تجھے کیا سناؤں یہ حادثہ کہ چمنِ بینِ حشر بہار ہے
ناجور

نوائے راز

خورشیدِ اُس کے نور سے شرمندہ ہو گیا
کیوں منفعِل ہو پیرِ دمیِ خضر سے کوئی
ذرہ فروغِ حسن سے رخشندہ ہو گیا
جو حرفِ آگیا مرے یواں میں لکھا
آئینہ نگذشتہ دامنہ ہو گیا
اُس شمعِ رو کی یاد کا اعجازِ دیکھنا
ہر ذرہ میری خاک کا تابندہ ہو گیا
افسونِ شجر بھی دمِ عیسیٰ ہی کم نہیں
جس کا بھی ہم نے نام لیا زندہ ہو گیا

حامد علی خاں

فطرتِ شاعر

کبھی یونے یزداں کے ہر نگینِ ہم
کبھی ہم سراپا اسیہِ خودی ہیں
کبھی اہرن سے ہم آہنگ ہیں ہم
کبھی خود سے آمادہ جنگ ہیں ہم
کبھی اپنی ہستی سے خود تنگ ہیں ہم
کبھی دہریں باعثِ تنگ ہیں ہم
کبھی دہریں باعثِ تنگ ہیں ہم
بزرگِ تماشائے نیرنگ ہیں ہم
تغیر پرستی ہے فطرتِ ہماری

جاذب

محفل ادب

مرزا غالب کی ظرافت نگاری

جب ہم مرزا غالب کی ظرافت کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ کسی جگہ بھستی کہتے ہیں نہ ظرافت کے لئے الٹھی یہ نہیں تلاش کرتے ہیں نہ لطافت پر اپنا دار و مدار رکھتے ہیں نہ غیر معمولی بابتیں بیان کرتے ہیں خوشی کی جگہ خوشی کے اور غم کی جگہ غم کے الفاظ لائے ہیں۔ واقعات کا بے کم و کاست اظہار کرتے ہیں مگر ان کی فطری اور طبعی ظرافت اور زندہ دلی اسی سادگی میں ہلاکی خوشی پیدا کر دیتی ہے وہ روروی میں ایک بات کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں مگر سننے والا ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے۔

کس قدر جرت خیز اور کتنا تعجب انگیز ہے۔ یہ امر کہ وہ کسی سے ناراض ہوتے ہیں اور اتنا ناراض ہوتے ہیں کہ خود ان کے بڑھاپے کے ہاتھ پاؤں کا پتہ نظر آتے ہیں چہرہ پر غیظ و غضب کے آثار ہیں۔ ہاتھ پر شکنیں ہوتی ہیں غصہ سے ہونٹ بل رہے ہیں زہر لب کچھ کہتے جاتے ہیں مگر سننے والا سمجھتا ہے کہ کچھ لوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور دل میں انسا پیدا ہو رہا ہے۔ اور ظرافت اگر صرف ظرافت ہو تو خیر کوئی بڑی بات نہیں مگر ان کے یہاں تو اسی میں اخلاق ہے۔ اسی میں بچ دلال کا اظہار ہے۔ اسی میں ان کی عادات فطری کے آثار ہیں۔ اسی میں جذباتِ مسرت ہیں اسی میں درد کا بیان ہے۔ اسی میں تاریخی واقعات ہیں اسی میں شہزادی کے حالات ہیں اسی میں تعلیم ہے اسی میں تلقین ہے۔ اسی میں شغف بزرگانہ کا لحاظ ہے۔ اسی میں مراسمِ دوستانہ کا ظہور ہے۔ وہیں خرد و مبالغہات کے دریا بہ رہے ہیں اور وہیں سرخرو نیاز و جھک رہے غرض کہ ان کے چند فقرے نہ صرف تعلق کا کام دیتے ہیں بلکہ ایک وسیع فضا پیش کر دیتے ہیں جہاں لطف و تفریح کے ساتھ جرت و بصیرت بھی سامنے آ جاتی ہے اور لوگ بھی جیسا کہ بیان ہو چکا اس رنگ کے گھسنے والے ہیں مگر وہ ظرافت جتنی جس سوچ کو لطف حاصل ہو وہ صرف مرزا کا حصہ ہے۔ عالمگیر کی تحریر میں بھی ایسا زاد اختصار کے ساتھ ظرافت کا عنصر غالب ہے مگر ان کی ظرافت میں ایک جاہ و جلال اور ایک نوع کا غصہ بھی شامل ہے مثلاً وہ محمد معظم شاہ کو لکھتے ہیں۔

”بصیرت فردوس منزلت برگزین دلالت بلخ و پرتان و خراسان ہرارت ملک قدیم مودنی تو بہ محفوظ داشتند و مکران و بلخ بادشاہی برکردگی مراد بخش بان موافقت تادہ شد چنانچہ اکثر آؤلایت قیام شد لیکن سبب کم و حلی آن نملوک بے طلب حضور رعایت آمد و ملاقاتی و اکابر اس یار پر دانت ملک تہمود از دست رفت و دخت و درضا گشت از نیابت گشت انداز پر ناطف و دختہ ستر نظر و اس قویہ کہ حاکم پر دتو اندر پر تمام کند۔ این فانی را از رد باقی است و تدبیر جزا یکدیگر تہود حضرت را با فوجی شاید و سالان بالست باستان

لمترتیم دیگر از چہ اید۔ باوجود تاکیدات حضرت شافعی و عارفانہ گفتہ آید۔ یا باں ہم چہ رسد۔ ظاہر کار از شافعیست۔ عارف بدود
بمعارف است۔ اس نمود ہے بدود و آفتاب مرکب است بدست آمد چہ دینا مدچہ شاکر خود کند۔ کہ دین با ہم چہ چنان چہ خود آید
نمودہ در انجا حضرت حق سبحانہ تعالیٰ حضرت اعلیٰ:

ضائع گشت تک مندرجہ بالا عبارات میں بہت خشکی ہے ازینماست سے عبارت میں گنتی شروع ہوتی ہے بطریاں توجیہ
جہات میں ایک تغین کے ساتھ ظرافت کا بہت ہلکا رنگ شروع ہوجاتا ہے۔ آگے چل کر حسن تنبیہ طریفانہ انداز میں ہے مگر ہر فقرہ سے غصہ ظہرین
بھی ظاہر ہوتا ہے۔ زیر و آفتاب۔ دیگر از ماچی آید۔ تا باں ہم چہ رسد۔ ظاہر کار از شافعیست۔ عارف بدود و آفتاب مرکب است بدست آمد چہ دینا مدچہ شاکر خود کند۔ کہ دین با ہم چہ چنان چہ خود آید
یہ سب فقرے تغین عبارت کے ساتھ بہت ملکی ظرافت اپنے ذیل میں لئے ہوئے ہیں مگر کئی اتنی ہے۔ کہ رنگ ظہر غالب ہر دو ظرافت مغفل
میکم سوزنی۔ اور سی جعفر زنی وغیرہ مرکب پہنچ کر رہ گئے۔ اس کے سوا اور کچھ ان کے یہاں نہیں ملتا البتہ سعدی کے ظریفانہ رنگ
میں ہر جگہ ظرافت محض کا غصہ غالب نظر آتا ہے۔ اور بہار کا کام دیتا ہے۔

اردو میں بھی بہت سے طریق ہیں مولانا اکبر آبادی مرحوم کو ایک خاص ملکہ ہے بگرد و باتیں ہیں ایک تو صرف نظم پر ان کی ظرافت
ختم ہوجاتی ہے۔ دوسرے ان کے کلام میں کوئی خاص ظرافت نہیں۔ بلکہ اس کا انحصار محض ایک خاص فرقہ کا خاکہ اڑانے اور ایک خاص
جماعت کی جو طبع کرنے پر ہے جس سے ایک تصویر دیکھنے والے کی نظر میں پھرجاتی ہے۔ اور اسی پر تمام لطف کا انحصار ہوتا ہے۔

برعکس اس کے مرزا ظفر احمد درویشوں میں ظرافت کے بادشاہ ہیں ان کا کوئی خطا یا سببے کا جس میں ظرافت نہ ہو مگر اردو رنگین
کی طرح بہت کو مزاحی رنگ پر غلبہ دیتے ہیں اور نہ صرف خال خالی کی طرح الفاظ کے گورکھ دھند سے کوہ جگہ ٹھوکر رکھتے ہیں۔ نہ اور سی سوزنی
جعفر شل کی طرح فواش پر اڑتے ہیں۔ نہ اگر کچھ کسی خاص طبقہ اور فرقہ کی طرف سے ظہار مقرر کرتے ہیں۔ اور ان سبب عیوب ظرافت سے
بچے رہنے کی خاص وجہیں ہیں۔ بہت سے بچے کا سبب یہ ہے کہ وہ دراصل فطری ظریف ہیں شاد و خرم ہنشاں لبشاش دل اپنے پہلو میں
رکھتے ہیں تبصیر اور کھوکھلاؤں کے یہاں نام بھی نہیں جوبل پر ہے۔ وہ ظاہر میں بھی ہے جو دل میں ہے وہ لب پر بھی ہے۔ برعکس اس کے عالمگیر
کے مزاج میں خشکی بھی ہے ظرافت بھی ہے۔ شاہی نکلت بھی ہے۔ ہر جگہ شاہن ملکوت کو بھی کام میں لایا جاتا ہے بقوی دھارت بھی اور سنگیر جی
ہے بطنی زندہ دلی بھی ان سب میں متوثر ہی بہت شامل ہوجاتی ہے

نعت خان خالی کی طرح الفاظ کے پیر میں وہ پڑنا نہیں چاہتے۔ مراعات النظر یا رعایت الفاظ سے انہیں ہر سے جو کچھ کہتے ہیں بہت
صاف کہتے ہیں مصلحت یا مصلحت کہ جب تک کہ کلام نہیں بناتے انہیں میں ہی نہیں آتا چنانچہ متعذر انداز سے جاساں اس کا ظہار بھی
کرتے ہیں۔

اور سی سوزنی کی طرح پیکر نہیں کہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی سوسائٹی بہت بلند ہے سوائے ایک دو جگہوں کے ان کے
یہاں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو کسی کے مرتبہ سے کم ہو۔ عالی مرتبہ لوگوں کی صحبت رہی۔ عالی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل
کی۔ ذوق سلیم اور صحیح مذاق لئے پھر ان کو ان باتوں سے نسبت ہی کیا ہو سکتی ہے۔

اُن کے زلفات کو دیکھتے اور اُن کے مکتوب الیم کو جانچے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ کہ وہ کس قدر مزاج دار اور فیض شناس فطرت واقع ہوئے ہیں بغیر غصہ و غضب کی حالت ہو کیفیت و مقرر ہو مزارع کا غلبہ ہو بیخ و غم ہو خوشی ہو مصیبت ہو عرض کچھ ہو یہ ممکن نہیں کہ اس قلم سے کوئی لفظ مکتوب الیم کی شان کے خلاف نکل جائے۔ اور وہ ایک ایسے دائرہ مزاج شناسی سے مراد جاتیں صرف ہی نہیں کہ مزاج کو ملحوظ رکھیں صرف ہی نہیں کہ کوئی لفظ نازیبا ضلالت محل استعمال نہ ہو۔ یہ بھی ہے کہ مکتوب الیم کی شان مزاج اور اخلاق و طبیعت پر بھی ہر فقرہ روشنی ڈالتا ہے۔ ادما ہمارے رنگ طبیعت بھی ظاہر کرتا ہے۔

”نہار“

اردو فارسی کی مشترک ترکیبیں

ایسی ترکیبیں بہت ہیں جو فارسی اور اردو میں مشترک ہیں۔ ان کو لوگ جب فارسی کی مخصوص ترکیب سمجھ بیٹھتے ہیں تو غلط بحث ہو جاتا ہے اور صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح سمجھنے لگتے ہیں اس لئے چند مشترک ترکیبیں جو زیادہ اہم ہیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

(الف) ایک ترکیب فارسی کی یہ ہے کہ در لفظ لے کر ملا دئے اور مرکب بن گیا مگر بھولنا نہ چاہئے کہ یہ ترکیب کچھ فارسی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اردو میں بھی یہی ترکیب موجود ہے۔ فارسی میں اگر جان اور گیتی خداوند خداوند اور شہر اور شہر لڑاوت منزل تاج محل فغان باغ کا فغان بیتیم ماہ وغیرہ ہیں تو اردو میں راج کمار بگت گدا، بالک ہٹ، تریا ہٹ، بھجی بھون، سکھ بھون، ہوتی بھیل، رام بھیل، بیتا بھیل، اندر بھیا، کسان بھیا، اٹا بھرا، چٹا بھرا، ورنش کھڑکی، بیل گاڑی، گھوڑا گاڑی، پیر گاڑی، چورنگی وغیرہ۔ اسی اردو ترکیب کی مدد سے یہ لفظ بنے جو بالکل صحیح ہیں۔

تو ماہ چشم، مکھو گدا، بگت استاد، بگت آشنا، پیر بھائی۔ استاد بھائی، پڑیا فغان، عجائب گھر، کٹھ بخت، کٹھ ملا، اسن بھیا، بٹو اک فغان، بھنگو فغان، چاند فغان، چیتتر منزل، کیس باغ، ہوا گاڑی، کھڑیچ، ماتھ جالاک، چور دروازہ، چور محل، مگن بیکہ (یعنی وہ مکہ جو کال کے نیچے لٹا جاتا ہے۔ ساڈنی سوار وغیرہ۔

”ہندوستانی“

روسی ادب

تم میڈم کوک تنہا ہی کے کید سے راستے پر چلو گے
 تقدیر کے کھسے سے بچنے کی کوئی صورت نہیں
 اے جانناں! درجہ کش مال ان کی قسمت پر مت دو
 انہیں شروع جوائی ہی سے یہ سمجھا دے۔
 ایک ایسا زمانہ بھی ہوتا ہے۔ پوری صدیوں کی صدیاں
 جب کانٹوں کے تاج سے تہادہ زیبیا اور پسندیدہ
 کوئی عزت نہیں ہوتی۔ ”اردو“

مال
 اس کا دل غم سے بھرا ہوا تھا۔
 اور جس وقت اس کے تین شوخ، درکھندہ رے پئے۔
 اس کے گرد کھیل رہے تھے۔ اور شور مچا رہے تھے۔
 وہ کسی خیال میں موقوفی وراس کے ہونٹ، بہتہ بہتہ کہہ
 رہے تھے۔
 بد نصیب بچہ تمام آخر کیوں پیدا ہوسے

تبصہ و آراء

مرزا جی اور دیگر مضامین۔ مصنف ایم اسلم صاحب حجم ۳۰۰ سے زائد صفحات۔ کاغذ کتابت اور طباعت محدود نہیں اور رکش ہے۔ سرورق نہایت خوبصورت رنگین اور تصویر دار ہے۔ اس قدر حسن استہام سے چھپی ہوئی کتابیں ہماری بان میں کم ہیں قیمت ۱۰۰ فیس کم ایک ڈولر لاہور سے طلب کیجئے۔

ایم اسلم صاحب ایک خوش بیان ادیب ہیں اس کتاب میں ان کے ۲۲ مختلف مضامین جمع ہیں جو مزاحیہ لغز میں لکھے گئے ہیں اور اسانوں کا لطف دیتے ہیں۔ فراغت کی گھڑیاں گزرنے کے لئے یہ کتاب تفریح کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور دور بے چارے نہیں نہیں کتاب جو ہر اردو دلبر و ری کے لئے باعث زینت ہو سکتی ہے بہت ارزان ہے ہم ناظرین ہمایوں سے اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں اسلم صاحب کی زبان سلیس اور رکش ہے اور اگرچہ محاورہ کے استعمال سے کھینچ پاگ نہیں مگر اس سے کتاب کے محاسن میں کمی نہیں آتی سلاست زبان محاکات اور لطف گفتگو ملاحظہ فرمائیے مس ماڈالین کی آمد کا ذکر ہے مرزا جی میرکلن سے مخاطب ہوتے ہیں۔

”میر صاحب کچھ سنا آئے ہیں؟“

”نہیں جانتی“

”تو بھڑ؟“

”ناچتی ہے اور وہ بھی بالکل برہنہ ہو کر۔“

میرکلن دیوار سے پٹھان سے بیٹھے تھے مرزا جی کی نظر گردن بڑھا کر کہا۔

”کھائیے تو ہمارے سر کی قسم۔“

”ہاں آپ کے سر کی قسم“ اور بھڑ چلے گئے۔

”اجی آنکھوں کے بل۔“

”بسیوں باتیں ہر در سنتے ہیں حالے آپ کیا پوچھتے ہیں“

”دلایت والی اس ماڈالین آئی ہیں۔“

”ہاں فرنگن ہے ناشنہ“ میرکلن منہ میں گھوری رکھے

بکری کی طرح جھٹکائی کرتے ہوئے ”شہر میں چرچا تو بہت سننے میں ہم بھی“

”اجی ہیں میر صاحب“ مرزا نے سر ہلا کر کہا ”ناشنہ نہیں

رتا ہے۔“

”مجھے میرکلن بٹیکہ کے پردوں کو سنوا دیتے ہوئے بولے تو

درگاہ پر قوالی کرتے آئی ہوگی یہ لوگ بھی پرپاری کہتے جانتے ہیں

”مواہ صاحب نے بلوایا ہوگا“

کارزار (مفت دار) حضرت ابوالخیر ضیاء جاندھری کی ادارت میں یہ پرچہ ماڈالین لاہور سے جاری ہوا ہے۔ اب تک ہماری نظر میں اس کے کسی نمونہ کے ہیں لیکن دلچسپ معلوم ہوتا ہے اور قابلیت سے ترتیب دیا جاتا ہے البتہ بعض محافلہ نہ صفائیں میں لکھ جو تک کی تیز اور لکھی ذرا محسوس ہوتی ہے۔ رسالے کے مقاصد حسبِ میل بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) تہذیب مفسر کے نقائص کی مخالفت اور مشرقی اخلاق حسنہ کی حمایت (۲) ملک کی تمدنی اور معاشرتی کمزوریوں کی حلیت (۳) ملک کی تعلیمی حالت پر تبصرہ (۴) راجہ انوت اور ہندوستانیوں پر ناز دہانے والے (۵) اجماعی تحریکوں اور علمی کام میں ڈھلا اٹھانے والوں اور مذہب پر سخرانے والوں کی مذمت (۶) مزدوروں اور کسانوں کی مدد و تحفظ صاحب کی نظمیں عموماً اس میں شائع ہوتی ہیں چندہ تین روپے نمونے کا پڑھ کر اور "ماڈل ٹائون لاہور سے طلب کیجئے۔"

معلومات شنگرف - یکم عبد المجید صاحب قلعی ایچ کی قابل قدر طبی تصنیف ہے اس میں شنگرف کے منغلک تمام قدیم و جدید علاج جمع کر دی گئی ہیں۔ پہلے پانچ شنگرف کے افعال خواص کا ذکر ہے باب دوم میں شنگرف کے مرکبات اور اس کا کثرت بنانے کے طریقے ہیں ماسوائے ان امراض کی فہرست دی گئی ہے جن میں شنگرف اور اس کے مرکبات وغیرہ مفید ہیں باب سوم میں کیمیائی علاج، چارم میں شنگرف کے متعلق صنعتی نسخجات و علاج میں طبیوں و عطاروں اور جڑوں کے لئے یہ کتاب انتہا مفید و عام شائقین بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں حجم ۲۵ صفحات قیمت ایک روپیہ کا پوٹو حلقہ ۲۹ لاہور سے منگوائیئے۔

ڈینش جسر ڈیا سکین - یہ بالوں کا تیل ہے جس کی ایک شیشی ڈنیز میں یو لو کے لئے آئی۔ یہ مرکب مختلف ادویہ کو تیل میں مل کر تیار کیا گیا ہے اور بالوں کو بڑھانے اور گرتے ہوئے بالوں کو بچانے کے لئے مفید ہے بالوں کو دیگر امراض کے لئے بھی اس کی غارش کی جاتی ہے قیمت فی بوتل (۱۳ ادس) دو روپے محصول ڈاک ۴ روپے

ریاض میکسیل اینڈ ریفریمری کمپنی۔ بیرون شیرانوالہ دروازہ۔ لاہور۔

مرزا غالب کے سوانح اور ان کا کلام

اس موضوع پر مشر محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس (پروفیسر) جو اس وقت آکسفورڈ میں مقیم ہیں ایک موطوعہ مقالہ لکھ رہے ہیں۔ وہ ہندوستانی ہمایوں ناظرین ہمایوں سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب قلم کی کوئی نایاب یا غیر مطبوعہ نظم یا خط وغیرہ حائزِ عنایت کر سکتے ہوں یا ایسے حوالہ جات دے سکتے ہوں جن سے غالب کی زندگی کا کام کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہو۔ تو وہ مقالہ نگار کو ممنون کرنے اور ایک خالص علمی خدمت بجا لانے کے لئے نذر فرمائیں غالب کے آئندہ معلوم کے علاوہ کسی نئے یا سب سے غیر معروف نفاذ کا اضافہ ضرور کسی چرچہ و مقالہ نگار کے لئے سوانح کلام غالب کی تصدیق و تحقیق کے کام میں باعثِ اعانت ہو سکرے کے ساتھ قبول کی جائے گی۔ جو صاحب اس کا بیڑ میں حصہ لینا چاہیں۔ وہ جائزٹ ایڈیٹر ہمایوں یا خود مقالہ نگار صاحب سے جن کا پتہ ذیل میں دیا جاتا ہے براہ راست خط و کتابت فرمائیں۔

مشر محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس (پروفیسر)

جیزس کالج آکسفورڈ (انگلستان)

ساگرہ نمبر کے متعلق آرا

ہمین ہمایوں کے دسویں سالگرہ نمبر کے متعلق بہت سی قابل قدر آراء موصول ہوئی ہیں جن کے محض ہم شکر یہ کے ساتھ وقفاً وقتاً بہاولاً میں شائع کرتے رہیں گے۔

آرٹیکل جسٹس سر شادی لال باقبا جیٹس ٹائیکوٹ پنجاہ

میں نے ہمایوں کے مطالعہ پر کچھ وقت صرف کیا اور رسالہ کو دلچسپ پایا۔

شادی لال لاہور ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء

محمد یعقوب (مجلس وضع قانون ہند)

میں نے ہمایوں کا سالگرہ نمبر بلا امتیاع پڑھا اس سلسلے کے دیگر نگینوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کان کی کوشش سے یہ پورا اپنی سادہ سادگی کے بلانے میں نہ صرف اوقات متفرقہ پر شائع ہونا بلکہ ابتدا سے وہ انوسٹانک تابوں اور بے غرضی کے پتوں مقررہ دیر سے خیال میں اس کی کامیابی کا لازماً حاکم میں پنہاں ہو رہا تھا۔ ظاہری شان کے ہندوستان میں شکل سے کوئی رسالہ ہمایوں سے بہتر ہے گا اس کے اکثر مضامین دلچسپ و پرانہ معلومات پر تھے ہیں بہت مجموعی ہمایوں ہندوستان کے بہترین رسالوں میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا

سالگرہ نمبر جن پر اہتمام سے شائع ہوا ہے اور مضامین نظم و نثر دلکش ہیں۔

محمد اقبال لاہور ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء

پروفیسر سر زا محمد سعید صاحب ایم اے۔ آئی۔ اے ایس

ہمایوں گلاس سالگرہ نمبر موصول ہوا رسالہ لو کے اس بہترین نمبر کے لئے دل شکر قبول فرمائیے۔ مجھے اکثر دور رسالوں کے خاص نمبر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اس لئے مقابلہ کرنے کا امکان موجود ہے۔ ہمایوں کی غالباً پہلی کوشش ہے لیکن ایک ہی قسم میں اپنے معاصرین پر بحث لے گیا ہے۔ مجھے کبھی بعض سائل تصاویر کا اہتمام کے لئے میں اور بعض نقد کے سلسلے میں مسعود تصاویر بھیج رہے ہیں لیکن اتم الحرف اب عمر کی اس منزل کو پہنچ گیا ہے۔ کلمہ ایسی تصویریں جن میں کوئی خاص غرض نہ ہو جائے لڑش کو معلوم ہونے کے لگاؤ اگر نہ ہوتی ہت ہمایوں کے پیش نظر میں بھی تصویریں ہیں لیکن اعتدال اور حقیقت کے ساتھ قدرتی ہونے والی اور دلچسپی کا مجموعہ ہے مضامین کی ترتیب مختصر و معین ہے۔ ہر ایک کا کافی ہر ایک پر ہے جس سے ادب کی تقریباً نصف کے قابل قدر نمونے موجود ہیں جن کی خوبی کے خود مضامین نگاروں کے سامنے آگئی فاسانی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ارباب ذوق آپ کے انتخاب کی داد دیں گے۔

محمد سعید۔ دہلی ۲۷ جنوری ۱۹۳۲ء

سر ادیب اللہ خان بیرسٹر ایٹ لا

اس سلسلے کو آپ نے متواتر خرچ اور محنت کے بعد ایک بلند پایہ پر پہنچا دیا ہے، مجھے جس قدر ادیبانہ و دستاویزی مساجدات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں سے یہ ہر طرح افضل و بہترین ہے۔ ہر جگہ روپے اعلیٰ ہے۔ دہلی دہلی رسالوں کے کی طرح بھی کم نہیں اعلیٰ دہے کے غنائی کے لوگوں کے لئے یہ رسالہ نہایت ہی دلچسپ و مفید ثابت ہو رہا ہے۔

جیرب اللہ لاہور ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین ہمایوں

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۲ء

تصاویر ایسکر رنجی خیل کا بادشاہ



نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	ہمایوں کے سالگرہ نمبر کے متعلق آرا		۳۵۳
۲	جہاں نما		۳۵۵
۳	چند دن جنگلوں میں	بشیر احمد	۳۵۶
۴	چاند اور سمندر (نظم)	حضرت مجاہد دہلوی	۳۵۷
۵	بیزاری	جناب مختصر حب صاحبہ	۳۵۶
۶	جبرکی شادی (ڈراما)	جناب منصور احمد صاحب	۳۵۸
۷	اتمام عشق (غزل)	حامد علی خاں	۳۹۴
۸	ارتقا	جناب شکر لطیف الرحمن صاحب بی اے ایل ایل بی	۳۹۵
۹	لاہور سے جالندھر تک (افسانہ)	زراہرود	۳۹۷
۱۰	اقوال	فلک پیم	۴۰۸
۱۱	غزل	حضرت آزاد انصاری مدظلہ	۴۰۹
۱۲	وہ (افسانہ)	پروفیسر سید فیاض محمود صاحب گیلانی ایم اے	۴۱۰
۱۳	محفل ادب		۴۱۵
۱۴	تبصرہ		۴۱۷

شکر رنجی۔ یہ لکھنؤ پرنٹرز کے متبول عام ممبروں کی بہترین تصاویر ہیں۔ اس صورت کی تصاویر کثرت سے مختلف النوع میں اس لحاظ سے کاتبین حیرت انگیز طور پر جامع اور محظوظ اکل بھجوا سکتا ہے جو وہ تصویر اس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ بکسیدہ لکھی کے حلال کا دورہ ختم ہونے کو ہے۔ اور ابھی صفائی ہو جائے گی لیکن ان خوش قسمتی کے کچھ بچ و ملان کے جذبات زیادہ دیر پائیں ہوتے۔

خیگل کا بادشاہ۔ خیگل کے بادشاہ کے سر کی یہ لاجواب تصویر جو خیگل کے چہرے کے بہترین مطالعہ کا نتیجہ ہے، روزانہ کے مرقع سے لی گئی ہے اور میاں بشیر احمد صاحب کے فنی مضمون کے ساتھ ناظرین کی دلچسپی کے لئے دوبارہ شائع کی جاتی ہے۔

ہمایوں کے سالگرہ نمبر کے متعلق آرا

آزہیل حبس سرشاہ محمد صاحب سلیمان ایم اے کینڈیج سٹریٹ لاجپٹ الہ آباد ہائیکورٹ
 "ہمایوں" کا سالانہ نمبر جو آپ نے مجھے ازراہ نوادرش بھیجا ہے موصول ہوا۔ اس کے مضامین کا معیار اعلیٰ درجے
 کا ہے۔ اور ظاہری محاسن کے اعتبار سے بھی یہ بہت بلند پایہ رسالہ ہے دعا ہے کہ ہمایوں ہر طرح کامیاب ہو۔
 آپ کا مخلص ایس۔ ایم سلیمان ۲۴ جنوری ۱۹۳۲ء

آزہیل میاں سرفضل حسین صاحب بلقاپور کرنل مجلس حکومت ہند
 مجھے "ہمایوں" کا سالگرہ نمبر کیپ ٹاؤن میں ملا۔ میں نے اسے پڑھا اور ہندوستان واپس آئے مجھے جہاں میں مندر
 ناپید، مٹ چکے اور بعض دوسرے دوستوں کو دکھایا مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ ہندوستانی مسائل کی
 دنیا میں "ہمایوں" بخوبی کس قدر بلند پایہ معیار پر پہنچ چکا ہے میں آپ کو اس محنت اور استقلال پر مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ
 نے ایک ایسے بزرگ کی نفیس یادگار قائم کی جس کو اگر موت مہلت دیتی تو وہ موجودہ ہندوستان کے کسی بھی دوسرے شخص سے
 زیادہ موثر اور کامیاب طریقہ پر ملک کی خدمات انجام دے سکتا۔

آپ کا مخلص فضل حسین نبی دہلی ۱۴ مارچ ۱۹۳۲ء

پنڈت شیونرائن صاحب شیم ایدہ دوکریٹ ہائیکورٹ پنجاب

"ہمایوں" کا سالانہ نمبر اس سال نہایت دلچسپ ہے۔ مجھے اپنے رفیق مرحوم سرشاہ دین صاحب کی
 دستخطی تحریر شہرِ حیدر آباد اور بعض اشعار پڑھ کر بہت مسرت ہوئی اور وہ زمانہ یاد آیا جب کہ ہم ایک دوسرے دست شاعر اور
 ادیب تھے۔ دنیوی منزلتیں ان کو بہت سی چھل ہوئیں۔ اور ہم دونوں ادبی مشاغل میں مگن رہتے تھے۔ اس سال کے
 سالنامہ نمبر کے میں جلد کر کے اپنے اردو کتب خانہ میں رکھوں گا بعض مضمون ایسے ہیں جو مستقل وقت رکھتے ہیں۔
 میرا مشورہ یہ ہے کہ سرورق کے لئے ہندوستان سے باہر جانے کی ضرورت کیا ہے۔ شالامار کا
 نظارہ یا تاج محل یا اور کوئی ہندی منظر کافی ہو سکتا ہے۔ کیا "پنجاب شہنشاہ ہمایوں" دیارِ ما "نوازش ہونا چاہئے

شیونرائن شیم ۲۴ جنوری ۱۹۳۲ء

ہماں نما

پر دے کے متعلق شہر بار دکن کا اعلان

گزشتہ مہینے اعلیٰ حضرت نظام دکن چند دنوں کے لئے لکھنؤ میں رونق افروز ہوئے تو اٹھائے قیام میں معائنہ کے لئے مسکمرل سکول لکھنؤ میں بھی تشریف لے گئے۔ امراء اعیان دولت کے علاوہ شہزادے اور شہزادیاں بھی حضور کی معیت میں تھیں سکول کی چھوٹی بچیوں نے اظہار عقیدت کے طور پر شہزادیوں کو گلہ تے نذر گزارے مجلس میں بہت سی سلمان خواتین بھی اعلیٰ حضرت اور شہزادیوں سے شرف بریابی حاصل کرنے کی تمنی نظر آتی تھیں سکول کی چھوٹی اور بڑی لڑکیوں نے اس امر کے پیش نظر کہ شہزادیاں بھی مجلس میں رونق افروز ہوں گی۔ عمر میں پہلی دفعہ پردہ ترک کیا اور اس غلط آئین میں لے متقابل ہوئیں۔ سرسید و برجس صدر مجلس منتظم نے اعلیٰ حضرت کا خیر مقدم کیا اور ایک مختصر سا پاس نامہ پڑھا۔

اعلیٰ حضرت نے پاس نامے کا جواب دیتے ہوئے سرورِ برجن کو اختیار دیا کہ حضور کی طرف سے اس امر کا اعلان کریں کہ حضور اس بات سے بہت متاثر ہوئے ہیں کہ لڑکیوں نے پہلی دفعہ ان کے اغراض میں پردہ ترک کیا ہے اور امید رکھتے ہیں کہ لڑکیاں دودمان آصفیہ کی پیش کردہ مثال سے پردہ ترک کرنے میں تقویت حاصل کریں گی اور ناقضائے وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس رسم کو کلینتہ ترک کر دیں گی۔

میسویں صدی کی ترقیاں

یقیناً کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ موجودہ صدی میں بہت سے قدیم عقائد جن کی عظمت قرن باقرن سے مستحقی بالکل مٹ چکے ہیں۔ اس موقع پر ایک اہم سوال اٹھتا ہے اور وہ یہ کہ کیا اس صدی نے پُرانے مسلمات کی جگہ کچھ نئے مسلمات بھی پیش کئے ہیں یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اکثر اصحابِ فہم و تدبیر نفی میں دیتے ہیں۔ ”درلدیونٹی میگزین“ کے ایک مقالہ نگار نے موجودہ دور میں ذہنی اور روحانی ترقیوں کے حصول پر مخالفانہ نقطہ خیال سے تبصرہ کیا ہے۔ میسویں صدی کے ربعِ اول میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے جن کی جدوجہد حیات کا قصہ متزلزل بنیادوں پر استوار ہو رہا ہے۔ عورتیں اور مرد مصروفِ عمل اور مگر کم کا رنر آتے ہیں مگر ہزاروں لوگ یہ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں کہ ان کی اس

سچی پر جوش کا مقصد کیا ہے۔ اور حاصل کیا ہے۔ ہر طرف لوگ مختلف النوع مصروفیتوں میں لگے ہوئے ہیں لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مصروفیتیں کسی خاص مصروفیت کی بھی ہیں یا نہیں اور کوئی مصروفیت کسی دوسری مصروفیت کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے۔ وہ تمام تصورات جو پہلے انسانی اعمال اور انسانی سرگرمیوں کے محرک اور مقصد و مقصد تھے اب فنا کر دیئے گئے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد در در بزرگ افزوں ہو رہی ہے جو نہایت صدق دل سے یہ سوال کرتے ہیں کہ دنیا جیسے کے قابل بھی ہے یا نہیں؟ آخر اس تمام جدوجہد کا کوئی خاص مقصد بھی ہے؟

والٹر پیپن نے اپنی کتاب مقدمہ اخلاق میں لکھا ہے کہ موجودہ زمانے میں انسان نے پرانے توہمات اور رسوم و عادات کی تو حاصل کرتی ہے لیکن کیا اس نے ان پر مشیدہ امراض کی کوئی دوا بھی تجویز کی ہے۔ جو آخر ان کمزور علاؤں کی طرف رجعت کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پرانے مسلمات اور پرانے خیالات کی تباہی سے بلاشبہ بل چل اور سنسنی پیدا ہو گئی ہے لیکن اب یہ تباہی لانے والے خود اُس سوار کی طرح نظر آتے ہیں جو زہر آلود و زہرناک برکتوں کے بعد مبتلا ہو کر مقصود سے بالکل بے ہوش ہو۔ امریکا کے پروفیسر پیرسن نے موجودہ صورت حال کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کل کے انسان نے صرف اتنا غور کرنے کی تکلیف کی ہے کہ پرانے مسلمات کے دلائل کی ظاہری اور کبھی صورت میں کیا ناقص ہیں۔ اس کی نگرہاں تک نہیں پہنچی کہ یہ مسلمات محض اس لئے کا عدم قرار دیئے جانے کے مستحق ہیں کہ ان کے اثبات کے پرانے دلائل ناقص یا غلط ہیں۔ آج کل کے لوگوں نے ان قدیم مسلمات کو نئے دلائل دہراہن کی کسوٹی پر نہیں پرکھا۔ حالانکہ آخری حکم لگانے سے قبل صحیح منطق اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ موجودہ انسان کے تدبیر کی پودا محض بڑی باتوں کے انکار تک پہنچی ہے۔ بڑی باتوں کے اقرار تک نہیں پہنچی۔

زندگی کے قدیم معیار پر کسی کو اعتبار نہیں رہا۔ اکثر لوگ وقتی فیصلوں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ مادیت عشرت پسندی کی طرف لے جا رہی ہے۔ انسان ہر قسم کی تجسسوں سے آزاد ہو رہا ہے، ایسے تشکیکین کی تعداد میں روز افزوں تر رہی ہو رہی ہے جو کسی قدیم اخلاقی معیار کو مسلمات میں سونپیں سمجھتے۔ بعض لوگ علمیت اور سبب و سبب توت کے نقشے کے رسیا ہیں۔ تو بعض لوگوں نے اخلاقیات پر جس اور فنون لطیفہ کو ترجیح دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ فلسفہ اخلاق کے ماہر اس فیصلہ کو غلط قرار دیتے ہیں بعض طبقات میں صبی ترقی اور مقابلہ کے جنون کا جوش آشوب عشرت کا نقیب بن رہا ہے۔

چند دن خنگلوں میں

خنگل، خنگل، دُور دُور تک، درخت ہی درخت، بچان، بچنے، بگھن، دار، دن، دھاڑے رات — درندے چند سے چند بڑے درندے، کسی شاعر کی طرح دھانٹے، چنگھاٹے، اکھاڑے، پھاڑے، ڈالے! — چند سے ۱۹۱۹ اور پرندے! (ہاں) اڑنے والے پھرے، بلکہ چنگے چھانے گھونسوں میں رہتے ہی سرو کھنڈے والے، خنگل ہاں دہی خنگل جس کے متعلق اسدا شعر غالب نے لکھا، جنوں جو مر گیا ہے تو خنگل اُداس ہے مگر چہرہ میں جہاں جنوں کا وطن تھا، خنگل نہیں ہونے اور اگر ہوتے ہیں تو ان میں درخت نہیں ہوتے۔ (تو پھر یہ کیسے خنگل ہوئے گا؟) ہندوستان میں جہاں خنگل ہوتے ہیں جنوں نہیں ہوتے۔ اور اگر ہوتے ہیں تو ان کے لئے کسی اور شاعر کو یہ مصرع لکھنا پڑے گا کہ ع

”بیلی جو مر گئی ہے تو جنوں کا بیہ ہے“

تو پھر یہ کیسے جنوں ہوتے؟ ہاں دہی خنگل جس کے متعلق جناب شمس العلماء مولانا سید امداد امام اثر نے اسی راقم کو تقریباً دس سال ہونے پہلے میں اپنے پوتے پوتی کی باہمی شادی پر اپنا یہ شعر سنایا تھا

صمرا صحران خنگل مارے مارے پھرتے ہیں آہو وحشی جان کے ہم کو سنا تھ ہمارے پھرتے ہیں

بلکہ اُسی روز انہوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا تمہارے اور تمہارے خسر کے لئے میں ایک ایسی دوا تجویز کرتے دیتا ہوں کہ تم لوگ کبھی بڑے ہی نہ ہو گے، مہیاں صاحب تو خیر خدا بخشنے ہمیشہ سے ایک ازلی جوان تھے جو ان بچے جو ان ہی رحلت فرما گئے، لیکن مجھے کوئی دوائی فوراً بڑھا ہو جانے سے روک لے تو جانوں، سید صاحب موصوف نے *Kali Phos* (کالی فوس) دوائی کھ دی میں نے اُمیدیں ڈالیں میں کلکتہ پہنچ کر اُسے حاصل کیا۔ دس سال بعد جو چند ہفتے ہوئے میں نے اپنی لگلا جینی دوا بیوں کی الماری صاف کرنے کو کھولی تو یقین ماننے کہ دہی باوفا، کالی فوس بیوں کی توں بند کی بند پڑی ہوئی دیکھی۔ اس پر میں نے اپنے صہیہ شیر دند پر سے پوچھا کہ بتا جے اب تو بڑھ چلا ہے یا جوان۔ میرے ایک عزیز جو اندریں دقت لغائی ہوئی دوا اس سب کا کوٹ میں سب جی کے عمدہ جمیدہ پر قبضہ فرمائے ہوئے ہیں اس کے گواہ ہیں۔ بریکٹ کے اندر لکھا جاتا ہے کہ انہوں نے ہمارے ایک مشترک رکنین کو نیم کیکم نیک طبع عزیز ماں ساگن دوا اکل شیخ پورہ کی دل دلدل سے نکلی ہوئی نصیحت کے مطابق اسی نیک بخت دوائی کا استعمال دو ماہ ہوئے بڑے شدہ مد سے اس طرح شروع کیا کہ کھانے کے بعد اور شادی کھانے سے پہلے بھی اپنے ہی دست و پوت لپٹ کر اکھیں بند کر لیتے اور نہ ہوں نہ ہاں کرتے اور یوں چپ چاپ طاقت حاصل کرتے جاتے سب جی صاحب نے بزدل فرمایا کہ اس کالی فوس نے مجھے بے انتہا فائدہ پہنچا دیا ہے تم اسے ساتھ کے کھیلے ہوئے اسے استعمال کرو۔ کہ یہ اعصاب کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے اور جہاں اب تمہیں بھوک کم لگتی ہے۔ اور تم کو

ہو جانے کی وجہ سے صوفی اور خدا رسیدہ ہو جاتے ہو وہاں اسے نکل کر انشا اللہ دو چار ہی سیکنڈ میں ہر ایک کو کھانڈوں پھاڑ دے گئے گا جو گئے۔ اس پر میں نے ان سے عرض کی کہ یا سب بچ دو عالم دس سال سے مجھے اس کاظم ہے۔ اور بارہ دس سال سے میں اس کے فوائد کی جزئیات کو اپنے دماغ میں جگہ دے رہا ہوں۔ (ہزاروں باتوں کا اسے بڑھنے والے مجھے علم رہا ہے جن پر عمل میں نے کبھی نہیں کیا پس اسے بھائی اسے تو کہہ ڈراسی فارسی بھی جانتا ہے۔ من نہ کروم شعاہدہ کنید۔) اس پر میں نے حضرت اثر (عظیم آبادی) والا سارا قید نہ کہہ سنا یا۔ سب بچ صاحب خوش ہوئے جوش میں آئے تو کلام انعام و اکرام دینے نصرت مانگے۔ میں نے سوچا بس غفلت کا زمانہ ہو چکا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہے۔ اب عمل کرنا شروع کر دو۔ مسٹر۔ کے پاس صحت کی خاطر جا ہی رہے ہیں بسم اللہ کر کے ایک باگی صحت کو بہتر بنانا شروع کر دو۔ قطع کلام معاف مگر محض خوشگوار حق اور افادہ عام کی غرض سے مطلع کیا جاتا ہے کہ عام انگریزی ڈاکٹروں کی آئے لو پاتھی کے غلات ایک خفیہ تحریک ہو سہو پاتھی مدت مدید سے دنیا کے مغرب میں کامیابی کے ساتھ جاری رہی ہے۔ اس سے ملتی جلتی اس کی ایک شاخ جیسے ہلکے کی بندھی چل ہے *Sichoussler's Twelve Tiesure Remedies* یعنی ششواں رصاحب کی بارہ ٹوسی دو ایم شی اس نظام حکومت کے مطابق انسان کے جسم میں کل دس نمک ہیں جہاں ان دسوں میں سے کسی ایک نمک کی کمی واقع ہوتی وہیں نور انسانی جسم کی کل کا کوئی پرزہ ڈھیلہ ہونے لگ گیا۔ یا اس کا دماغ پھر کی طرح پتھر کھانے لگا۔ یا دہرے سینکڑوں ڈاکروں کی بلا وجہ رسیدیں آئے لگیں اور یا وہی شاعروں کے تحت بگڑ والے بگڑے یا درود دل والے دل میں آفتخاں و اختلال و انفصال و انفال و زوال کی مسمیوں علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ تم بھی اسے ہم معنی و اپنی علالت کی علامات کا بظہر غائب و غائب کر دو اور دیکھ لو کہ کچھ ہوتا ہے اندر کون سے نمک کی کمی ہو گئی ہے پھر یہ بیماریوں کے پاس جو ایک پتہ لکھا ہوا ہے اس پتے پر ایک خط لکھ مارو وہی بی پارسل تمہارے نام چند ہی روز میں آدھ لکے کا نمبر۔ نمبر سدا کھاؤ (ٹیٹی گولیاں ہوتی ہیں) اور یوں نمک حلال بن کر بجائے منخوس دھرو د کے مضبوط و مربوط ہو جاؤ۔ واللہ عزیز و حکیم (ترجمہ لندہر ایک کا عزیز ہے) اور ہر ایک کا حکیم! میں بھی گھر سے نکلتے ہوئے اپنے عزیز کی ہدایات و نصائحات کے مطابق ان نمکات میں سے دو میں نمک *NaCl Phos* کالی فوس اور *NaCl Mur* کالی میور نے آیا پہلی اسے دوستو۔ اعصابی قوت کی دوا ہے۔ کوئی عصب غصب ہوتا تو اس نمک کے نصب کرنے پر قوت ملے کب صحت ہوتا ہے (دیکھو وزن القوانی حرف ب) دوسری بگڑ و معدہ کی شقاوت و بغاوت کا پھر بقول شمس سبہ کر کرتی ہے میں خشک کی سمت جب آیا (اس سمت روٹی کی تفصیل کے لئے مضمون بکا دوسرے حصہ ملاحظہ ہو) جب آیا تو ان مقوی ملکیات کو جذب کرنا شروع کر دیا اور سب بچ صاحب کو اطلاع دی کہ بھائی جان تم تم ایک عمر نیکی کرنے میں جسم و جان گھلاتے رہے نہ دنیا کی پوری مغرت ملی نہ ابھی تم جنت کی راحت نصیب ہوئی۔ اب کالی فوس! اور کالی فوس سے خدا نے پانا تو جسم و جان دل و دماغ و رزوح میں قوت و شجاعت و لبانت و شہامت دن و نئی رات پوگئی تیری کرنیں کی۔ یعنی کہ بہت آزمائشیں۔ اب ذرا برائی کو بھی آزمائیں کہ کیا بردوں کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو نیکیوں کا ہوتا ہے۔ (قارئین کرام صدمہ)

نام ہوں کہ صرف ایک خُجَل کے لفظ نے اتنی تقریر دہن پر کرائی۔ بس اب بخٹوری سی اور باتی ہے مثلاً یوں کہ:۔۔۔
 اے خُجَل! اے لو کہ تجھے دیکھ کر خدا سے غزویل کی قدریں یاد آتی ہیں! اے خُجَل! جس کے سایوں میں مجھ کر میں اُسے یاد
 کیا کرتا ہوں جس کا گھونٹلا میرے دل کے لیکر میں ہے۔ ارے او خُجَل جس میں منگل ہوتا ہے اور تمام وہ ان بھی جب انسان کو
 دیں نکال دیا گیا ہو اے خُجَل اے وغیرہ وغیرہ وغیرہ

یہ تو قلمی تنبیہ علم ادب کے اکھاڑے میں مضمون نویسی کی نشی کے لئے مصنف کی تیاری، آنا بعد۔۔۔۔۔ میرے ایک
 دوست ہیں (یعنی پہلے دوست تھے پھر عزیز بنے) اور چونکہ وہ نیک آدمی ہیں۔ اور اس لئے ایک ادبی مضمون میں ان کا پورا نام
 لینا نیک و ادب دونوں کے خلاف ہے لہذا آپ بھی اتنے پر ہی قناعت کر لیں کہ میرے ایک دوست ہیں امسٹرض مہموں کے
 موافق ان کی ایک بیوی ہے۔ انہیں کہتے ہیں بیگم اگر بفضل خدا پردہ دار ہوئیں تو ضب لکھنا پڑتا، ان سیاں اور ان بیگم کے
 دو بچے ہیں۔ دونوں لڑکے ایک کو کہتے ہیں زادہ نمبر (دوسرے کو ض زادہ نمبر) (عمر دھائی سال) ض زادہ نمبر کا نام
 جو خوب ٹٹ بٹ انگریزی بولتے ہیں خدا سے جبار اور اپنے پدر بزرگوار کے نام کا ہم وزن وہم فاویہ ہے لیکن بھرت پدر کی شاعری
 یہیں تک پہنچ کر ختم ہو گئی۔ کیونکہ ض زادہ نمبر کا نام محض لفظ مجبور کا ہم نوا ہے گو اس سے یہ نہ سمجھئے کہ وہ نئی کود داؤں سے کسی
 طرح کم خوفناک ہیں چنانچہ میرا بی کہ پہلے ہی روز مجھ سے دریافت فرمائے گئے کہ یہ کچھ کی (کمری) کون کی ہے؟ مطلب یہ تھا کہ
 گو بالفعل اس کمری پوٹم بیٹھے ہو مگر یہ ہے ہماری قبضہ و ملکیت کے اس فاروق اصغر کا نام میں نے اسی دن سے مشرکوں کی
 رکھ دیا امسٹرض جنگلات کے ایک خاص افسر ہیں اور اپنے کام کے ساتھ ساتھ اکثر مجھے بلادے بھیجتے رہتے ہیں۔ ڈیرہ دون،
 باندہ، بلی بھیت اور اکی بلدوانی غرض جہاں جہاں یہ گئے گو چند روز کے لئے سہی میں بھی ان کے ہاں جا دھمکا مگر تصدیق
 کر لیئے کہ یہ جا دھمکا۔ اور کم از کم یہ مدعو کیا گیا (اپنا کر کھڑے کیجئے) میں گواہ را میں ایک دیہاتی تھا لیکن اب اپنی موجودہ
 عمر کے ۵۰ حصے کو ایک شہر میں بسر کر کے اس لئے ایک نیم دیہاتی بھی نہیں کہ ان ۲۵ سالوں میں میرا دیہاتی دھن بھی ایک نیم
 شہر بن چکا ہے چنانچہ ان کل دہاں ایک نوا سیدہ بیوہ سبیل کی اکشن کا گرد و غبار اٹھ رہا ہے، لہذا آپ ہی اندازہ کر لیں۔
 اس وقت میں کتنے شہری ہوں اور کتنے دیہاتی۔ قصہ مختصر میں یہی جو کچھ بھی ہوں۔ ایک مکان میں رہنے اور بیٹھ رہنے کا اس
 قدر گروہوں کہ بس مکان جہند من جہند من محمد۔ اپنے شہر اپنی سڑک اپنے مکان اپنی ایک بیوی اپنے چار بچوں کو چھوڑ کر کہیں
 اور جانا نکلیں اور رہنا کسی اور سے بات نہ کرنا میرے لئے باعث صدا بھگت و موجب ہزار مشقت ہے لیکن کیا کیا جائے
 کسی کی کسی طرح کا کَلَفُ اللہ نفساً اکا دُستِ پادِ عمو ماعل نہیں ہوتا پر نہیں ہوتا اور یوں اس دفعہ میں اپنا ہونٹا کنبہ چھوڑنے
 پر مجبور و مجبوراً مسرور ہوا۔ تیرہ میں طبیعت محض ڈراما باغی ہوئی۔ کہ اُدھر غریبوں نے (ادھر خود ما بدلت لے اپنے آپ کو یزید گنا
 مشورہ دیا کہ چند دنوں جنگل کی ہو اٹھاؤ بدلت سے ان جنگلی افسر دوست کا بھی تقاضا تھا ان کے ساتھ یہ بہانہ کہ تمہارے

بریلی کو تو سب جانتے ہیں۔ اور جو نہیں جانتے انہیں جانتا چاہئے۔ کہ نویں جماعت میں Ganga Gauda, the Ganga Gauda کے گانجہ اٹے پانس بریلی کو لادنا نہیں بتایا اور لکھا گیا۔ بریلی اس طرف کو متقدم دنیا کی سرحد ہے پھر ۲۵ + ۶۲ میل پھاندا جاؤ تو نین تال مہذب مقام ہے۔ ان دونوں کے درمیان سب کچھ ایسے ویسے مقامات ہیں جہاں کم از کم لال کنوئیں کے حصے پہاڑوں تک التدمیاء کا جلوہ ہے۔ اور یاما شا اندر گیدڑوں اور بھیڑیوں اور شیروں اور لنگوروں کا اور شہر اور قصبے اور گاؤں جتنے اور جیسے بھی ہیں وہ جہاں تک میرا اور آپ کا خیال ہے۔ زیادہ تر اس لئے بنے ہیں کہ میرے دوست وہاں کے مستقل نگہبان ہوں اور میں ان کا عارضی مہمان، وہ سرکار کے جنگلی افسر ہوں اور میں آپ کا جنگلی مضمون نگار!

جاننا چاہئے کہ جتنے مقامات کو میں نے اوپر کے نقشے میں نقطوں کے اوپر بٹھایا ہے۔ وہ اس نقشے میں خاص اسکیل کے مطابق قائم کئے گئے ہیں۔ اسکیل! = مجھے ناپ کر دیکھ لیجئے کہ کہاں سے کہاں تک کتنا فاصلہ ہے کتنا نہیں ہے! یہ علاقہ جسے بھابر و ترائی کہتے ہیں۔ عام انگریزی علانے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ ایک قسم کی سرکاری ریاست ہے جس کا بہت سا حصہ پرانی دیہی ریاستوں کے سابقہ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس علاقے کو خام کہتے ہیں۔ یہاں خود سرکار زمیندار ہے۔ اور صرف بعض بعض حصے بندوبستی میں۔ دامن کوہ کا علاقہ جو نین تال کے پہاڑوں کے نیچے نیچے پھلا گیا ہے۔ بھابر کھلتا ہے۔ اس کے جنوب کی طرف ترائی ہے۔ یعنی وہ خطہ زمین جہاں پانی سطح کے قریب ہی دستیاب ہوتا ہے۔ بھابر و ترائی کا علاقہ لمبائی میں پہاڑ کے ساتھ ساتھ ۵۵ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی چوڑائی صرف سولہ ترہ میل ہے۔ ندیاں جو پہاڑوں سے آتی ہیں۔ سردیوں میں اکثر بھابر میں جذب ہو کر نیچے ترائی میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ دریائے کوئی رام نگر میں گم ہو کر آٹھ میل کے فاصلے پر جالابن کے قریب پھر سطح زمین پر نکل آتا ہے۔ بھابر کا حصہ سمندر کی سطح سے تقریباً ایک ہزار فٹ بلند ہے۔ بھابر کی آب دہوا کم از کم سردیوں میں صحت بخش ہوتی ہے۔ لیکن ترائی کی حالت دگرگوں ہے۔ اور وہ اپنے موسمی بنجار کے لئے دور دور تک مشہور ہے۔ لیکن خاطر جمع رکھیے مضمون صرف بھابر سے تعلق رکھتا ہے۔

اب ایک نئی طرح تاریخ پر ایک نظر ہو جائے۔ یہاں اس امر کا اعتراف و بیان ضروری ہے۔ کہ تاریخی نقطہ نگاہ سے جو کچھ بھی عرض کیا جائے گا۔ اس کی محض حیثیت ہے کہ جو کچھ کسی جیلے مانس سے بات حیرت میں معلوم ہوا وہ نوٹ کر لیا۔ تفرج اور فراغت کے دن ہیں۔ کون یہ صیبت اپنے سر لے۔ کہ ایک ٹوئنگل کے متعلق تو یہ بھی مضمون کیجئے اور دوسرے گلے زمین کو کھود کھود کر پانے مردے اکھاڑنے۔ اتنا مگر ہوتا ہے۔ تو بنگل کو کیوں آتے شہر میں بیٹھے بیٹھے محمد حسین آزاد نہ بن جاتے؛ قصہ یہ ہے کہ دو چار روز ہوئے مجھے بتایا گیا کہ مسلمان بادشاہوں کے وقت میں یہ علاقہ ایک سرکاری شکار گاہ تھا اور انہیں ہمارے بھیڑیوں اور شیروں کے بادشاہان ان بنگلوں میں تیغ اسلام کے سایہ میں امن کی زندگی بسر کرتے تھے چنانچہ اسی حصہ ملک میں ایک مقام ہے (ہلدوانی سے مشرق کی طرف جہاں میں نہیں گیا۔ سو دروغ بگروں رادی) اسیے نامک تھا کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بابا ناٹک سکھ مت کے بانی وہاں آئے تھے۔ انہوں نے یہاں اگر جب اپنے ڈیرے جلائے

تو ایک ہندو گرو گورو رکھ نامت نامی نے اُن کا مقابلہ کیا۔ اور عناصر کے ساتھ سازش کر کے اس زور سے آندھی چلا دی۔ کہ جس پڑ کے نیچے بابا نانک تشریف رکھتے تھے۔ وہ جڑ سے اکھڑ کر ان پر گرے لگا۔ لیکن ادھر بھی خدا کا نفع شامل حال تھا۔ انہوں نے کہا کہ گرو جاجا راہماں تھا وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ چنانچہ جا کے دیکھ لو (میں نے جا کر نہیں دیکھا) کہ ابھی تک اس کی بعض جڑیں زمین کے اوپر ملدا رہی ہیں۔ پھر ہندو جادوگر نے کھانے پینے کی سب چیزیں برباد کر گرا دیں۔ چنانچہ یہاں کے کنوئیں کا پانی بھی نکھادیا۔ مگر اس کا انتظام بھی اُدھر سے خاطر خواہ طور پر ہو گیا۔ پھر جب نانک جی قریب کے پہاڑوں کی طرف گئے اور ان کے چیلوں کو سخت جھوک لگی۔ تو اتفاق سے کہیں ریتھنے کا درخت پاس تھا۔ نانک جی کی دعا سے اس کی ایک شاخ کے پیٹھے کڑوے سے پیٹھے ہو گئے۔ اور اب تک پیٹھے چلے آتے ہیں جیلے آنا فنا درخت پر چڑھ گئے۔ اور خوب کھانے کھلانے لگے۔ دوسرے روز جوان لوگوں کی نیت بدی توجہ میں سما یا کہ کچھ دوسرے دن کے واسطے بھی لے چلیں۔ لیکن یہ پتہ نہ تھا کہ خدا نے زمان صرف حال کی کفایت کرتا ہے مستقبل کے لئے بے ضرورت کھتے نہیں بھر دیتا۔ اب کی جو درخت پر چڑھے۔ تو دوسری شاخ کے پھل کو معمول کے موافق کڑوا یا چنانچہ جا کے اسے بھی چکھ لو اُسے بھی۔ (میں نے جا کر نہیں چکھا۔ مگر دروغ برگردن مسٹر ض جنہوں نے پرسوں اپنے مکس میں سے وہ پیٹے رکھے نکال کر مجھے کھانے کو دئے۔ پہلا دیکھا تو کچھ کڑوا ہی تھا لیکن دوسرے پر جب مسٹر ض نے ٹھوڑا سا کھا کر اصرار کیا کہ یہ یقیناً میٹھا ہے۔ تو میں نے بھی میٹھا ہی پایا ہو گا۔ کھوڑا آمنا صدقنا کہہ دیا) اس مقام پر ایک گورو دارہ ہے جس پر ایک مننت صاحب قابض ہیں۔ اس وقت اس کے ساتھ تقریباً سولہ ہزار بیگہ زمین وقف ہے اور مننت صاحب کی بسراوقات اس پر موقوف ہے۔ مسلمانوں نے ایک زمانہ میں کل چوراسی ہزار بیگہ اراضی اس گورو دارہ کے لئے مرحمت کی تھی۔ اور یہ گورو دارہ بھی انہیں کا تعمیر کردہ ہے۔

اس حصہ ملک میں جو چند شہر یا قصبے ہیں وہ دراصل منگلیاں ہیں جہاں زیادہ تر سردیوں میں کاروبار ہوتا ہے۔ بظاہر یہ شہر قصبے زیادہ متمول یا مہذب معلوم نہیں ہوتے۔ مگر ابھی آج کے اخبار میں دیکھا کہ ۲۷ فروری کو ہلدوانی میں ستا کا گھری عورتیں گرفتار ہوئیں۔ خانہ بدوش پہاڑی لوگ سردیوں میں پہاڑوں سے اتر آتے ہیں۔ اور گرمی ہوتے پھر سرکار انگریزی کی طرح پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ اسماں پہاڑوں پر کم بخت باری ہونے کی وجہ سے میں نے انہیں رام نگر کی طرف پرکھا کر گویا ایک قوم کی قوم نقل مکانی کر رہی ہے۔ سامان کچھ سیل گاڑیوں میں کچھ مردوں کی بغل میں کچھ عورتوں کے سر پر (ان کی عورتیں ان کے مردوں سے زیادہ جفاکش ہوتی ہیں) اور گوز میں مرد بچے کہیں اکٹھے کہیں آگے پیچھے اس طرح چلے جاتے ہیں گویا جرمین قوم نے ٹیمپر پر حملہ کیا۔ اور ٹیمپر والے اپنا سب مال متاع اٹھائے جا رہے ہیں۔ اور جہاں رات ہوتی ہے ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔

اس علاقے کا بہت سا حصہ جنگل ہے اور جنگل ہی ہے اس کی آمدنی کا پیش تر حصہ حاصل ہوتا ہے۔ اور وہیوں کہ جنگل کو مختلف خطوں میں تقسیم کر کے ایک خاص جنس کے درختوں کو نیکام کر دیا جاتا ہے۔ البتہ گرد و لواج کے دیہاتیوں کو

اپنے حکامات کے لئے اور اندھن وغیرہ کے لئے لکڑی لے جانے اور جنگل میں اپنے مولشی چرانے کا حق بھی حاصل ہوتا ہے بالعموم ان جنگلوں سے دو ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ وصول ہوتا ہے۔ اگرچہ گزشتہ سال کسی حکمت سے سرکاری افسر نے ساڑھے پانچ لاکھ روپے سمیٹ لئے۔ اب معاشی سردبازاری کے باعث اور قبول بعض نمک خوار ٹھیکیداروں کے کانگریسی تحریک کی وجہ سے انجاس کی قیمتیں بہت گر گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل سنسان جنگلوں میں بھی سیاسی شہروں کی طرح مائے گئے گئے کا شور مچا رہا ہے۔

ان جنگلوں میں سال اور گھیر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ لال کوئیں کے ٹیشن کے قریب ایک نیم انگریز نے لکڑی کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول رکھا ہے۔ اس میں سال کی لکڑی سے جرس کول کے ذریعے سے بڑے چھوٹے تختے بنائے جاتے ہیں اور مختلف کمپنوں اور دکانوں کو سہاگے جاتے ہیں۔ کارخانے میں نوے ہزار کامریہ لگایا گیا ہے اور چند کچھ دارفید لوگ اس سے ہزاروں روپے سال کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس کے مقابل میں ہم کالے لوگوں کا ایک کارخانہ ملاحظہ ہو گا لاٹھوگی کے قریب جنگل میں ایک جگہ بہت سے دیگچے چوٹوں پر چڑھے ہوئے نظر پڑے۔ میرے دوست نے کہا: "اؤ ہمارے دیسی صنعت کا ایک نمونہ دیکھو۔ چند ٹوٹی چھوٹی چھوٹی پٹریاں تھیں کچھ پٹری مرد اور بہت سی پٹری عورتیں باہر کھڑی ہوئی بڑے بڑے چوٹوں پر دیگچے چڑھائے کچھ ابال رہی تھیں۔ کبیر کے درخت کو چکر چھوٹے چھوٹے ٹراش کر انہیں پانی میں ڈال کر بالا جاتا ہے پھر یہ رنگدار پانی چھانا جاتا ہے اور الگ ایک گھر میں سے انڈیل دیا جاتا ہے۔ وہ جگہ کہتے ہیں جانا ہے اور یہ کھانا پانی استعمال ہوتا ہے میں نے دیکھ کر چلنے ہوئے کہا: سن لو کھانا ہماری ساری پٹریاں عورتیں کھانا ہمدنی کھانا ہمدی کہہ کر سنیں پڑیں۔ اور ہم صاحب لوگ بن کر رخصت ہو گئے کہ ہمارا فرض ادا ہو گیا۔"

ہندوستان کے جنگلوں میں حکومت کی طرف سے ٹھیکیداروں کو درخت کے درخت نیلام میں فروخت کر دئے جاتے ہیں۔ کٹائی چرائی کے بعد وہ کارخانہ داروں اور شوک فروشوں کے ہاتھ لے لیا مال فروخت کرتے ہیں پھر وہاں سے لکڑی مختلف طرح بکتی ہے لیکن مشرطن نے بتایا کہ یوپی میں حکومتیں اپنے جنگلوں میں سب کام خود کر کے دوکان داروں کی طرح نفع اٹھاتی ہیں کلبیں کارخانے جنگلوں میں قائم ہیں طلب کے مطابق سامان رسد سے اشیاء تیار کی جاتی ہیں اور فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

ہاں اپنے طریقہ میں ہماری سرکاری بڑی جزدس واقع ہوئی ہے چنانچہ میرے مشرطن نے اپنے علاقہ کے ایک حصے میں سونے کا ٹھیکہ میں روپیہ سالانہ کو دیا ہے سونا بسونا بسنہری سونا اٹھیکیدار صاحب ندی کے خشک پاٹ کی بیت کو ملے لے کر چھانتے چھناتے ہیں۔ اور سونے کے اتنے ذرے جمع کر لیتے ہیں کہ اُس کے لئے بیس روپے سالانہ کی رقم پیشی لٹا دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

اب قبل اس کے کہ آپ کو مشرطن کی موٹریں بٹھاؤں اور پھر جنگل کی طرف لے چلوں۔ ذرا اس علاقے پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ ہلدوانی سے لال کنواں پھر نیپتی تال اور پھر دور سے پر مشرطن کے ساتھ ساتھ گا لاٹھوگی سے کوڑ، کوٹ سے پاول گڑھ،

پاؤں گڑھ سے چھوٹی اور چھوٹی سے رام نگر دیکھتے پھر سے نقشے کو، یہاں سے دہاں دہاں سے دہاں دہاں سے دہاں، یوں گئے ہمایوں گھوئے یوں بھاگ ڈرکی ہم نے؛

سردیوں کا آخری زمانہ، خود سی کا اخیر سانسے تیلی لکے ادنیٰ پہاڑ اُن کے نیچے گویاں کی آغوش میں پہاڑیاں جن کی جنوبی گھاٹیاں سبز سرخ درختوں کے گنگا جمنی بلوس سے مزین، پھر کہیں ذرا چڑھائی کہیں ذرا انزائی کشیدہ و فزائی اکٹھے چوٹی پھر ادھر پہاڑیوں سے آبشار کا گرنا اور ادھر وادوں میں پانی کا نہر بن کر بہہ بھگنا، ادھر کنبو کے خزاں دیدہ درختوں کی بہاں ادھر خشک ندیوں کے پاٹ کی چمک یمن حسن اپنے زوال میں بھی دل رادھاں افزا کبھی شمس کی یا نازہ ہو تی تھی کبھی سورت ان کی ہوسم ایسا کہ سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نکل اور اوشیا بھی اسی طرح بس نہ زیادہ بہت نہ کہ پہاڑوں کی جگہ پہاڑیاں دریاؤں کی جگہ ندیاں، چڑھائی میں تھوڑا چڑھاؤ۔ انزائی میں تھوڑا اتار، غرض پہاڑی علاقے میں میدان کی سی وسعت یا یوں کہئے کہ میدانوں میں پائی سی عظمت، بلندی دہپتی کی ایک خوش منظر آرمگاہ!

جنگلوں کی یہ کیفیت ہے کہ کہیں ٹوکوسوں تک نجان جنگل چلا جاتا ہے۔ ماسوا اس کے کہیں کہیں چرائی کٹائی کے نشانات نظر آتے ہیں اور کہیں یہ حالت ہے کہ جنگل کے بیچ میں کھلے میدان اور پھر درختوں کے جھنڈ آ جاتے ہیں۔ ان بھی روشن جگہوں کو جنگل کی زبان میں چوڑا دریا پندر کہتے ہیں۔ اور ان کا ایک گہری ہوئی جگہوں کو بوجھی یا بکھیا۔ اور اگر دماں کچھ پانی بھی ہو تو کچھ ایشیا پتھر میرانیس کا مسرے بے جنگل کے شیر گرج ہے کھٹے کھائیں اس علاقے میں نہریں اور آبجوتیں کثرت سے ہیں یہاں تک کہ سردی کے موسم میں چھوٹی چھوٹی پتھر سنگیں نہریں ہی ہیں جن سے کھیتوں کی آبپاشی ہوتی ہے۔ ان کی تہ پتھر کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے ان کی چوڑائی بالعموم دو چار گز زیادہ سے زیادہ دس گز ہوتی ہے اور ان کی گرائی صرف دو چار فٹ۔ پانی خوب صاف شفاف اور ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا ہے۔ اور نہایت تیزی سے بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔

نور کے ترکے ان ادنیٰ نیچے کھیتوں کی سیر جھٹھٹا ہوتے یا تاروں کی چھاؤں میں جنگل کی فضا ایسی فرحت بخش ہوتی ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے ہنڈ انسان بھی اپنے علم و فضل کو بھول کر فطری زندگی کا لطف اٹھانے لگتا ہے۔

اس غفلت کے خواب سے مجھے سرطش کی موٹر نے جگا دیا۔ آخر اس علاقے میں میں آسمان پر سے تو نازل ہوا نہ تھا یہاں میں بلد وانی آیا۔ پھر جو صاحب جنگل کے تحت جنگلوں میں دو در دو زنجیں بنگیے پھیلے پڑے تھے۔ ان میں ایک دن یہاں دو در دو ٹھمرا ہوا سارے شمالی علاقے کی بیکرنا چلا اور یہیر موٹر اور ہاتھیوں اور اونٹوں اور ملازموں اور فیلیاؤں اور ساربانوں کے دیسے سے ہوئی کبھی ہر دو گز کبھی ہر دو گز کے رز یہ پڑنا کہ۔۔۔ ہوتا ہے جادہ پیا مو کار و اں ہمارا موٹر مندر کرۃ العدر نے مجھے کو بکر بکر کیا۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ اس جنگلی علاقے میں جو پورے ایک سو چودہ میل ہم اس موٹر میں گھوئے تو گھوئے کب خوب پٹکے گئے۔ پٹکیں اکثر ایسی کہ موٹر میں مُردے بھی ہوں تو مٹور پھینکنے سے پہلے ہوش میں آجاتا ہیں، کبھی ہمارے سر کی مکر موٹر کی چھت سے کبھی ہم آپس میں دھکم دھکا، غرض کہ ایک اچھا خاصہ صفت کا سینما کہیں جنگلی رستوں پر کہیں خشک ندیوں کے پتھر پٹے

کے پارک میں گھاٹیوں میں یکہیں چٹانوں پر کہیں ہرک ایک طرف کو ادبھی اور دوسری طرف اتنی بچی کہ دایاں پہرہ زمین سے اٹھنے کو تیار اور دل دھڑکے کہ بس ابھی گرے ابھی گرے کہ اتنے میں مسٹر جس کے بے باک، اشاروں پر موٹر جاوہ جاہم بھی خوش وہ بھی نہیں دیکھ کر خوش لیکن پھر وہی کم نکتہ شکر کیچھانہ چھوڑتی تھی یعنی وہی جھٹ پٹ پٹ پٹ پٹ پٹ پٹ پٹ کی آواز اور ایک نکتہ گزرتا رہے یہ کیا آفت آگئی۔ ان جو ہونا تھا سو آخر ہو ہی گیا جنگل کی سڑک غصے سے بن کھا رہی تھی کہ یہ کالے لوگ کہاں مجھ پر سوار چلے جاتے ہیں، ایک جگہ موٹر جوڑے تو سڑک بچ سے ادبھی اور دونوں طرف گھمے پڑے ہوئے موٹر وہیں اٹک کر رہ گئی۔ اب لاکھ عین کردہ تھو مسٹر مرض پڑانے لگا تھے جی میں مسکرائے مگر ذرا دل ہملانے کو کہنے لگے اب کیا بنے گا، میرے ہوائیاں چھوٹ گئیں۔ دوردیشنگل نہ آدم نہ آدم زاد، بس ایک مسٹر مرض اور ان کا کبنا اور صمیمی کے طور پر میں۔ موٹر میں سے ہم اترے اتارے گئے، گدے کے نیچے سے طرح طرح کے اوزار اٹھنے جن سے سپوں کو ادبھی کابا۔ شکر کوبھاڑے سے تراشا، بڑن اتفاق سے کچھ ہٹاڑی عورتیں جنگل میں دو نظر پڑیں انہیں بلایا اور کہا کہ ذرا اپنی درانی سے ہٹ کر کسی گھاس کا ٹکڑا کر ہم کو دو۔ وہ سنستی سنستی گھاس کا مٹی تھیں اور ص زیادہ نمرا اور میں اُسے سڑک کی گڑھیں، لیکن میں بھرتے جاتے تھے کہ پیچھے ذرا اونچے کئے جائیں۔ اُدھر یہ کام ہو رہا تھا اور ص بیگم نے ایک بھتیجی کہی کہ اور کچھ نہیں تو بٹ کے مضمون کے لئے تو کچھ مصالحہ تیار ہو گیا۔ اس سے ہم خوش ہو گئے اور اللہ میاں کی حکمت پر ایک نعت اور سب اللہ لمن حمد کہنے لگے غرض خدا خدا کے شرک تیار ہوئی پھر لگے شہری مرد اور جنگی عورتیں موٹر کو پیچھے سے دھکیلنے والے تو قوروی سی ملی۔ جان میں جان آگئی۔ بار خدا یا تیری عنایات بھی کیسی ہیں کہ اتنے میں پھر یہ پھنس گیا۔ یا اہلی خیر، تھوڑا سا پھر تراشا اور پھر دھکیلا۔ موٹر چل نکلی۔ سبحان اللہ آج یقین آگیا کہ خدا ایک ہے اور میں اس کا بندہ ہوں پھر فر فر پڑنے جنگل کی طرف اور دھک سے جا ٹھہرے!

ان مزید اذیتوں کے علاوہ سڑکوں پر چلتے ہوئے موٹر کی دھک دھک اور بھٹ بھٹ سے جو افراتفری پھارے بے قصور مولتیوں کو پڑ جاتی تھی۔ وہ دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ بالخصوص پھڑپھڑ پھٹ پھٹ کی ایک دڑ جس کا باعث ہم تھے حضور و اسرارے کی گھوڑے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس پھٹا دڑ میں دڑنے والے اور دایاں اپنی دم دبا کر نہیں اٹھا کر ایسی بستی پڑا دڑیں کہ یہ واقعہ انسانی ملاحظات کی تاریخ میں ہمیشہ گرو آلود عروں سے لکھا جائے گا سب سے بے وقوف جانور زبا کر دہ سڑک پر سب سے زیادہ دد رنگ ہمارے آگے آگے اور پھر ہمارے ساتھ ساتھ بھاگتے تھے مجھے دیکھ کر خیال آیا کہ شاید اسی طرح نمذیب کی شاہراہ پر ترقی کی دڑ میں سب سے تیز وہی دڑ رہے ہوں جو سب سے زیادہ بے وقوف اور جاہل ملحق ہوں کیا عجب ہے کہ اسی طرح کوئی ہم سے زیادہ قومی اور فیم اور فرب کا ثقافت اپنی دھک دھک اور بھٹ پھٹ سے ہیں بھگا بھگا کر اپنی زندگی کے لئے سامان افریج پیدا کر رہی ہو لیکن اس طاقت کو اکا کہ ہو جانا چاہئے کہ جس سے ہم نے دھک پھٹا دڑ دیکھی ہے ہمارے دل میں اُس طاقت کی چالوں کے متعلق سخت شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ اور وہ دن دُور نہیں جب ہم اپنے

آپ سے ادراکانات سے تنگ اگر اس کی دھندلگی کی راہیں سدا رہ ہو جائیں گے کہ بلا سے ہم لوہان ہو جائیں لیکن اس کو بھی اس مذاق کا (معاذ اللہ) کچھ مزا دکھادیں !

جو کام شروں پر مڑ کر رکھنا وہ جنگلوں میں باقی کا ڈار پایا۔ باقی کو جنگل کا سسٹم در (مڑک کوٹنے والا انجن) کہتے تھے جو جھامتا اپنے بعد سے پن میں شاندار۔ یہ جانور نہایت زبردست اور دوہین ہے جنگل میں جہاں جھار جھنگل ہو وہاں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ لیکن قدم جب ایک بار رکھ دیتا ہے۔ تو پھر پیچھے کو نہیں ہٹا تا جو کچھ پاؤں تلے آئے اسے زندہ ڈالتا ہے جو کچھ سامنے آجائے۔ اُسے مکر مار کر توڑ دیتا ہے۔ اور چاہے تو اچھے خاصے بیڑوں کو چرے اٹھ کر رکھ دیتا ہے۔ باقی فی الحقیقت جنگل کا انجینیر ہے۔ رستہ ڈھونڈتا ہے رستہ صاف کرتا ہے رستہ بناتا ہے۔ انجن ڈرائیو انجن ریل گاڑی سب کچھ یہی ہے تپ آپ پر بیٹھے رہے۔ یہ اپنا کام کرتا چلا جائے گا۔ خیر ایک سہارا تو گر دن پر بیٹھا ہو تو نیل (مٹھ پن) بیٹھ ڈم اور بالخصوص دھت دھت (مٹھ بہٹ) بری بری (مٹ کر) سے قواعد اردو کی بھولی ہوئی بات مزہ ہو جاتی کا لاڈلہنگی کا جنگل قابل دید ہے۔ بڑے درختوں کی شان، چھوٹے درختوں کی نزاکت، خوبصورت جھاریاں کہیں کہیں گھاٹیاں۔ بس جی چاہتا تھا کہ زندگی کے کچھ دن ہمیں بے فکر ہو کر کاٹے لیکن عربی، فارسی، والی فکر نے بہت جلد اردو کی فکر پیدا کر دی۔ چیزوں سے لطف اٹھانے کی صلاحیت اس عاصی و اھتر نہیں مضمون نویس میں اس درجے تک مغفود ہو چکی ہے کہ ذرا لطف آیا اور وہیں معاً یہ خیال بھی دل میں چھکیا لینے لگا کہ اس لطف کے نو سے ایک لطیف مضمون لکھ دو۔ واہ ہم بھی لکھنے والوں کے لئے ایک دیکش موضوع بنے جاتے ہیں ایک معاصر لیکن ایک بہت جلد مل ہو جائے والا معما۔

جنگل کی سیر کر رہا تھا، مضر ساقہ تھے سال کے درخت سروہی کی طرح کوسوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس خیال سے کہ شاید اس کی ٹہنیاں گھونٹ کر پنی لینے سے قلعہ بنا ہو جائے مجھ پلٹ قندے اس درخت میں دلچسپی لینے شروع کر دی۔ ہلدو، سال سہیل، کچو، بالکی، کھیر، روہنی، املتا، سہل، رتی، چنبیلی یہ ہے میرا پہلا سبق اور اسی سبق کی تصویروں سے ان جنگلوں کی لاکھوں جلدوں والی کتاب آراستہ پراسنہ ہے، ہلدو، سال سہیل شاندار درخت ہیں ان کو دیکھ کر کشمیر کے دیوار اور سفیدہ یاد آئے لیکن یہاں دیکھنے میں نہ آئے۔ ہلدو بس طرح اپنی اڈچانی میں اسی طرح اپنے پھیلاؤ میں بھی ایک شاندار درخت ہوتا ہے لیکن اس کی لکڑی صرف چھتوں کے اندر دفنی حصے کے لئے کام آتی ہے سال کا پھیلاؤ بہت کم ہوتا ہے سیالک سیدھا اڈچا خوبصورت درخت ہے جو ہندوستان کے قیمتی درختوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ جہاں اُسگے وہاں صرف اپنوں کی موجودگی کو روا رکھتا ہے۔ غیروں کو اکثر پاس نہیں پھینکے دیتا جہاں سال ہوں وہاں عموماً سال ہی سال ہونے میں اپنی قبیضہ والوں کا بے حد جانب دار ہے لیکن قبیلے والوں میں بھی پھوٹ پڑتے دیر نہیں لگتی۔ زندگی کا نام ہے جہد ملبغا جہاں بہت سے سال ہوئے وہ لگے ایک دوسرے کو دھکیلنے اور کھینچنے نتیجہ دی جو ہر جگہ ہوتا ہے۔

کرفی کمزوروں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دزان کی بھی باری آجاتی ہے مگر وہ روز بعض اوقات عمر زوح کے بعد آتا ہے۔ کیونکہ اگر کسی ماتمی کے محلے یا کسی ٹھیکیدار کے کھانا ڈسے سے بچ رہے تو سال عموماً تین تین سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ بلکہ اس کی امکانی عمر اس سے دو گنی تک ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ پھر سے کھانا بنتا ہے۔ یہ ایک قسم کا کیکر ہے اور اس کی شکل و صورت کیکر سے بہت ملتی جلتی ہے۔ دہائی یہاں بکثرت دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کی شناخت بآسانی اس کے لال لال ہری کی طرح کے پھل سے ہو جاتی ہے جو گھٹوں کی شکل میں لگتا ہے۔ خجنگ میں سینکڑوں جگہ ہاڑی غورتیں اپنے لوکرے لئے ہوئے رہتی ہیں۔ کھیل جمع کرتی اور اسے مل کر وہ لال آٹھا سا اس سے بناتی ہیں جس کا نام کھیلہ ہے جو ایک مشہور دو اتی ہے۔ دن دن بھر وہ یہ محنت کرتی ہیں تب کہیں جا کر شام ہوتے تک وہ بے شکل دو باتیں آنے لگا سکتی ہیں بہم طنز و کیا یہ زندگی ہے یا محض موت سے گریز؟ سبیل سفید نئے والا سال سے بھی زیادہ پر شوکت و درخت ہے خجنگ کا جیرہ جو ان اس کی روٹی سے سبک سروں اور ناکرٹ ماغوں کے نرم تیکے بناد ہوتے ہیں۔ اور اس کی کٹڑی سے دیہاتوں کے سارے چوٹی لواڑتا تیار کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ بریلی میں سویڈن والوں نے جو دیہاتوں کا ایک بڑا بھاری کارخانہ قائم کر رکھا ہے اُس کے لئے وہ نہیں بھلاؤ۔ زانی کے جنگلوں کے پیل کی کٹڑی حاصل کرتے ہیں۔ اٹلس اور بیل کو مین نے بھی پچان لیا۔ اٹلس کی لمبی لمبی گردیاں جیسے لاشی مار پولیس کے ہنڈر اور بیل کے گول گول پھل جیسے ہالکی کرکٹ کے کینڈہ مگر خجنگ وہ نہیں جن پر پھر بھٹی گول کھجے کہ یہاں لوشائے منہ میں بھی پانی بھرتے، جگہ جگہ میں نے بعض درختوں کی ٹہنیوں سے سبز خرچ دانے لٹکے ہوئے دیکھے تھے۔ نئے گول گول خوب صورت سڈوں سب ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور لطف یہ کہ یہاں یہ دانے ایک قسم کے درخت سے لٹک رہے ہیں اور ابھی چند قدم آگے دوسرے قسم کے درخت سے لٹکے نظر آتے ہیں۔ جبران ہو کہ کیا ماہر ہے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ رتی کی بیل ہے جہاں موقوف پانی ہے جو درخت پاس ہو اس پر پڑھ جاتی ہے۔ جا بجا رتیاں ہی رتیاں لٹک رہی ہیں ننھی ننھی سرخ گولیاں جن سے خجنگ کی ہریاں اپنے کھیل کھیلتی ہو گی! ایک ہی دن میں اتنی رتیاں نظر سے گذریں کہ غالباً کوئی شمار یا ریاضی کا طالب علم ہی بتا سکے کہ ان کے کتنے ماشے اور توڑے اور چٹا کھیں اور سیاہ و سن ہو گئے۔ ہائے خالوں نے نازک اندام بھولی بھالی رتی کو بھاری بھر کم بدماغ من پلے باز بھڑایا۔ ارے کم بخت ہمارے علم فضل نے حسن و خوبی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ایک نوع انسان تمدن کے بچے سے چھوٹے اور کم وہ اپنی فطری زندگی اور طبیعت کو تود بارہ پالے! خجنگ کے چپ چاپ ساکن درختوں کی آبادی میں خجنگ کے بولنے والے چلتے پھرتے جالوروں کی آبادی بھی آباد ہے۔ درختوں کو ہم دیکھ چکے۔ اب بعض جالوروں کی کہانی بھی سن لیں۔ میرے خیال میں جس قدر ایک آدمی زیادہ خوف کھاتا ہے۔ اسی قدر زیادہ خوف خجنگ جالوروں کی کہانیاں سننا چاہتا ہے۔ کم از کم یہ میرا تجربہ ہے اپنے متعلق پر غرض جب مجھے ملتے ہیں میں ہمیشہ اُن سے تیروں کے متعلق تازہ ترین حالات سننے پر اصرار کیا کرتا ہوں یوں ان کے پاس ٹاپا لگنے سے اتنا حوصلہ ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ پچھلے دنوں جب کالا دھوگی کے خجنگ میں انہوں نے مجھے ایک فیر کے بچے کا نشان دکھا کہ کاشیر

آج رات ہی یہاں سے گنداپے تو میں تصور میں آٹھ گھنٹے پہلے کا خیال کر کے بھی مطلق نہیں ڈرا بلکہ اپنی جگہ پر قائم رہا اور "نقش پاشو" یا "مردی" اور استقلال سے کھٹکی لگا کر دینک دیکھا کیا شیر جیتا، بھڑیا، سانہیر، مپٹیں کا کڑوہ (یہ دونوں ہرن کی قسمیں ہیں) خنزیر، جنگلی کتا، بندر لنگور، سن لیٹے ان حضرات کی ہمسائیگی میں خشک کے بنگلوں میں اور مچھلیوں کے کمروں میں محفوظ ہو کر میرا دل ذرا بھی نہ دھڑکا۔ بلکہ میں نے اپنے دل سے اور دل کے ذریعہ دماغ سے اور دماغ کے ذریعے گرد و نواح کے جانداروں سے یہ صاف صاف کہہ دیا کہ ہم تم ایک ہی خدا کے بندے ایک ہی رسول کے پروردگار ہیں۔ تم بندگان بندگان بندگان بندگان کا تعلق ہے (خدا خواستہ) ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں پس اے دماغ نے دماغ نیرودا اے کٹے والی جیونٹو! میں ان جنگلیوں میں انسانوں کی طرف سے ان کا پہلی مقرر ہو کر تمہاری خدمت میں صلح و امن کا پیغام لایا ہوں، بلکہ چونکہ میں اپنی بندوبست کی شکل بھی کم دیکھتا ہوں اس لئے میں تو عموماً تمہاری درازی ٹھری دعا میں ہی مانگتا رہتا ہوں چنانچہ پچھلے روز جب ٹر ض مجھے سالانہ دورہ شریلی ٹرڈوں کی عرس بتا رہے تھے تو میں نے ان سے پوچھا کہ جنگلی جانوروں کی عمر کی کیا کیا ہوتی ہیں اس پر انہوں نے رسالہ "انڈین فارٹر" کا ذریعہ ۱۹۳۱ نمبر دکھایا جس میں ہندوستان کے دھوا جانوروں کی عمریں عنوان ایک مستند مضمون درج تھا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ہمارے بزرگ بندروں کی اوسط عمر سات سال، پوری عمر پندرہ سال اور زیادہ سو زیادہ کہیں تیس سال تک ہوتی ہے حضرت لنگور دس سے پندرہ سال تک زندہ رہتے ہیں اسی طرح چیتے کی ۶ سے ۱۵، بھیرے لیاڈ گیلڈ کی ۱۰ سے ۱۵، لگو مگو کی ۱۲ سے ۲۳، لوٹری کی ۱۳ سے ۱۵، بارہ سنگھے کی ۱۴ سے ۲۳، خنزیر (علیہ اللعنت) کی ۱۵ سے ۲۰، شیک کی قید میں عموماً ۱۵ اور آزادی میں ۱۱ سے ۱۹ تک، بکھ کی ۲۰ سے ۳۴ تک لیکن ماتمی کی ستر بلکہ سو سال تک ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ ماتمی انسانی قید میں زیادہ عمر پاتا ہے جنگلی زندگی میں کم۔

اب چلئے آپ بھی انتظار کر رہے ہونگے، اب شکا کھیلیں، ماتمی پر چیتے کا اد شیر کا شکار، موٹر پر کوٹوں اور چیلوں کا، اور پیدل چل کر مرغیوں کا فاختاؤں کا لودوں کا اور اور (شکاریوں کا قاعدہ ہے کہ) :۔

سا سنئے آجائے جو کچھ دیکھ منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئیے کی پیدا کر دہن تصویر کا

پہلے میری شنیدہ سنئے پھر میری دید کی باری آئے گی، لال کنوئیں کے جنگل میں ہمارے افسر ایک واقعہ کے متعلق گفتیش کر رہے تھے میں نے سن پایا کہ چند روز ہوئے دہان انگریز پولیس سپرنٹنڈنٹ نے شیر کا شکار کرنے کو ایک کٹرہ بندو بھلا راتوں رات پیشہ لے گا لکھ دیا۔ یعنی کٹرہ کو مار دیا۔ (یہ قاعدہ ہے کہ اس طرح ایک بے گنہ کٹرہ جنگل میں بندھو ایدیا جانا ہے رات کو شیر لایا جیتا اگر اسے مار دیتا ہے صبح آپ اسے مارا جو اب کچھ کرنوش ہو جاتے ہیں پاس کے درخت پر چڑھ جاتا، یعنی ایک بے پایہ چار پائی بندھو لینے میں دہان سہ پر کو میٹھ جاتے ہیں۔ شام تک انتظار کرتے ہیں شیر آتا ہے پھر تو اگر آپ کے حواس باختہ نہ ہو جائیں، تو آپ اس پر گولی چلا کر شیر آگن بن جاتے ہیں اتفاق سے اسی دن ایک امریکی امیر تاجر ادھر آ نکلا ایدوہ

خجکل کے سرکاری رکھوالے کو کچھ جاندی سونا دکھا کر اپنے چچان باندھو اگر درخت پر ہو بیٹھا سپرن ڈانٹ صاحب کو پتہ چل گیا۔ وہ باغی پر چھوڑتے جھانٹے تشریف لائے۔ اور امریکی کو اتارنے کا حکم دیا۔ وہ اترا مفصل حالات سن کر اپنے تصور کا معترف ہوا۔ اس سپرن ڈانٹ صاحب نے خسروانہ فیاضی کے طور پر اسے پھر تخت پر بٹھا دیا لیکن جب انہوں نے سنا کہ شیر مار لیا گیا۔ تو ان کا شکاری غصہ زور پر آیا اور انہوں نے سرکاری رکھوالے کی پٹ بکری دی۔

ایک امریکی تاجر کی شیر افغانی کی داستان نے دوسرے سفید رنگ تاجروں کے دل میں بھی گہری پیدا کر دی چنانچہ جب ہم کا لاٹھوئی میں مقیم تھے تو ایک دن صبح کو ایک موٹر نے اپنی آمد آمد کا آواز بلند کیا۔ حیران ہوئے کہ یہ نووارد کون ہیں۔ قریب آئے پر معلوم ہوا کہ وہ اطالوی مٹریض سے شیر کا شکار کھیلنے کی اجازت لینے آئے ہیں۔ وہ مشہور صوف سے اطالیہ آنکریزی میں باتیں کرتے تھے میں پاس کھڑا یہ دیکھ رہا تھا کہ موسولینی کی حالت جنگھار کا کچھ ان کے لب لہجے میں بھی نشان ہے کہ نہیں مگر میں نے دیکھا کہ چھپ کر شیر مارنے کی آرزو نے ان میں سے ہر ایک کو خجکل کے افسر کے آگے بافضل ایک رُوباہ بنا رکھا تھا۔

اسی کا لاٹھوئی کے گھاؤں کے قریب ایک انگریز بھرتھکن ہے۔ مضافات میں دور دور تک اس کی جائیداد پہلی ہوتی ہے۔ گویا وہ ایک بڑا رئیس اور امیر کس ہے۔ (افریقہ میں بھی اس کی جائیداد اور اراضی ہیں) یہ بھرتھکن تجربہ کار شکاری ہے اس نے اتنے مردم خور گندار دھیتے، اور شیر مارے ہیں کہ پہاڑی لوگ اُسے چھوٹا پرمیڈیٹہ کہتے ہیں۔ ہمارے آنے سے دُ چاری روز پہلے بعض پہاڑی لوگوں نے اس کے پاس آکر دہائی دی کہ فلاں مقام پر ایک شیر اکثر ہمارے مویشی مار کر کھا جاتا ہے۔ اس پر صاحب کمر اندھوا کر بغیر چچان کے ایک درخت پر بیٹھ گیا جب شام کا وقت ہوا تو ایک شیر دوسرے آنا دکھائی دیا۔ وہ پہنچا تھا کہ دور ایک اور شیر نظر پڑا۔ وہ بھی ادھر ہی کو آیا۔ پھر یہ پہنچا تو دوسرے ایک شیر کی شکل بھی دکھائی دی۔ لیکن اسی پر بس نہیں بلکہ ایک چوٹا شیر بھی وہاں آوارہ ہوا۔ چار شیر اور ایک لاش۔ چاروں لگے غزانے بیچر پہلے تو حاشا دیکھتا رہا پھر تاک کر اس نے سب سے بڑے شیر پر چوٹیر یا بارہ فٹ لمبا تھنگری چلائی اب زخمی شیر اور دوسرے شیروں میں سخت لڑائی ہونے لگی۔ زخمی شیر سمجھا ہونہ ہوا ان حاسد بھائیوں نے مجھ پر حملہ کیا ہے غصے میں آگیا اور ان پر جا پڑا۔ سارے ایک دوسرے گتھم گتھا ہو گئے۔ اور سارا جھگل ان کی جھنج پکار سے گونج اٹھا۔

یہ کہانیاں سن سن کر میں نے بھی کمر ہمت باندھی اور جی سے کہا کہ افسوس اک عمر دوسروں کا شاید لیکن اپنا یقیناً شکار بنا کر اب وقت آگیا ہے کہ اپنا شکار نہیں اپنا شکاری بنوں اور جس طرح انہیں مشرف کی معیت میں اور ان کی ترغیب پر ایک دفعہ شیلے میں دن بھر میں تیس میل پیدل چلا تھا۔ اسی طرح ان کی معیت میں کسی نہ کسی طرح میں بھی جھگل میں شمس جاؤں کہ دیروں کی دنیا خود بخود میری عزت کرنے لگے لیکن میری موجودگی نے کچھ ایسا

اثر پیدا کیا کہ کئی بار لال کنوئیں کی بوجیوں میں کالاجوگی کی خنکلی ٹرکوں پر پادوں گڑھ کے گنجان خنجل میں ہاتھیوں پر بٹغار کرتے ہوئے تھے۔ مگر مرغیاں بھی شاید ہم پر ہنستی ہوئی دور ہی دور میں اگنیں سہم کیا گئے خنجل پر بندوں زندوں سے غالی ہو گئے۔ یہ موقع بھی بے نلکا کہ بھونٹ کر کوئی (مرد غالی سال) کے میں لپلا ڈر پڑا میں ٹھوہیار دور ماہوں، صرف یہی ہوا کہ چھوٹی کے خنجل میں ہاتھی پر بیٹھے ہی چنبیلی کے کچھ پھول ٹوڑے اور وہیں کچھ بیر بھی ٹوڑے جن میں سے ایک بیر سے جو انہوں نے رو کر ہم سے حاصل کیا۔ یہ نئے خاں یوں مخاطب ہوئے: "بیل (بیر) آہم تم کو کھائیں اسی طرح گویا میں بھی زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ شیر آہم تم کو ماہرین مگر میری قسمت میں تو شیر آیا شیر آیا دوڑنا" بھی نہ لکھا تھا تاہم میں بالکل ماہر نہیں نہ ہوا اور میرے ضمیر نے مجھے بار بار آواز دینی شروع کی کہ سن پنجاب کو اپنے پوتے سے بڑی بڑی امیدیں ہیں اور سن کہ اگر کج تو نے یو پی والوں پر کچھ رعب نہ جما تو کل کو خود مختار منہ دوستان میں تیرے صوبے کی کیا گات بنے گی۔ اس پر ایک دن صبح کو میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنے ننہیں سخت خطرے میں ڈال دوں گا مگر غالی ہاتھ داپس نہ آؤں گا۔ سویرے ہی مشرٹل اور میں نکلے جس زادہ نہرانے بھی ہمراہ آنا چاہا میں نے سوچا خود دوں کے سامنے آبرو ہی رہے تو بہتر ہے مشرٹل کے کان میں پھونک دیا کہ اسے روک دو۔ چھوٹی کی ننھی سی ندی کے کنارے گئے۔ پہلے تو ایک جگہ اس کے خشک پاٹ میں گدھوں کا انہوہ دیکھا۔ سمجھے کسی گلے لگائے یا گدھے کی لاش ہوگی۔ قریب آئے تو یہ دیکھ کر سہم میں سنسنی پھیل گئی کہ یہ تو ایک انسان کی لاش ہے۔ پاس چار پانی پڑی ہے۔ کوئی بے رحم ظالم اس غریب کو یہاں لائے۔ ذرا سا گڑھا کھودا پتھر می سی مٹی اوپر ڈال دی اور چل دئے۔ گدھوں نے مٹی کرید کر نوچا کھسٹا اور کھسٹ کر لاش کو باہر لا ڈالا۔ کھوپڑی کو اس طرح صاف کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کا پڑا ہوا پتھر ہے لیکن نمبیں الامان ابھی ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ تازہ گوشت کے کو پتھر سے تھے۔ پاس ہی ایک گیدڑ بھی معائنہ کر رہے تھے ہمیں دیکھ کر دوڑے ہم بندوق لئے پیچھے پیچھے ہوئے ڈیرا مگر غالی گیا۔ داپس آئے اور ایک گدھے پر ڈوڑ کیا مگر نتیجہ نادر دہرے ہوئے جہاں کا خون ہما بھی نہ ملا۔ اس کے بعد آگے بڑھے ایک ذرا سی ندی بہہ رہی تھی۔ ایک ٹوے کو نشانہ بنایا گیا۔ مگر وہ بھی اڑ گیا۔ پتھر اک بچارہ اور ذرا سا لوامیٹھا دم ہلا رہا تھا میں مار خاں نے شہرت بانڈھ کر جو اس کی موت کا حکم دیا تو اس نے فوراً ہی جان دے دی اور بلا توقف راہی ملک عدم ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون اس پر ہم نے ازراہ انکسار لوے مار خاں کا لقب اختیار کیا۔ اور چھوٹے ہی ایک فاختہ پر کار توں غالی کر دیا کہ اتنے میں باقت نے ذرا دور سے آواز دی کہ

دیکھو لوے ساکنان خطہ خاک و شیر آگن نے اک لوا مارا

خنکلی ابجد کے حساب سے دیکھئے بلاشبہ ۲۴ فروری ۱۹۳۲ء تا ۲۵ مارچ تک لگی، اب جب یہ سنا تو میں نے بھی مناسب جانا کہ فی الحال اپنی ہمدردی کو ذرا تھک کر رکھ لوں بس سمجھ لیجئے کہ میرے لئے

شکسار و کل کائنات اس کی یہ تھی

ترتیب موضوع میرے سامنے لکھی پڑی ہے۔ اب عنوان نمبر کی باری ہے متفرقات اور خاتمہ متفرق چیزوں میں ترتیب و تدبیر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر بھی یہ سوچنا ہوں کہ کونسی شے لوں کو لسنی چھوڑ دوں چند مثالیں پیش کرتا ہوں آپ بھی ٹھیک ٹھیک رائے دیجئے۔

مثال نمبر ۱۔ مجھے کالی فاش اور اس کی بہن کالی موڑ کی مصاحبت میں زندگی بسر کرتے ہوئے تین چار روز ہو گئے تھے کہ ایک روز پچھلی رات کمرے کے اندھیرے گھپ میں میرے تن میں گویا آگ سی لگ گئی۔ بدن کا درازں رواں لعلش الامان پکارنے لگا۔ غالب کی نادر بہتر، فار بہتر، نادر بہتر والی غزل یاد آ کر دماغ میں جھپکھانے لگی کبھی یہ خیال آئے کہ ان کالیوں نے غضب کی گرمی طبیعت میں پیدا کر دی ہے۔ اور فار کی کوئی راہ نہیں چھوڑی کبھی یہ دھمک آج سے جو بنگل کی زندگی پر مضمون لکھنا شروع کیا تھا اس نے تھکے مانے دماغ کو کچھ سیدھا کر دیا ہے اب دواؤں کھانی ترک کر دوں یا مضمون لکھنا بند کر دوں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ رات بھر اسی طرح بے چینی میں گزری۔ صبح منہ اندھیرے جو مسطر میں نے پاس کے پائنگ سے السلام علیکم کہہ کر نراج پڑی کی تو میں نے اپنی رام کہانی کہنی شروع کر دی میں نے ابھی تھوڑا سا قصہ ہی بیان کیا تھا کہ انہوں نے بات کاٹ کر مرض کی صحیح سیخ پینٹی تھیں کر دی اور مجھے بتایا کہ بھائی صاحب یہ تو میرے ملازمین کی عنایت سے آپ کو ایک ٹھٹھل آبادی چار پائی مل گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یو پی میں ذرا کھٹل کے لفظ کو سمجھ کچھ کے استعمال کرنا یہ چاب کا سادہ لوح صاف گوشت نہیں چھاں کھٹل کے معنی شیعہ کے ہیں اور پستو کے معنی سنی کے دگر میرا کھٹل شیعہ نہ تھا بلکہ غالب کو فی فلسفی دہریہ لین کا پیرو)

آئندہ میری سوانح عمری لکھنے والے کو ہدایت ہو کہ وہ یہ دافہ کھٹلان کسی طرح نظر انداز نہ کرے کہیں جنہیں طبعی اور دماغی اور شاید روحانی کیفیات سمجھتے ہوئے فنا وہ فقط جسمانی واقعات سمجھ لیں باقی ماندہ شعبہ ہائے زندگی کی بھی یہی حالت نہ ہو!

مثال نمبر ۲۔ پاڈل گڑھ کے رستے میں مسطر میں اپنے معاونین کے ایک گڈوں دہشتیا میں ایک معاملہ کی تفتیش کے لئے اترے بہم ٹہر میں بیٹھے رہے۔ ہمارے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے روکے لوگوں کا جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک گلی بھٹی کتاب تھی۔ دیکھا تو ہندی کا قاعدہ ہے میں ہندی پڑھنی نہ جانتا تھا۔ اگرچہ کئی سال سے ہندی کے مختلف قاعدے جمع کر کے میں مصروف تھا لیکن اس کی بات کو غور کرنے کی فورت نہ آئی تھی چند دنٹ دیکھا کتاب کو کتابوں کے پیچھے پھینک دیا۔ پھر سال بھر کے بعد نکالا دیا حرف اور پڑھے پہلے تو کچھ بھول چکا تھا ۱۱ سے پھر دہرایا اور پھر اسی طرح سال بھر کی چھٹی منالی۔ اس سے علم تو نہیں لیکن ایک قسم کا زخم دماغ میں ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ کہ میں ہندی کے حرف کی شناخت کا مادہ رکھتا ہوں۔ یہاں لوگوں کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ ایک چھ سال کے لڑکے نے ایسے خوب جواب دئے کہ میں نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے اور اُسے اپنا استاد بنا لیا۔ اتنے میں ان کے مارٹر بھی آگئے ہم نے لوگوں

لوکیوں کو پیہ پیہ بانٹ کر بقدر دلے آنے کے اپنی جیب بکلی کی۔ اور پھر مارٹری سے پوچھا کہ ہندی قاعدہ کوئی فالتو ہو تو ہم مولیں گے۔ غرض اُن سے ملے آنے میں قاعدہ خرید کر ان سے سارے حروف تہجی ہندی تصویروں کے سامنے لکھے ہوئے **ق** سے لے کر **چ** تک پڑھ دالے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے ہی اپنا پاپا پڑھتے ہیں۔ مصطفیٰ کماں کی ختی بکلی کی ملکی مشترک تعلیم کا نمونہ انکھوں میں پھر گیا۔

مثال نمبر ۲۔ بہارے ایک نوجوان غریزہ آکسفورڈ کے تازہ بننا زہ گریے جو ایٹ "بن کر آئے ہوئے مسطرس کے پاس آنے والے تھے۔ ہم انتظار میں ان کی راہ دیکھتے تھے۔ ان کا پہلانا راپا جس سے آنے کی امید بندھی۔ دوسرا آیا کہ نہیں آ رہا۔ امید ٹوٹ گئی مگر وہ تمام پلاؤ اور وہ پڈنگ اور وہ اور رب کچھ جو ان کی آمد کی تقریب میں بڑی بڑی مشادیا نہ "دیگوں میں بھک بھک پک پک مٹھنا سہائے جسم و جان اور سہائے قلب روح کا جزو ناہنک بن گیا۔

مثال نمبر ۳۔ چھوٹی کے نیکے میں مسطرس موٹر سازی کے کام میں مصروف تھے۔ کہیں بجی اور ایک بھانجی آنازل ہوا۔ اس نے تقریریں کیں، کرتب دکھائے، سرٹیفیکیٹ دکھائے، جھوٹ سچ ملایا لیکن دو ایک کرتب واقعی ایسے حیرانی میں ڈال دینے والے تھے کہ اسے انعام دے کر میں نے کہا کہ اگر ہمیں یہ کوڑی والا کرتب سکھا دو تو ہم کم کوڑا عمدہ اس سے بھی بڑے کاغذ پر ایک سارٹی فکیٹ دیں۔ آخر سارٹی فکیٹ اور بسکٹ کے ایک خالی ٹین پر سودا ہو گیا۔ کرتب یہ تھا کہ زمین میں ایک تنکا گاڑ کر اس پر ایک کوڑی رکھ دی جاتی تھی پھر جب بھانجی صاحب اس پر تقرر کر کرتے اور پانی چھڑکتے تھے تو وہ کوڑی چاروں طرف گھومتی تھی اور سلام کرتی تھی۔ اب اس کرتب کا مکمل علم ہا قلم کے قبضے میں ہے جو صاحب ایک سارٹی فکیٹ اور بسکٹ کا ایک خالی ٹین ہمایوں کے دفتر میں روانہ فرمائیں گے۔ انہیں اقم اپنا تمہید لکھنا بنانے کے متعلق ہمدردی کے ساتھ غور و خوض کرے گا یہ ہے خجکل کی زندگی اور یہ ہے خجکل کی زندگی پر میرا مضمون کہ

تم بلکہ تیر

بشیر احمد

۲۶ فروری ۱۹۳۲ء

ضمیمہ
شیر کا فکاہ

بس اے ناامیدی زاب دل بھیا تو مجھے شکل اے شیر اپنی دکھا تو
نئے دم سے زندوں کو غش آگیا جو بہت بھینسوں کڑوں کو نوکھا گیا جو

مگر آگئی آج تیری بھی باری
شکاری کا ہو تو شکار اے شکاری

مضمون فروری کے ساتھ ختم ہوا ایک ماہ گریا چھٹی کلن تھا۔ صرف صبح کو میں مضمون کو دہرا رہا تھا۔ اسی میں ساڑھے بارہ ایک گج گیا۔ میں غسل میں تھا کہ باہر سے آواز آئی بھائی صاحب شیر نے لاش کر دی۔ معلوم ہوا کہ چند روز ہوئے جو مسطر نے میرا شیر کا شوق دیکھا۔ تو حکم دے دیا کہ بہت سے کڑے باندھے جائیں اس کے متعلق ابھی خبر آئی ہے۔ کہ شیر نے لاش کر دی یعنی ایک کڑا مار دیا شیر کے ٹکار کا خیال ہو بیٹسل اور محرک حیات ثابت ہوا۔ ہمارے جس کڑا پہننے میں نہ اس میں لاش میں بھی ایک لطف تھا۔ شاید ناموری کا ایک آسمان رستہ مل گیا۔ کیونکہ مسطر نے ایک وزر ہی سجدگی سے بتایا تھا کہ جو شیر میاں کے ہوتے مارا جائے وہ همان کا شیر ہوتا ہے۔ رام نگر سے سات میل پر سالوں دیکھ کے گاؤں کے قریب جنگل میں شیر نے لاش کر دی تھی۔ موٹر میں دھکے کھانے جنگل کے عین بیچ میں جا پہنچے۔ ایک ٹھاکر صاحب ٹکاری بھی ساتھ تھے۔ وہ پہلے سے جا کر پانچ بندھوا رہے تھے۔ موٹر سے انکر کر ہم باقی پر گئے۔ اور موقع پر جا پہنچے جنگل کے پچوں بیچ ایک ندی کا خشک پتھر بلاٹ تھا۔ اس کے دونوں طرف گھنے درخت، درختوں کے آگے ندی کی طرف کو کچھ سرسبز تھے۔ اس ندی کے کنارے پر پانچ بندھے ٹھاکر صاحب ایک رخت پر مسطر رض زادہ مبرا اور میں دوسرے درخت پر اپنے اپنے پانچ پانچ اپنی اپنی بندھوں لئے بیٹھ گئے۔ باقی رخصت کر دئے گئے۔ ہدایت ہوئی کہ چپ سادھ لودم نہ مارو اس طرح چو گویا مردہ ہو۔ شیر کا ٹھاکر یوں ہوتا ہے۔ بیل کے ایک درخت کے ساتھ کھنار کا ایک درخت لپٹا ہوا تھا۔ زمین سے پندرہ ندی سے مترو فٹ کی بلندی پر پہلے لپٹا ان دو پہلے درختوں کے ایک دشا نے میں بندھے تھے۔ مٹی میں بان مین بان زادہ اور همان بیک وقت ایک جائے تخت پیمان پر نشہ جنگل کے بادشاہ پر بلغا کرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ چپ چاپ امتین، شیر سے کواگئے۔ دنیا و ایمانے خیمہ خوں سے سنسن ہوئے۔ شیر کے تیرے تین چوڑے تین گھنے بھی انتظار کرنا پڑا۔ تو کچھ بہت ٹھکانا پانچوں میں چھپنے لگے۔ آدمی جھانک رہے تھے۔ لیکن کبھی بائیں کبھی آگے کبھی پیچھے سانسٹے نیچے ندی کے پتھروں پر چھپا مار دھکڑا ہوا۔ ندی کے سامنے کنارے پر اسے ایک بڑے درخت کے کمرے سے ہوتے تھے۔ سے باندھا گیا تھا۔ شیر نے رات لاش کر دی۔ شیر کا قاعدہ ہے کہ پہلے وہ اپنے ٹھکانے کی گردن کو چٹا ہے۔ گلا گھونٹ کر مار دیتا ہے کچھ خون پیتا ہے اور بچھے کا حصہ بھاڑ کر کچھ کھا لیتا ہے۔ اور پھر بھی بچ کر اسے ذرا در کسی محفوظ جگہ میں رکھ دیتا ہے اور دوسرے روز اکثر شام کو کبھی رات کو اگر باقی ماندہ کو اطمینان کے ساتھ ختم کرتا ہے۔ یہی اس کڑے کا حال ہوا۔ شیر نے اسے مار کر کچھ کھا کر اسے کھینچا۔ اور چونکہ وہ ایک موٹے سے تھے کے ساتھ بندھا تھا۔ تھے سیرت اسے کچھ کرچا تا کہ کسی محفوظ مقام میں اسے رکھ دئے مگر یہ نہ ہو سکا۔ ندی کے مین درمیان اسے چھوڑ دیا۔ تا بہت بھاری تھا۔ بڑا تھوڑا شیر ہو گا جوتے ہو کچھ کو یہاں تک بھی کھینچ لایا یا ممکن ہے کہ پاس کی ٹرک سے صبح بونے گاڑی بالوں کے ٹور سے ڈر کر وہ نہ رہ کر گیا ہو۔ بہر حال اسے شام کے وقت پھر اپنی لاش پر آنا تھا۔ سو ہم اسی کمین گاہ میں بیٹھے ٹھکانے کرنے لگے۔ بات چیت بند، کھانا سنا بند، ہلنا جلنا بند، حرف دل کے اندر کی گھر لٹ اور اس کی بھی کھلی اجازت نہیں پہنچ دس بندہ ہوس منٹ ————— اگر شیر بھی آجائے تو گویا گھر بیٹھے شیر کا ٹھکانہ ہو گیا وہ دیکھتے دیکھتے ایک نیلا ندی کے اس کنارے سے آیا۔ ادھر دیکھا ادھر دیکھا اور پردیکھا ہم سے آگے کھیں ہار دیوں

لے چھوڑیے اور آپ اپنے گھر کی طرف رمنہ موڑیے۔ مضرط بہت یلوس ہوئے میری خاطر میں نے کہا بھائی جتنا ملوں نہ ہو جائے مجھ سے شکاری کے لیے یہی کیا کم ہے۔ یہ رسی ہرسل تھا اگلی دفعہ اصلی کھیل ہوگا۔

سونا کرکین بھی مستنید ہوں کہ یہ شیر کا شکار نہ ہوگا۔ آئندہ مضمون ہوگا شیر کا شکار نمبر ۲۔ اس میں شیر آئے گا۔ مگر ہمیں سو گھڑ دیکھ کر دم دبا کر بھاگ جائے گا۔ پھر مضمون ہوگا شیر کا شکار نمبر ۳۔ اس میں شیر آئے گا اپنی لاش کے قریب آئے گا کہ ہم گولی چلا دیں گے۔ گولی شیر کی دم سے پانچ کے فاصلے پر زن سے نکل جائے گی۔ شیر کا دل دھڑکنے لگ جائے گا اور وہ لغو ذباہہ کہتا ہوا چل دے گا۔ اخیر میں شیر کا شکار نمبر ۴۔ اس میں کٹرہ بندھے گا۔ لاش ہوگی "پچان بندھے گا۔ ہم بیٹھیں گے شیر آئے گا، کٹرہ کھائے گا، ہم گولی چلائیں گے، اس کی گردن میں لگے گی۔ وہ ٹوٹ کر تار تار ہو جائے گا، ہم نیچے اتریں گے، ٹوٹ کر افر کا پستل سے انتظام ہوگا، سو ہمارا اور ہمارے گولی مارنے والے دوست کا مع شیر زن کے ٹوٹ کھینچے گا جس کا ہلاک نیا کر کے ہمایوں میں تصویر دی جائے گی تاکہ دنیا بھر میں ہماری دیسری اور ہماری دیانت داری کا بول بالا ہو جائے اور تا مگس نہ گوید بعد از بس۔۔۔۔۔ کچھ بھی !!!

ب

۲ مارچ ۱۹۳۲ء

چاند و سمنہ

مرے محبوب تو ہے ماہ تاباں میں سمنہ رہوں

شعاعیں قلم زم دل میں تری جب مہکراتی ہیں	}	بپا ہوتا ہے طوفانِ تمنا میرے سینے میں
چٹا میں اضطرابِ ندگی میں ڈب جاتی ہیں		ترے جلوں کے ہم آغوش ہوتی ہیں می ہو جیں
پرانی صحتیں اُس وقت اکثر یاد آتی ہیں		تو جب روپوش ہوتا ہے مراد مل بیٹھ جاتا ہے
مجھے کالی چٹانیں ہر طرف آنکھیں دکھاتی ہیں		اندھیری رات کے منظر سے میرا دل لرزتا ہے

جاذب

(دہلوی)

مرے محبوب تو ہے ماہ تاباں میں سمنہ رہوں

ترجمہ

بیزاری

اے کاش! نہ یہ گلشنِ اسرار بناتے اے کاش! نہ یہ وادئِ پُر خار بناتے
 گریوِ بنی بن آتی تھی کہ ناچار بناتے اے کاش! نہ میرا دل بیزار بناتے
 ”ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے
 سو بار مٹتا میں جو سو بار بناتے“

کلیاں نہ چنکتیں کبھی اور گل نہ ہکتے شاخیں نہ لہکتیں کبھی بلبل نہ چھکتے
 سورج نہ چمکتا کبھی تارے نہ دہکتے مجھ ایسے زمانے میں جو دوچار بناتے
 ”ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے
 سو بار مٹتا میں جو سو بار بناتے“

کس دسٹے اٹھا مے ہونے کا یہ جھگڑا پانے کا کہیں اور کہیں کھونے کا یہ جھگڑا
 یہ پار لگانے کا ڈبلونے کا یہ جھگڑا اے کاش! نہ یہ دیم دل آزار بناتے
 ”ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے
 سو بار مٹتا میں جو سو بار بناتے“

اقرار مرا کر کے وہ انکار ہوئے خود اک ارسا ناقابلِ اظہار ہوئے خود

اِس پار مجھے پھینکے اُس پار ہوئے خود اے کاش مکاں میرا بھی اُس پار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے نختا رہناتے

سو بار مٹا تا میں جو سو بار بناتے

کیوں مجھ کو لگایا ہے یہ آزار جہاں کا اے کاش نہ ہوتا میں گرفتار جہاں کا

بیمارِ ازل ہو گیا بیمار جہاں کا اے کاش وہ اپنا مجھے بیمار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے نختا رہناتے

سو بار مٹا تا میں جو سو بار مٹاتے

اِس گلشنِ فانی میں کہاں بُوئے حقیقت یہ رستہ کہاں جائے بھلا سوئے حقیقت

ظاہر میں ہوا جب پچھپاؤئے حقیقت اِس کذب کو ناقابلِ اظہار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے نختا رہناتے

سو بار مٹا تا میں جو سو بار بناتے

جبر کی شادی

مولے نے شاہ فرانس کوئی چہاد ہم کے دربار کی تفریح کے لئے بہت سے فوجیہ ڈرامے کھے ہیں۔ یہ ڈراما اُس کے ایک ایکٹ کے تمام ڈراموں میں بہترین تسلیم کیا گیا ہے۔ مولے کے کردار زندہ کردار ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ اس ڈرامے میں ان اُس نے اپنے بعض معصوم ربا ریوں کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ جب یہ ڈراما ایکٹ کیا گیا تو خود بادشاہ نے اس میں ایک مہی کا پارٹ ادا کیا۔

سینیرل۔ نہیں نہیں، تنہائی میں چلو۔ معاملہ بہت اہم ہے۔
جرمینو۔ اور دوستوں سے مشورہ کر لینا اچھا ہوتا ہے۔

جرمینو۔ اس عنایت کا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مشورے کے لئے مجھے انتخاب کیا۔ اچھا، اب بتاؤ، بات کیا ہے؟

سینیرل۔ اگر سب سے پہلے میں تم سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اس معاملے میں محض میری دلداری کو ملحوظ نہ رکھنا بلکہ اپنی صحیح صحیح رائے سے مجھے آگاہ کر دینا۔

جرمینو۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مجھے کیا تامل ہو سکتا ہے۔ میں صاف صاف اپنی رائے ظاہر کر دوں گا۔

سینیرل۔ وعدہ کرو۔

جرمینو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ مگر بتاؤ معاملہ کیا ہے۔

سینیرل۔ میں تم سے اس معاملے میں رائے لینا چاہتا

سینیرل (منظر کے پیچھے سے یہ کہتا ہوا داخل ہوتا ہے) ہیں ابھی واپس آیا۔ گھر کا اچھی طرح سے خیال رکھنا۔ اور دیکھو، کسی بات میں بے قاعدگی واقع نہ ہو۔ اگر کوئی روپیہ لے کر آئے۔ تو مشر جرمنو کے ہاں سو مجھے بلالینا۔ اور اگر کوئی تقاضا کرنے آئے تو اس سے کہہ دینا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ اور آج واپس نہیں آئیں گے۔

جرمینو۔ (سینیرل کے آخری الفاظ سن کر) نہایت دانشمندانہ فرمان ہے۔

سینیرل۔ آہ جرمنو! خوب ملے۔ میں تمہارے ہی ہاں جا رہا تھا۔

جرمینو۔ کیا ارشاد ہے؟

سینیرل۔ میں تمہیں اپنے خیال کی ایک بات بتانا چاہتا تھا اور اُس کے متعلق تمہاری رائے حاصل کرنا چاہتا تھا

جرمینو۔ بڑی خوشی ہے۔ اچھا ہو کہ ملاقات ہو گئی۔ اب یہیں اطمینان سے گنگو کر لیتے ہیں۔

جرمیو۔ ادہ، تو یہ اور بات ہے۔ یہ تم نے مجھ سے کب کہا تھا؟

سینیرل۔ مجھے لڑکی بے حد پسند ہے، اور میں اُسے دل و جان سے چاہتا ہوں۔

جرمیو۔ تم اُسے دل و جان سے چاہتے ہو؟

سینیرل۔ بے شک۔ اور میں نے اُس کے باپ کو بھی پسند کر لیا ہے۔

جرمیو۔ اُس کے باپ کو بھی رضامند کر لیا ہے؟

سینیرل۔ ہاں۔ شادی آج شام کو جوئے والی ہے، اور میں قول دے چکا ہوں۔

جرمیو۔ تو پھر شادی کرو۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

سینیرل۔ ذرا سوچو تو سہی۔ میں اپنے امادے کو کیونکر بدل سکتا ہوں۔ جرمنی کیا تمہارا خیال ہے کہیں اب شادی کے قابل نہیں رہا، اس کو جانے دو کہ میری عمر کیا ہے۔ یہ دیکھو کہ حالات کیا ہیں۔ کیا تمہیں کوئی تیس سال کا جوان بھی مجھ سے زیادہ تروتازہ اور مجھ سے زیادہ مگر م کار نظر آتا ہے؟ کیا میں اپنے اعصاب سے پہلے کی بد نسبت اب کچھ کم محنت لیتا ہوں؟ کیا میری شکل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے اب جانے آنے کے لئے گاڑی یا آرام کرنے کے لئے کرسی کی ضرورت ہو؟ جرمنیو۔ تم ٹھیک کہتے ہو مجھ سے غلطی ہوئی۔ ہنوز شادی کرو یہ تمہارے لئے نہایت مناسب ہے۔

سینیرل۔ پہلے مجھے اس بات میں شرم دامنگیر ہوتی تھی۔ لیکن اب میرے پاس اس کے حق میں ہر دست

ہوں کہ اگر میں شادی کروں تو ہر حق ہی کیا ہو؟

جرمیو۔ کون؟ تم؟

سینیرل۔ ہاں میں خود تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو؟

جرمیو۔ سب سے پہلے میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں

سینیرل۔ وہ کیا؟

جرمیو۔ تمہارے خیال میں اب تمہاری عمر کیا ہوگی۔

سینیرل۔ میری؟

جرمیو۔ ہاں تمہاری۔

سینیرل۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اپنی عمر کچھ معلوم نہیں۔

جرمیو۔ سینیرل، تمہاری عمر اردن تین سال کے قریب ہوگی۔

سینیرل۔ کس کی؟ میری؟ نہیں، یہ جو نہیں سکتا۔

جرمیو۔ اور اس لئے جیسا کہ تم نے مجھ سے درخواست

کی تھی میرا صاف صاف دو تازہ مشورہ یہ ہو کہ شادی کرنا تمہارے لئے مفید نہ ہو گا۔ تفصیل

سے بچنے کے لئے میں صرف چند الفاظ میں اپنا خیال تم پر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں

مشورہ دیتا ہوں کہ شادی کا خیال بھول کر بھی دل میں نہ لانا۔ اگر اس وقت تک آزاد رہنے کے

بعد اب تم دنیا کی ان تمام تر چیزوں سے زیادہ جوصل و زنجیر کو اپنے پاؤں میں ڈال لو گے تو

میں سمجھوں گا کہ تم سے بڑھ کر نادان بھی کوئی نہیں

سینیرل۔ اور میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں شادی

کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اور وہ لڑکی ایسی ہے کہ اُس سے شادی کر لینا فیروا شنمن دی ہرگز نہیں

دوہ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے کتنی خوشی ہوگی جب میں تھکا ہوا ہوں گا، اور ایک یومی میری خدمت گزار اور ناز برداری کے لئے میرے پاس ہوگی۔ اور اس خوشی کو چھوڑ کر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرے اسی حالت میں رہنے سے ایک اچھے خاندان کی نسل منقطع ہو جائے گی۔

جرمینو۔ واقعی اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی اور میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں۔ کہ جس قدر جلد بھی ممکن ہو سکے۔ شادی کرو۔

سینیرل۔ سچ کہتے ہو؟ تمہارا یہی مشورہ ہے؟

جرمینو۔ یقیناً اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں۔

سینیرل۔ میں خوش ہوں کہ تم نے ایک سچے دوست کی طرح مجھے یہ مشورہ دیا۔

جرمینو۔ بھلا یہ تو تباہ و دہ خالق ہے کون جس سے تم شادی کر رہے ہو؟

سینیرل۔ ڈوری مین۔

جرمینو۔ وہ فوجان، خوش پوش، خوش گفتار لڑکی؟

سینیرل۔ ہاں۔

جرمینو۔ الگینٹر کی بیٹی؟

سینیرل۔ وہی دہی۔

جرمینو۔ ایڈیڈاس کی بہن، جو بڑا شمشیر باز بنتا ہے؟

سینیرل۔ بس وہی۔

جرمینو۔ واہ!

سینیرل۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

جرمینو۔ بڑی اچھی بات ہے۔ جلدی کرو اور شادی کرو

سینیرل۔ کیا میں نے بہترین انتخاب نہیں کیا؟

جرمینو۔ اس میں کیا شک ہے۔ بہت اچھا جوڑ ہے۔

دقت نہ گنواؤ۔

سینیرل۔ جو کچھ تم نے کہا اس سے مجھے بے پایاں مسرت حاصل ہوئی۔ میں تمہارے مشورے کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور میں تمہیں آج رات اپنی شادی پر دیکھ کر تا ہوں۔

جرمینو۔ میں ضرور آؤں گا۔

سینیرل۔ خدا حافظ!

جرمینو۔ (اگ) فوجان ڈوری مین، الگینٹر کی بیٹی سینیرل سے بیاہی جائے گی جس کی عمر تین سال کی ہو آہ کیسی عجیب شادی ہے یہی عہدیت دی ہے اور جاتے ہوئے اس فقرے کو بار بار دہرائے گا)

سینیرل (تنہا) یہ شادی فرد فرنگوا اثبات ہوگی۔ کیونکہ ہر کوئی اس کے متعلق سن کر خوشی کا اظہار کرتا ہے جس کسی سے میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ وہ ہنس پڑتا ہے۔ میں کیسا خوش قسمت انسان ہوں!

♦ ♦ ♦ ♦ ♦

ڈوری مین۔ (اپنے ملازم چھو کرے) دیکھو، لڑکے، انسانیت سے میرے پیچھے پیچھے آؤ، اور شرارت مت کرو۔

سینیرل۔ (اگ) ڈوری مین کو دیکھ کر وہ آ رہی ہے میری باؤ آ رہی ہے۔ آہ اُس کی صورت کتنی خوش آئند ہے اس کی ادا میں کتنا محسن ہے! اس کے قامت میں کیسی رعنائی ہے! اسے دیکھ کر کون

مجھے دیوانہ بنا دیتی ہے۔ مجھے شریٹس بدلنے میں ملوث کرنے میں جانے، کیونکہ غرض کہ ہر قسم کی تفریح سے دلچسپی ہے۔ مجھے کسی بوی یا کٹر تمہارے انتہا خوش ہو گئے تھاکر درمیان کبھی اختلاف پیدا نہ ہوگا۔ میں تمہارے معاملات میں کبھی دخل نہیں دوں گی۔ اور مجھے امید ہو کہ اسی طرح تم بھی مجھے کسی بات میں مجبور نہیں کرو گے۔ مجھے سے پوچھو تو میں تو یہ چاہتی ہوں کہ ہم مردت کو اپنا شمار بنائیں اور شادی کر کے ایک دوسرے کے لئے سوا بن کر رہ جائیں۔

مختصر یہ کہ جب ہم شادی کر لیں تو ہم دوا ایسے شخصوں کی طرح رہیں سہیں جنہوں نے دنیا کو دیکھا ہو۔ رنگ و حسد ہمارے دماغوں کو پریشان نہ کریں بلکہ تمہیں میری دفا پر اعتماد ہو اور یوں مجھے تمہاری دفا پر اعتماد کرنے کا موقع ملے۔ مگر یہ کیا بات ہے؟ تمہارا چہرہ تبدیل کیوں ہو رہا ہے؟

سینیرل - میرے سر میں یکایک درد شروع ہو گیا ہے۔

ڈوری مین - ہاں ان دنوں یہ روگ بہت سے لوگوں کو ہو رہا ہے۔ لیکن ہماری شادی سے یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا ہو جائے گی۔ خدا حافظ۔ مجھے ایک موز دن سے لباس کی ضرورت ہے۔ تاکہ میں ان چھپٹروں کو اتار کر کھینک سکوں جن میں چیزوں کی مجھے ضرورت ہے وہ میں آج خرید لوں گی اور بل تمہاری طرف بھجوا دوں گی۔

اس سے شادی کرنا چاہے گا۔ اس کے قریب جا کر کہاں جا رہی ہو میری حسینہ، میری پیاری، میری بوی؟

ڈوری مین - میں کچھ چیزیں خریدنا چاہتی تھی۔ سینیرل - بہت اچھا، میری پیاری، اب ہم دونوں کو خوشی نصیب ہونے والی ہے۔ اب جلد ہی مجھے وہ اختیار حاصل ہونے والا ہے کہ میں تمہیں پاکر کر سکوں گا۔ میں نے سنے سے لگا سکوں گا اور تمہیں کسی چیز سے مجھے محروم رکھے گا حق نہیں ہوگا کہ یا تم اس شادی سے خوش نہیں ہو۔ میری پیاری؟

ڈوری مین - یقیناً نا، بے اندازہ خوش کیونکہ میرے باپ نے اب تک مجھ پر بدترین پابندیاں عائد کر رکھی تھیں میں نہیں جانتی کہ کب سے میں اپنی آزادی کا غم کھا رہی ہوں اب سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ میری شادی ہو جائے تاکہ میں اس عذاب سے نجات پاؤں اور اپنے اختیار سے جو چاہوں کر دوں خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں بھیجا میرا چاہتا ہے کہ میں اپنی آئندہ زندگی کا کل آزادی اور مسرت میں گزاروں تاکہ گذشتہ کی کچھ تلافی ہو سکے چونکہ تم ایک تمدن اور شانستہ انسان ہو اور تم نے دنیا کو اچھی طرح دیکھا ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کی خوب نیچے گی۔ اور تم ان شوہروں کی طرح نہ ہو گے جو جان کا آزار بن جاتے ہیں۔ اور اپنی بیویوں کو خوشی کا ایک سانس تک نصیب نہیں ہونے دیتے۔ مجھے اقرار ہے کہ میں ایسی زندگی بسر نہیں کر سکتی جتنی تم

ہے۔ اس لئے تم اُن کی مختلف آرا کا آپس میں مقابلہ کر سکتے ہو۔ یہی میری رائے تو میں کہہ چکا ہوں کہ اس وقت مجھے فرصت نہیں۔ یوں میں تمہارا فائدہ ہوں۔

سینیرل - اتنا ہادہ کچا کہتا ہے۔ اس بیم درجہ کی حالت میں مجھے ان لوگوں سے ضرور مشورہ لینا چاہئے۔

پنکرلیس - ایک فلسفی (انڈسکی شخص سے بول رہا ہے اور سینیرل کو اُس نے نہیں دیکھا) جادویرے دوست جادو۔ تم ایک گستاخ آدمی ہو۔ تم کلمات کی ترکیب و ترتیب سے قطعاً نا بلند ہو۔ تم جمہوریہ ادبیات سے خارج کر دینے کے قابل ہو۔

سینیرل - فکر ہے، ایک تو وقت پر ملا۔ پنکرلیس - (پہلے کی طرح) اور سینیرل کو نہ دیکھتے ہوئے) ہاں میں اپنے قول پر نہایت مضبوطی سے قائم ہوں میں فلسفیوں کے فلسفی اسطو کی حکمت کے ردِ ثبات کروں گا کہ تم جاہل ہو، بھول ہو، اہل ہو، بلکہ جہل کے مادہ سے مبتنی صفات بھی وضع ہو سکتی ہیں۔ وہ سب تم پر صادق آتی ہیں۔

سینیرل - کسی سے اس کا جھگڑا ہو گیا ہے (پنکرلیس سے) جناب عالی!

پنکرلیس - (بدستور، اور سینیرل کو نہ دیکھتے ہوئے) تم بڑے خود بحث کر رہے ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم بحث کے اولین اصول سے بھی ناواقف ہو۔

سینیرل - فصدہ اسے میری طرف دیکھنے میں مانع ہے، پنکرلیس

جرمینو - آہ! سینیرل، میں خوش ہوں کہ تم سے یہاں ملاقات ہو گئی۔ میں ایک جوہری سے ملا ہوں جس نے یہ سن کر کہ تم اپنی پوری کوٹھنے کے طور پر دینے کے لئے ایک انگوٹھی کی تلاش میں ہو مجھ سے اپنی دوکان کی سفارش کرنے کو کہا ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ دنیا بھر میں ایسی نفیس انگوٹھی نہیں مل سکے گی۔

سینیرل - خدا کا نام لو! مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔ جرمینو - کیوں؟ اس کے کیا معنی؟ وہ گرجو جی کیا ہوئی تو تم ابھی ابھی دکھا رہے تھے؟

سینیرل - گذشتہ چند لمحوں میں میں شادی کے متعلق کسی قدر متامل ہو گیا ہوں۔ اب کوئی مزید کارروائی کر کے سے پیشتر میں اس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں میں اُس خواب کی تعبیر معلوم کرنا چاہتا ہوں جو میں نے گذشتہ رات دیکھا تھا اور مجھے ابھی ابھی یاد آیا ہے۔ بہتیں معلوم ہے خواب بمنزلہ آئینوں کے ہیں جو بعض اوقات مستقبل کی تصویریں عکس کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ سمند میں طوفان آ رہا ہے۔ اور میں ایک جہاز میں سوار ہوں اور...

جرمینو - سینیرل، مجھے ایک سخت ضروری کام ہے اس لئے میں تمہارا خواب سننے کے لئے ٹھہر نہیں سکتا میں خوابوں کو سمجھتا بھی نہیں۔ شادی کے مسئلے کے حل کی میں تمہیں ایک تدبیر بتاتا ہوں تمہارے گھر کے ساتھ ہی دو بڑے فاضل فلسفی رہتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں تمہیں مشورہ دینے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں چونکہ دونوں کا مسلک ایک دوسرے سے مختلف

پنکرلیس۔ اس کے لئے معقول ترین وجہ موجود ہیں۔

سینیرل۔ لیکن کیا؟

پنکرلیس۔ ایک جاہل نے اپنے غلط دعوے پر قائم رہنے کی جرات کی تھی، خوفناک، خطرناک، مکررہ دعوے پر

سینیرل۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ دعویٰ کیا تھا؟

پنکرلیس۔ آہ سینیرل، ہر چیز آج کل تہ وبالا دوسری ہے ساری

دنیا بد اعمالی میں پٹھی ہوئی ہے، ہر جگہ ہیبتناک

نفاذ کی حکومت ہے، مجسٹریٹوں کو چڑلک میں

قیام امن کے لئے متعین ہیں شرم سے مرعوبانہ

کہ وہ ایسی ناقابل برداشت بدذاتیوں کے متحمل

ہورہے جس کامیابی میں ابھی کروں گا۔

سینیرل۔ تو وہ کیا ہے؟

پنکرلیس۔ کیا یہ خوفناک بات نہیں، کیا نمائے تہار کا انتقام

اس بات کے لئے بے قرار نہیں کہ کسی شخص کو ٹوپی

کی شکل کہنے کے آزاد چھوڑ دیا جائے؟

سینیرل۔ کیسے؟

پنکرلیس۔ میرا دعوئے ہے کہ ہمیں ٹوپی کی صورت "کہنا

چاہئے" ٹوپی کی شکل "نہیں کہنا چاہئے۔ کیونکہ

شکل اور صورت میں یہ فرق ہے کہ شکل ذی

روح اشیا کے لئے بولاجاتا ہے۔ اور صورت

غیر ذی روح اشیا کے لئے، اور چونکہ ٹوپی ایک غیر

ذی روح شے ہے اس لئے ہمیں ٹوپی کی صورت

کہنا چاہئے نہ کہ ٹوپی کی شکل" (پھر اسی طرح

کہ جس طرح سے وہ داخل ہوا تھا، ہاں، اسے

جاہل، گنگو کا طریقہ یہ ہے۔ اور یہ ارسطو کی اپنی

سے اجنباب عالی!

پنکرلیس۔ (بدستور، اور سینیرل کی طرف نہ دیکھتے ہوئے) یہ

ایک ایسا مسند ہے کہ غصے کے جملہ ساک نے اسے معیوب

قرار دیا ہے۔

سینیرل۔ (الگ معلوم ہوتا ہے کہ اسے سخت دق کیا گیا ہے

(پنکرلیس سے) میں کہتا ہوں)

پنکرلیس۔ (بدستور، اور سینیرل کی طرف نہ دیکھتے ہوئے)

اختلاف عظیم، اختلاف زمین و آسمان۔

سینیرل۔ علامہ نانا، میں آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہوں!

پنکرلیس۔ میں آپ کا خادم ہوں۔

سینیرل۔ کیا میں)

پنکرلیس۔ (دوبارہ طرک) تمہیں معلوم ہے، ہم کس چیز کے ٹک

ہوئے ہو؟ تم نے ایک قضیہ منطقیہ پیدا کر دیا ہے۔

سینیرل۔ میں)

پنکرلیس۔ (پہلے کی طرح) اکبری اہل ہے، صغریٰ لغو ہے اور

نیتہ مضحکہ خیز ہے۔

سینیرل۔ میں)

پنکرلیس۔ (بدستور) میں مرعابوں کا لیکن تسلیم نہیں کروں

گا؛ اور جب تک میرا قلم ٹوٹ نہ جائے میں اس کے

خلاف تبلیغ کرتا رہوں گا۔

سینیرل۔ کیا میں)

پنکرلیس۔ (بدستور) میں اپنے دعوے کی حمایت میں جانک

ٹراؤں گا۔

سینیرل۔ ارسطو نے زمان کیا میں دریافت کر سکتا ہوں

کہ آپ کی اس برہمی کا باعث کون سی بات ہوئی ہے؟

اصطلاحات ہیں، جن کو اس نے کتاب صفات میں بیان کیا ہے۔

سینیرل۔ (الگ ہیں تو یہ سمجھا تھا کہ ہم تباہ ہو گئے) پنکریس سے اعلام صائب، اب اس کا خیال چھوڑ دیئے میں

پنکریس۔ مجھے اس قدر غصہ آ رہا ہے کہ مجھے معلوم نہیں ہوتا میں کیا کر رہا ہوں۔

سینیرل۔ ٹوپی اور اس کی شکل چھوڑیے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں

پنکریس۔ گستاخ!

سینیرل۔ خدا کے لئے اب تم کیجئے۔ میں پنکریس۔ جاہل!

سینیرل۔ لا حول ولا قوۃ! میں

پنکریس۔ ایسے مسئلے پر اصرار کی جرات!

سینیرل۔ وہ یقیناً غلطی پر ہے۔ میں

پنکریس۔ اس مسئلے کو واسطو نے رد کیا ہے۔

سینیرل۔ بجا فرمایا۔ میں

پنکریس۔ نہایت شدت سے۔

سینیرل۔ بالکل درست (اُس طرف جا کر جس طرف پنکریس داخل ہوا تھا، ہاں، ہاں، تم احمق ہو موقوف ہو)

ایک ایسے علامہ سے بحث کرتے ہو جو بپڑھا لکھا ہے۔ (پنکریس سے) لیجئے اس کا جھگڑا تو ختم ہوا

مہربانی فرما کر اب میری بات سنئے میں آپ سے

ایک ایسے معاملے میں مشورہ لینا چاہتا ہوں

جس نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے میں گھر

کی تنہائی کو دہر کرنے کے لئے شادی کرنا چاہتا

ہوں۔ بڑی خوبصورت اندوش وضع ہے۔ مجھے

وہ نہایت پسند ہے اور مجھ سے شادی کرنے پر

خوش ہے۔ اُس کا باپ بھی رضا مند ہے لیکن

آپ کو معلوم ہو، میکس بات سہجڑتا ہوں؛ میں بڑا حق

ڈرتا ہوں کیونکہ دنیا کی حالت میں انسان پر کوئی

حکم نہیں کرتا۔ مجھے آپ ایک فلسفی کے نقطہ نظر سے

بتائیے کہ آپ کی اس معاملے میں کیا رائے ہو؟

آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟

پنکریس۔ میں یہ تسلیم کروں گا کہ فضا اجسام سے خالی

ہو گئی ہے اور میں محض ایک احمق ہوں لیکن

یہ تسلیم نہیں کروں گا کہ ٹوپی کی شکل کہنا درست

ہے۔

سینیرل۔ (الگ ہو کر) خدا اس شخص کو فارت کرے پنکریس

سے (حضرت علامہ ایک لمحے کے لئے میری بات

بھی سن لیجئے میں گھٹے بھرے بک بک کر رہا ہوں

لیکن آپ نے کچھ جواب نہیں دیا۔

پنکریس۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھ پر سخت غصہ

طاری ہو رہا تھا۔

سینیرل۔ اچھا اب اسے رخصت کیجئے اور میری بات سننے

کی زحمت کو افرمائیے۔

پنکریس۔ کہئے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

سینیرل۔ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

پنکریس۔ تو تم کون سی زبان استعمال کرو گے؟

سینیرل۔ کون سی زبان؟

سینیرل۔ نہیں، نہیں، فرانسیسی، فرانسیسی، فرانسیسی! پنگریس۔ آہ، فرانسیسی! سینیرل۔ بالکل۔

پنگریس۔ توچرا اس طرف آجاؤ، کیونکہ یہ کان عالمانہ اور غیر زبانوں کے لئے ہے اور یہ کان عامیانا اور دی زبان کے لئے۔

سینیرل۔ جس معاملے کا میں آپ سے ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرا ارادہ ایک لڑکی سے شادی کرنے کا ہے جو خوبصورت اور نوجوان ہے۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے، اور میں نے اس کے باپ سے شادی کی اجازت بھی لی ہے۔ لیکن میں ڈرتا ہوں۔ کمیں۔۔۔

پنگریس۔ (سینیرل کی بات نہ سنتے ہوئے) گویا انسان کو خیالات کے اظہار کے لئے عطا ہوئی ہے، اور جیسے کہ خیالات حالات کے مظہر ہیں اسی طرح الفاظ خیالات کے مظہر ہیں۔ (سینیرل تکیا ہو کر اپنے ہاتھ سے فلسفی کا منہ بند کر دیتا ہے لیکن جونہی کہ وہ ہاتھ اٹھاتا ہے فلسفی پھر نئی گفتگو شروع کر دیتا ہے۔) کئی مرتبہ ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن یہ مظاہر بعض دوسرے مظاہر سے اختلاف رکھتے ہیں، کیونکہ یہ دوسری قسم کے مظاہر ہمیشہ اپنی اصل و مختلف ہوتے ہیں، اور غالباً یہ کلام حامل ہوتا ہے اپنی اصل کا، کیونکہ وہ خیالات کی تشریح ہے، عادی اشارات کے ذریعہ سے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں وہی بہترین طریق

پنگریس۔ ہاں۔
سینیرل۔ ابھی خیر ادبی زبان جو میرے منہ میں ہے وہ نہ ہمسائے کی زبان مستعار لینے کا تو مجھے خیال تک نہیں۔

پنگریس۔ میرا مطلب ہے کون سی مباحثا کون سی بولی؟
سینیرل۔ ادہ! آپ تو ادبی بات پوچھ رہے ہیں۔
پنگریس۔ کیا تم مجھ سے اٹالوی زبان بولنا چاہتے ہو؟

سینیرل۔ نہیں۔

پنگریس۔ ہسپانی؟

سینیرل۔ نہیں۔

پنگریس۔ جرمن؟

سینیرل۔ نہیں۔

پنگریس۔ انگریزی؟

سینیرل۔ نہیں۔

پنگریس۔ لاطینی؟

سینیرل۔ نہیں۔

پنگریس۔ یونانی؟

سینیرل۔ نہیں۔

پنگریس۔ عبرانی؟

سینیرل۔ نہیں۔

پنگریس۔ شامی؟

سینیرل۔ نہیں۔

پنگریس۔ ترکی؟

سینیرل۔ نہیں۔

پنگریس۔ عربی؟

پر بول بھی سکتے ہیں اب تم اپنے خیالات میرے سامنے ایسے الفاظ میں پیش کرو جن میں اشارات بدرجہ اتم موجود ہوں۔

سینیرل۔ (فلسفی کو گھر میں اندک طرف دیکھتے ہوئے اور باہر سے دروازہ بند کرتے ہوئے تاکہ وہ پھر باہر نکل آئے) اس شخص کو خاموش ہو جائے!

پنکرلیس۔ (اندر سے) ہاں، ہاں، کلام خیالات کا منظر ہے، دل کا ترجمان ہے، روح کا پیکر ہے۔ (ایک کھڑکی سے سر نکال کر کہتا ہے) یہ ایک آئینہ ہے جو ہماری انفرادیت کے پوشیدہ ترین اسرار کا عکس میں صاف صاف دکھا دیتا ہے۔ اب چونکہ تم میں بحث و گفتگو کی قابلیت موجود ہے، میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم اپنے خیالات مجھ تک پہنچانے کے لئے کیوں اس قابلیت کا استعمال نہیں کرتے؟

سینیرل۔ میں بھی یہی چاہتا تھا مگر تم نہیں سنو گے۔

پنکرلیس۔ میں سنتا ہوں، بلو۔

سینیرل۔ میں یہ کہتا ہوں کہ۔۔۔۔

پنکرلیس۔ مگر سب سے زیادہ اختصار کا خیال رکھو۔

سینیرل۔ میں خیال رکھوں گا۔

پنکرلیس۔ طوالت سے احتراز کرو۔

سینیرل۔ بہت خوب۔ تو جناب۔۔۔۔

پنکرلیس۔ قلّ و دلّ۔

سینیرل۔ میں۔۔۔۔

پنکرلیس۔ انتشار و عوجاج قطعاً نہ ہو۔ (سینیرل اس زبان بندی سے تنگ آکر زمین سے پتھر اٹھاتا ہے تاکہ

فلسفی کے سر کی تواضع کرے) میں ہیں؛ توضیح مطلب کی بجائے تم تنگ مزاجی پر اتر آئے وچلے جاؤ، تم اس شخص سے بھی زیادہ مستاع ہو چو کہبتا تھا کہ لڑکی کی شکل کہنا چاہئے۔ میں تمہیں منطقی لاکس اور قاطع براہین سے ثابت کر کے دکھاؤں گا کہ تم اب بھی ایک جوان ہوا درآئندہ بھی کبھی انسان نہیں بن سکو گے، اور میں اب بھی اور آئندہ بھی ایک فاضل فلسفی رہوں گا۔

سینیرل۔ بے نظیر کو اسی ہے!

پنکرلیس۔ (نیچے اتر کر، صاحب تصنیف، صاحب علم و فضل؛

سینیرل۔ اور؛

پنکرلیس۔ دانش و حکمت کا پیکر، (جاتے ہوئے) تمام

علوم طبعی، اخلاقی و سیاسی کا ماہر۔ (واپس آ

کر) ایک فاضل و افضل انسان (جاتے ہوئے)

ایک انسان جسے تفصیل کل کے حصے میں حکایات

صنمیت اور تواریخ کا علم حاصل ہے۔ (واپس آ

کر) قواعد شاعری، عروض، سانیات اور

سوفسطائیت کا (جاتے ہوئے) ریاضی، حساب

منافروہ، طبیعیات اور ابعاد طبیعیات کا (واپس

آکر) آفاقیات، اقلیدس تعمیر و در تمام غیر معین

علوم کا (جاتے ہوئے) ادبیات، ہیئت، نجوم،

حیاتیات، تیانہ اور مشین گوئی وغیرہ کا۔

سینیرل تنہا میں

ایسے علما کو شیطان لے جائے جو کسی کی بات نہیں

سینیرل۔ کیا میں یہاں نہیں ہوں؟ اور آپ مجھ سے بول نہیں رہے؟

مارفلویس۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمیں ہو اور میں تم سے بول رہا ہوں۔ لیکن یقینی نہیں کہ یہ بات صحیح ہو۔

سینیرل۔ لاجول دلاقوہ آپ مذاق کر رہے ہیں، صاف نظر

آ رہا ہے کہ یہ میں ہوں اور وہ آپ ہیں اور ہمارے

مابین معلوم ہوتا ہے کہیں بھی نہیں، پھر کیوں ہم

فلسفہ کے ہر پیر کو ترک کر کے اصل موضوع پر

گفتگو نہ کریں۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میں

شادی کرنا چاہتا ہوں۔

مارفلویس۔ مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔

سینیرل۔ میں جو آپ کو بتا رہا ہوں۔

مارفلویس۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔

سینیرل۔ جس لوگ میں شادی کرنا چاہتا ہوں، بالکل

نوجوان اور نہایت خوبصورت ہے۔

مارفلویس۔ یہ ناممکن نہیں۔

سینیرل۔ میں اس سے شادی کروں تو یہ اچھا ہو گا یا بُرا؟

مارفلویس۔ اچھا ہو گا یا بُرا۔

سینیرل۔ (الگ) ادوہ ہو! اس کو ایک دوسرا خط ہے۔ وہاں

ہرگز، میں پوچھتا ہوں کہ جس لوگ کا میں نے ذکر

کیا ہے آیا اس سے میرا شادی کر لینا اچھا ہے؟

مارفلویس۔ دیکھیں۔

سینیرل۔ کیا بُرا ہے؟

مارفلویس۔ ایسا بھی تو سکتا ہے۔

سینیرل۔ خدا کے لئے ٹھیک ٹھیک جواب دیجئے۔

سنتے، مجھ سے کسی نے کچھ کہا تھا کہ اس کا استاد

اسطوبھی باتیں بنانے کے علاوہ اور کچھ نہ جانتا تھا

اب مجھے اُس دوسرے کے پاس جانا چاہئے، شاید

وہ کچھ زیادہ ہوشمند اور مقبول ہو۔ تو چلے چلو!

♦ ♦ ♦ ♦ ♦

دوسرا فلسفی مارفلویس

مارفلویس۔ مسٹر سینیرل کیسے آئے؟

سینیرل۔ جناب عالی مجھے ایک چھوٹے سے معاملے میں آپ

کا مشورہ درکار ہے۔ اور اسی لئے میں آپ کے پاس

آیا ہوں۔ (الگ) آہ! بیخوب آدمی ہے، یہ لوگوں کو

بولنے بھی دیتا ہے۔

مارفلویس۔ مسٹر سینیرل، ہر بانی کر کے یہ طریق گفتگو بدل دیجئے

ہمارا فلسفہ میں مجبور کرتا ہے کہ ہم کسی مسئلے کو بالآخر کا

بیان نہ کریں۔ بلکہ ہر چیز کو اشتباہ کی نظر سے دیکھیں

اور اس کے متعلق اپنے فیصلے کو ہمیشہ محفوظ رکھیں

سینیرل۔ "معلوم ہوتا ہے"؟

مارفلویس۔ ہاں۔

سینیرل۔ آپ اعتقاد کیجئے، اس میں کچھ شک نہیں کیونکہ

یہ حقیقت ہے۔

مارفلویس۔ یہ ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا معلوم ہوتا

ہو مگر حقیقت نہ ہو۔

سینیرل۔ کیسے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ میں آپ کے پاس

موجود ہوں؟

مارفلویس۔ یہ مشکوک ہے۔ اور میں ہر چیز کو مشکوک سمجھنا

چاہئے۔

مارفریوس۔ میں ہیں ایہ کیا حماقت ہے۔ یہ کیا طسیر
گھنگٹو ہے! اور تم مجھ جیسے بلند پایہ فلسفی کو
مارتے ہو!

سینیرل۔ جہاں بانی فرما کر اپنے اندازِ کلام کی اصلاح کیجئے۔
دنیا کی ہر شے مشکوک ہے، اس لئے آپ کو فریوس
کہنا چاہئے کہ میں نے آپ کو مارا ہے بلکہ یہ کہنا
چاہئے کہ معلوم ہوتا ہے میں نے آپ کو مارا ہے۔
مارفریوس۔ اودہ! میں ابھی مجسٹریٹ کے پاس جا کر اس زود
کوب کی اطلاع دوں گا۔

سینیرل۔ میں اس سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار
دیتا ہوں۔

مارفریوس۔ میرے جسم پر نشان موجود ہیں۔

سینیرل۔ ہو سکتے ہیں۔

مارفریوس۔ اور یہ تم نے لگائے ہیں۔

سینیرل۔ یہ ناممکن نہیں۔

مارفریوس۔ میں عدالت سے تمہارے نام کا سن سنا ہوں
مجا۔

سینیرل۔ مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔

مارفریوس۔ اور تم گرفتار کرنے جاؤ گے۔

سینیرل۔ جو ہو سو ہو۔

مارفریوس۔ مجھے اب اس کا روٹی کے لئے تنہا چھوڑ دو۔

سینیرل تنہائی میں

اب کیا کروں؟ اس وحشی انسان سے ایک لحظہ
نیک انگوارنا شکل ہو گیا، اور میں اب بھی دیسا ہی
کورے کا کورا ہوں جیسا کہ ابتدا میں تھا مٹا دی

مارفریوس۔ میرا ارادہ تو یہی ہے۔

سینیرل۔ مجھے لڑکی بہت پسند ہے

مارفریوس۔ ہوگی۔

سینیرل۔ باپ نے اپنی رضامندی دے دی ہے۔

مارفریوس۔ دے دی ہوگی۔

سینیرل۔ لیکن گرمیں شادی کروں تو مجھے دھوکے سے
ڈر لگتا ہے۔

مارفریوس۔ یہ بات بھی ممکن الوقوع ہے۔

سینیرل۔ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟

مارفریوس۔ یہ ناممکنات سے نہیں۔

سینیرل۔ لیکن اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

مارفریوس۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

سینیرل۔ آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟

مارفریوس۔ جو آپ چاہیں۔

سینیرل۔ آہ! میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔

مارفریوس۔ میں اس سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتا

ہوں۔

سینیرل۔ جھوٹ کہنے والا شیطان ہوتا ہے۔

مارفریوس۔ ہو سکتا ہے۔

سینیرل۔ (الگ) اس نابجا رکوعِ خدا غارت کرے! فلسفی کتے

میں تیرا سا رانسنہ ہرن کر دوں گا! (اسے مارتا

ہے)

مارفریوس۔ (ادہ، ادہ، ادہ!)

سینیرل۔ یہ تمہاری بے معنی باتوں کا جواب ہے، اور آپ

میں مطمئن ہوں!

دوسری عورت۔ جس کے لئے بہت سے لوگ کپ کے دوست بن جائیں گے، دوست! پہلی عورت۔ جو آپ کے گھر میں رہیں پہل کر دے گی۔ دوسری عورت۔ جو بڑی شہرت کی مالک ہوگی۔ پہلی عورت جس کی خاطر لوگ آپ کی عزت کریں گے، بڑی عزت۔

سینیرل۔ یہ تو ہوا۔ تم مجھے یہ تو بتاؤ کہ وہ مجھے دھوکا تو نہیں دے گی؟

دوسری عورت۔ دھوکا؟

سینیرل۔ ہاں!

پہلی عورت۔ دھوکا؟

سینیرل۔ ہاں، وہ مجھے دھوکا تو نہ دے گی، عورتیں مٹانے اور ناپنے لگتی ہیں آپ کیا لغویت ہے۔ یہ کوئی جواب ہے؟ یہاں آؤ۔ میں پوچھتا ہوں کیا مجھے ایک بے وفا بوی دھوکا تو نہ دے گی؟

دوسری عورت۔ آپ کو؟

سینیرل۔ ہاں۔

پہلی عورت۔ آپ کو!

سینیرل۔ ہاں مجھے دھوکا تو نہ دے گی؟

(پہلی عورتیں ناچنے لگتی ہیں)

سینیرل تنہائی میں

خدا ان فیروزوں کو غارت کرے، یہ بھی مجھے اُسی مذہبِ مالت میں چھوڑ گئیں۔ مجھے اپنی شادی کا انجام ضرور معلوم کرنا ہے۔ اُس ساحر کے پاس چلوں جس کا آج کل راجا چاہے، اور جو اپنے حیرت انگیز

کے نتائج و عواقب کے متعلق اس بے اطمینانی کی حالت میں کیا کروں؟ مجھ سے زیادہ پریشانی بھی کبھی کسی کو لاحق نہ ہوئی ہوگی۔ آنا! جیسی آ رہے ہیں وہ میری قسمت کے متعلق کچھ بتائیں گے۔

* * * * *

(دو مہسی عورتیں گاتی، طبلے بجاتی اور ناچتی ہوئی آ رہی ہیں)

سینیرل۔ وہ کتنی خوش ہیں! میں کہتا ہوں پیہمو، تم میری قسمت کے متعلق کچھ بتا سکتی ہو؟

پہلی عورت۔ ہاں، سرکار، ہم دونوں غیب جانتی ہیں۔

دوسری عورت۔ اپنا ہاتھ ادھر لائیے اور ہمارے ہاتھ پر چاندی کا ایک ٹکڑا رکھ دیجیے ہم آپ کو ایسی باتیں بتائیں گے جو آپ کے بہت کام آئیں گی۔

سینیرل۔ یہ تو میرے دونوں ہاتھ۔ ایک میں قسمت ہے اور ایک میں چاندی۔

پہلی عورت۔ آپ کی قسمت بہت اچھی ہے میاں، آپ کی قسمت بہت اچھی ہے۔

دوسری عورت۔ ہاں بہت اچھی سرکار، آپ کو انہیں دونوں میں کچھ ملے گا۔

پہلی عورت۔ آپ کی بہت جلد شادی ہوگی، حضور، آپ کی بہت جلد شادی ہوگی۔

دوسری عورت۔ آپ کو ایک خوبصورت بیوی ملے گی، ایک خوبصورت بیوی۔

پہلی عورت۔ جس سے ہر کوئی محبت کرے گا، حضور جیسے ہر کوئی پسند کرے گا۔

خدا سے زیادہ دیر تک التجا نہیں کرنی پڑے گی سینیئرل
کو دیکھ کر آنا، ہم تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔
اور بہت کچھ تمہاری تعریف و توصیف میں کہہ
رہے تھے۔

لالئی کاسٹ۔ اچھا، یہی ہیں ؟

ڈوری مین۔ ہاں، میری شادی انہیں سے ہو رہی ہے نا
لالئی کاسٹ۔ جناب عالی، مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ
کو آپ کی شادی پر بدیہہ تہنیت پیش کر دوں اور
ساتھ ہی اپنی ادنیٰ ترین خدمات بھی پیش کر دوں
جس خاتون سے آپ شادی کر رہے ہیں۔ وہ
نہایت اعلیٰ صفات سے تصفیت ہیں۔ او میں اس
ڈوری مین کو بھی مبارک باد دوں گا کہ انہوں نے
شوہر کا انتخاب نہایت مناسب کیا ہے۔

* * * *

سینیئرل تنہائی میں

لیجئے، اب تو اس شادی سے دل برداشتہ ہونے
میں مجھ پر کوئی الزام نہ آنا چاہئے میرا خیال ہے کہ
جا کر معاہدہ فسخ کر دوں تو بہتر ہے میرے کچھ بچلے
تو خرچ ہو گئے ہیں لیکن اتنے سے نقصان پر
ہی خلاصی ہو جائے تو کھٹنا چاہئے کہ بچلے۔
میں کوشش کرتا ہوں کہ اس جھجٹ سے نجات
مل جائے (الکٹریک کے مکان پر جا کر دروازہ کھٹکھٹاتا
ہے)

الکٹریک۔ آہ بیٹے، خوش آمدید!

سینیئرل۔ جناب، میرا فرض ہے کہ

ہم کے ذریعے سے جو کچھ کوئی چاہے دکھا دیتا ہے، وہ
ضرور مجھے جو کچھ میں چاہوں گا دکھا دے گا۔

* * * *

ڈوری مین، لائی کاسٹ، سینیئرل (ظہروں سے اوجھل
پردے کے نیچے)

لالئی کاسٹ۔ پیاری ڈوری مین، کیا تم سچ کہتی ہو؟
ڈوری مین۔ بالکل سچ۔

لالئی کاسٹ۔ تم حقیقت میں شادی کر لو گی؟
ڈوری مین۔ حقیقت میں۔

لالئی کاسٹ۔ اور تمہاری شادی کی تقریب آج شام کو ہے؟
ڈوری مین۔ آج شام کو۔

لالئی کاسٹ۔ اور تم میری محبت کو بھلا دو گی، ظالم حسینہ،
اور اپنی محبت کو؟

ڈوری مین میں کبھی نہیں۔ میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہول
اور تمہیں اس شادی سے پریشان نہ ہونا چاہئے۔

میں اُس سے محبت کے لئے شادی نہیں کر رہی

بلکہ اس کی دولت نے مجھے اس پر آمادہ کیا ہے دولت

نہ میرے پاس ہے نہ تمہارے پاس، اور دولت کے

بغیر تم جانتے ہو کہ کیسی گزر رہی ہے، سو خواہ اب

کسی قیمت پر بھی ملے ہیں دولت حاصل کر لینی چاہئے

میں موقع دیکھ کر کوڑی بڑی ہوں اور مجھے امید ہے کہ

بہت جلد اس بڑے کھوسٹ سے نجات مل جائے گی

وہ غریب مر جائے گا، پھر جیسے نہ زیادہ وہ زندہ نہیں

رہے گا، اگر وہ اسے عرصے میں مر نہ جائے تو میرا درد

تم اطمینان کھو بیو گی، مسرت انجیز زندگی کے لئے مجھے

الکٹنٹر۔ تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟

سینیرل۔ ہاں۔

الکٹنٹر۔ کیا؟

سینیرل۔ مسٹر الکٹنٹر یہ سچ ہے کہ میں نے آپ کی بیٹی کے لیے پیغام

بھیجا اور آپ نے میری اس درخواست کو منظور فرمایا

لیکن اب میں نے سوچا ہے کہ میری عمر کچھ زیادہ ہے

اور آپ کی بیٹی بالکل نوجوان ہے۔

الکٹنٹر۔ معاف فرمائیے گا میری لڑکی آپ کو اس کے باوجود

پسند کرتی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے گھر

میں نہایت خوش رہے گی۔

سینیرل۔ نہیں، بعض اوقات میں عجیب و غریب ادب میں

گھبراتا ہوں، اور اس لئے اُسے اکثر میری بد مزاجی کا

مسئلہ ہونا پڑے گا۔

الکٹنٹر۔ میری لڑکی ٹری نیک نصیحت اور فرمانبردار ہے آپ

بچھیں گے کہ وہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے گی۔

سینیرل۔ مجھے کچھ جسمانی کمزوریاں بھی لاحق ہیں جس کے باعث

ممکن ہے وہ بیمار ہو جائے۔

الکٹنٹر۔ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ ایک پاکیزہ عورت کبھی اپنے

غلط فہمی سے بیزار نہیں ہوتی۔

سینیرل۔ تو پھر میں صاف صاف کہہ دوں؛ میں آپ کو راز

نہیں دیتا کہ آپ اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کریں۔

الکٹنٹر۔ آپ یقیناً مذاق کر رہے ہیں؛ جان بھی چلی جائے تو

میں اپنے الفاظ سے نہیں پھرتا۔

سینیرل۔ مگر مجھے آپ سے کوئی جھگڑنا ہوگا، اور میں...

الکٹنٹر۔ نہیں، نہیں، میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں، اور

باوجود اس کے کہ میرے پاس کثرت سے پیغام آ

رہے ہیں۔ میں اپنی لڑکی کی شادی آپ ہی سے

کروں گا۔

سینیرل۔ (الگ تیز استیلاؤں سے)

الکٹنٹر۔ سنو، تمہاری دوستی کی میرے دل میں خاص غرت

ہے۔ اور میں تمہارے مقابلے میں کسی شہزادے

کو بھی اپنی لڑکی دینا پسند نہیں کرتا۔

سینیرل۔ جناب عالی! میں آپ کی اس عزت افزائی کا ممنون

ہوں، لیکن میں صاف صاف کہتا ہوں کہ میں

آپ کی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔

الکٹنٹر۔ تم شادی نہیں کرو گے؟

سینیرل۔ ہاں نہیں کروں گا۔

الکٹنٹر۔ کیوں؟

سینیرل۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں

شادی کے قابل نہیں ہوں۔ اور اس لئے کہ میں

اپنے آباؤ اجداد کی پروردگی کرنا چاہتا ہوں جنہوں

نے کبھی شادی نہیں کی۔

الکٹنٹر۔ سنو، ہر آدمی اپنی پسندنا پسند میں آزاد ہے، اور

میں ایسا شخص نہیں ہوں کسی کو خواہ مخواہ مجبور کر

اٹنے سے کہتا ہوں کہ آپ میری لڑکی سے شادی

کریں گے، لیکن اب چونکہ آپ اس سے دست کش

ہونا چاہتے ہیں اس لئے میں جارہا ہوں، تاکہ

دیکھوں کہ اس معاملے میں کیا کیا جاسکتا ہے۔

میں ابھی اگر آپ کو بتاتا ہوں

سینیرل تنہائی میں

سرکاپ میری اس پیشکش کو بیجا خیال نہ فرمائیں گے
سینیرل۔ کیسے؟

السیڈاس۔ دوسرے لوگ تو شور وغل مچاتے اور آپ کے
خلاف بغض و غضب کا اظہار کرتے، لیکن ہم
اس قسم کے لوگ ہیں کہ ہر بات کو چپ چاپ قبول کر
لیتے ہیں۔ اور میں نہایت عاجزانہ طور پر عرض
کرنے آیا ہوں کہ اگر آپ نوازش فرمائیں تو ہم
دونوں کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے تیار
ہو جانا چاہئے۔

سینیرل۔ یہ تو ہزار جگہ پر پیش ہے۔

السیڈاس۔ آئیے نا حضرت، ازراہ عنایت انتخاب فرما
لیجئے۔

سینیرل۔ میں آپ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ لیکن میرا یہ
گلا کٹوانے کے لئے نہیں ہے۔ (الگ) کتنا ذلیل
ظہر کن گفتگو ہے!

السیڈاس۔ آپ کی اجازت ہو تو یہ امر نہایت ضروری ہو
سینیرل۔ میرے عزیز دوست، میں چاہتا ہوں کہ آپ
اس پیشکش کے سلسلے میں ذرا توقف فرمائیں
السیڈاس۔ آپ جلدی کیجئے، کیونکہ مجھے کچھ ادھر بھی کام ہے
سینیرل۔ میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ میں اس کے لئے
تیار نہیں۔

السیڈاس۔ آپ بڑے لئے تیار نہیں؟

سینیرل۔ یقیناً نہیں۔

السیڈاس۔ آپ سچ کہتے ہیں؟

سینیرل۔ سچ۔

سینیرل۔ اب تو یہ میری توقع سے بھی زیادہ معقول ہو گیا۔ میں
تو یہ سمجھتا تھا کہ مجھے معاملہ کرنے میں بہت زیادہ تکلیف
اٹھانی پڑے گی۔ خدا کی قسم جب مجھے اس معاملے کا
خیال آتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے دنگش
ہو کر برسی و اشمندہ کی ہے۔ میں ایک ایسا قدم
اٹھا رہا تھا کہ شاید بعد میں مجھے اس کی وجہ بہت
پشیمان ہونا پڑتا۔ وہ اکثر بڑا لڑکا لگا گیا، شاید کوئی
جواب دلایا ہے۔

السیڈاس۔ (نہایت نرمی اور اخلاق سے) جناب، آپ کا
غلام حاضر ہے۔

سینیرل۔ مجھے بھی اپنا غلام تصور فرمائیے۔

السیڈاس۔ صاحب، مجھے والد نے بتایا ہے کہ آپ میری ہنر
کی شادی کا معاملہ فسخ کرنے آئے ہیں۔

سینیرل۔ ہاں جناب، مجھے افسوس ہے، لیکن ...

السیڈاس۔ اودہ، جناب یہ بھی کوئی بات ہے۔
سینیرل۔ مجھے سخت افسوس ہے، یقیناً مائے میرا دل چاہتا
ہے کہ ...

السیڈاس۔ جانے بھی دیجئے، اس میں ہرج ہی کو نسا ہے۔
(سینیرل کے سامنے دو تلواریں پیش کرتا ہے، علی
جناب، ان میں سے ایک انتخاب فرمائیے۔

سینیرل۔ ان میں سے ایک تلوار؟

السیڈاس۔ ہاں، ازراہ نوازش۔

سینیرل۔ کس لئے؟

السیڈاس۔ جناب محترم، چونکہ آپ نے میری بہن کے ساتھ
شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے میں خیال کرتا ہوں

سے ایسا سلوک کرنے پر مجبور ہو رہی ہیں لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں اس وقت تک آپ کو مارتا رہوں جب تک آپ میری بہن سے شادی کرنے کا وعدہ نہ فرمائیں۔ (بیدار ہوتا ہے)

سینیرل۔ ٹھہرو ٹھہرو میں شادی کروں گا میں شادی کروں گا۔
السیڈاس۔ میرے محترم دوست، مجھے خوشی ہے کہ آپ کے حواس درست ہو گئے اور معاملات بخیر و خوبی طے ہو جائیں گے میں تم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے دل میں اتنی عزت اور کسی کی بھی نہیں جتنی آپ کی ہے، اور مجھے نہایت سچ ہوتا۔ اگر آپ مجھے اپنی ذات سے بدسلوکی کرنے پر مجبور کر دیتے، میں والد کو بلاتا ہوں، اور آپ ان سے کہہ دیجئے کہ سب باتیں طے ہو گئی ہیں۔ (مبارک الکلٹر کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے)

السیڈاس۔ آہا، یہ صاحب اب معقولیت پر آمادہ ہو گئے ہیں انہوں نے ارزاہ پر اپنی معاملات کو سلجھانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب آپ جن کو ان کے حوالے کر سکتے ہیں۔

الکلٹر۔ جناب یہ ہے میری لڑکی کا ہاتھ آپ صرف اپنا ہاتھ جڑھا دیجئے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے زعفران کی کھانسی، آئینہ اس کے چان چلن کے آپ ذمہ دار ہیں۔ آئیے، اب اس سرسبز انجیر شادی کا جشن منائیں۔

السیڈاس۔ اُسے دو تین بیدار سید کر دیتا ہے جناب کم از کم آپ شکایت نہیں کر سکتے آپ دیکھتے ہیں کہ میں ہر بات قاعدے کے مطابق کر رہا ہوں آپ نے اپنے الفاظ کا پاس نہ کیا میں نے آپ کو لڑنے کی دعوت دی، آپ نے لڑنے سے انکار کیا میں نے آپ کو بیدار لگائے۔ ہر بات قاعدے کے مطابق ہے، اور آپ بڑے شریف آدمی ہیں کہ مجھے مسنون کرتے ہیں۔

سینیرل۔ (الگ، کیسا شیطان ہے!)
السیڈاس۔ (پھر تو اس میں پیش کر کے) آپ کے صاحب، شرافت سے کام لیجئے۔ درنہاں میں مجھے آپ کے کان کھینچنے پڑیں
سینیرل۔ کیا توفیق مل کر چکے ہو؟
السیڈاس۔ جناب والا، میں کسی کو مجبور نہیں کیا کرتا لیکن آپ یا تو پڑیں یا میری بہن سے شادی کریں۔

سینیرل۔ جناب عالی، میں دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں کر سکتا۔

السیڈاس۔ حقیقت؟
سینیرل۔ حقیقت۔

السیڈاس۔ تو پھر مجھے اجازت دیجئے۔ . . . (اُسے ملتا ہوا)
سینیرل۔ اودہ، اودہ، اودہ!

السیڈاس۔ بکرم و محترم، مجھے سخت افسوس ہے کہ میں آپ

اتمامِ عشق

کیا خوب تمہیں اب مجھے بدنام کر دے یہ کام کرو گے تو بڑا کام کرو گے
 ہر چند بُرائی سے کرو گے مری باتیں ہر چند مجھے یاد بہوش نام کرو گے
 میرا یہ ستارہ کہ مرا ذکر لبوں سے دنِ اُت کر دے سحر و شام کرو گے
 میں دشمنِ دل دشمنِ جاں دشمنِ ایسا مجرم ہو کوئی، تم تو مرا نام کرو گے
 جتنی بھی زیادہ مری چاہو گے تباہی جتنا بھی زیادہ مجھے ناکام کرو گے
 اتنا ہی بڑھاؤ گے مرے ذوقِ وفا کو اتنا ہی مے عشق کا اتمام کرو گے

پڑانے کو جلنا ہے بہر حال جلے گا

حیران ہوں کیا شمع کا اِستِوا م کرو گے

ارتقا

۱۹۱۲ء

عشا کی نماز سے فارغ ہو کر میں بستر پر لیٹی ہی تھی کہ امی جان میرے کمرے میں آئیں اور میرے پاس بیٹھ کر نہایت پیار کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ دوران گفتگو میں انہوں نے دبی آواز میں مجھے بتایا کہ دوپہر کے وقت ابا جان کے دیرینہ دوست ڈپٹی . . . صاحب ایسے ملے آئے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے میرے رشتے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ رشتے کا نام سنتے ہی مجھے چکر آگیا میرا دم گھٹنے لگا اور مجھ پر غشی کی حالت طاری ہو گئی۔

اس کے بعد ایک دو ماہ کے عرصے میں ادھر ادھر تین چار پیغام آئے لیکن ابا جان نے امی جان کے شوروں کے ساتھ ہر ایک رشتے کے نیک بہ کو سوچ سمجھ کر بے بنیاد ٹھہرایا۔ بعد میں صلیب ہی کے بیٹے کے ساتھ میرا دامن دستہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ شادی کے خیال سے میرا دم بدستور گھٹتا رہا لیکن میں نے والدین کی خوشی کو اپنی خوشی تصور کیا اور ان کی رضامندی کو اپنی رضامندی۔ اب میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ ابا اور امی کی نظر انتخاب کس قدر نیک بین نکلی ہیں تو کسی طرح بھی ان کے لائق نہ تھی۔

۱۹۲۲ء

بھائی جان کے خط کے جواب میں انہوں نے لکھ بھیجا :-
آج صبح آپ کا دلکش نامہ مع سعیدہ کی کبھی تصویر کے ملائیکریہ تصویر کو صبح سے اس وقت تک پیسوں با دو کیو چکا ہوں لیکن طبیعت سیر نہیں ہوتی اور جی چاہتا ہے کہ اسے دیکھتا ہی رہوں اس خط کے ساتھ اپنی تازہ تصویر بھیج رہا ہوں سعیدہ کو دکھا دیجئے۔ اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے جلد ہی میرے صبر کی ساتھ جواب کا انتظار کروں گا جس قدر جلد ممکن ہو سکے اطلاع دے کر ممنون فرماؤں

تصور میں کچھ اس قسم کی نظر زیب جاذبیت تھی کہ اسے دیکھتے ہی میلاد دل دھڑکنے لگا۔ اور میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے اپنے تکیے کے نیچے چھپایا۔

انہیں اپنی اور ساتھ ہی میری قسمت کا فیصلہ اگلے روز کی ڈاک سے مل گیا ہوگا

ہم دونوں۔۔۔ رشید ادریس۔۔۔ تماشے کے درناک پلاٹ سے بے حد متاثر ہو رہے تھے۔ اور جب فلم کے اختتام کے قریب میری دُن نے دنیا دیا فیما سے منہ موڑ کر گھر بار دولت بشرت یہاں تک کٹاں باپ کی محبت کو بھی صرف شش محصل کرنے کے لئے قربان کر دیا جسے وہ دل سے چاہتی تھی تو میں نے اپنے آنسوؤں کو برمی شکل کے ساتھ روکا اور جو داس بات کے کہ آخر کار وہ دونوں آپریٹل گئے اور خوشی اور کامیابی کی زندگی بسر کرنے لگے میرے دل پر میری دُن کی آخری قربانی کا کچھ اس قدر گراں اثر ہوا کہ تماشے کے ختم ہوجانے کے بعد دیر تک میں اپنی جگہ پر بیٹھی رہی جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سارا بال خالی ہو چکا تھا اور رشید کسی گھر سے خیال میں کھویا ہوا سا میرے قریب چپ چاپ کھڑا تھا۔ دفعہ ہمارے آنکھیں چارپوں اس کی نگاہوں میں ایک پُر سواد اسی تھی۔ ایک لمحے کے بعد اس نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں لے لیا اور نہایت آہستگی سے پوچھا "شیم کہ کیا ہم دونوں اس فلم کے ہیرو اور میری دُن کی طرح ہمیشہ کے لئے ایک نہیں ہو سکتے؟"

میں نے اپنی آہ کو روکتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "ہاں"

۱۹۳۲ء

[اسمین بیٹھ زین سے کئی نزارٹ کی بلندی پر راؤدہ فصا میں اڑنا ہوا طیارہ جسے اسلمین چلا رہی تھی۔ وہ راؤدہ لباس میں ایک حسین ٹرک معلوم ہوتی ہے اسکی پیڑ پجدیزین سلخت کا پیراٹ بندھا ہوا ہے دوسری نشست پر اس کا نوجوان دست بیل بٹھا ہوا ہے] جمیل۔ یاسمین میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔

یاسمین کہو۔

جمیل کئی روز سے میرے دل میں ایک بے درستی انگ پیدا ہو رہی ہے میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اس کے متعلق گفتگو کروں۔

یاسمین۔ (طیارے کو بلندی کی طرف لے جاتے ہوئے) میں ہمہ تن گوش ہوں۔

جمیل میں کئی بار اظہار کی کوشش کر چکا ہوں لیکن میری زبان آج تک میرے دل کی ترجمانی کرنے سے قاصر رہی ہے۔

یاسمین۔ آخر کچھ کہو گے بھی؟

جمیل۔ (دیر کر کے) یاسمین... مجھے تم سے محبت ہے... میں... میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے.....

(یاسمین طیارے کو تیزی کے ساتھ ٹھکا کر اس کے رخ کو نیچے کی طرف کرتی ہے)

جمیل۔ (دو تار دار ہوا میں اپنی زندگی نہایت خوشگوار کامیاب ثابت ہوئی)۔۔۔ کیا تم میری محبت کو شرف قبولیت

یاسمین طیارے کو اسکی انتہائی رفتار تک پہنچا رہی ہے۔۔۔ دفعہ اخیر میں ایک بے درستی محکمے کی آواز آتی ہے اور طیارہ الٹ جاتا ہے)

یاسمین۔ (اپنی نشست پر سے ہوا میں جھلاگارتی ہوئی) افسوس مجھے تم سے محبت نہیں۔

[طیارہ ایک بہت بڑے شعلے کی صورت میں کبلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی کی طرف ہٹتا ہے۔ یاسمین اپنے کھلے ہونے

پیراٹ کے ساتھ ٹھکی ہوئی آہستہ آہستہ زمین کی طرف آتی ہے]

لطیف الرحمن

لاہور سے جانبدار تک

ریل گاڑی لاہور کے عظیم الشان ٹیشن میں داخل ہوئی۔ ناصر نے نادوں کے چوتھے باب کی آخری سطروں پر عجلت سے نگاہ ڈالی اور کچھ دیر کے لئے اسے بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ وہ گہرا گہرا کرکٹ پلٹ فارم پر بیٹھا ہوا تھا کہ مبادا کوئی مسافر اپنی بے غم گام آمد سے اس کی تنہائی کے لطف کو برباد کر دے۔ وہ طبعاً عزت پسند تو تھا ہی، لیکن گاڑی کی صحبت ناچس سے اسے خاص طور پر کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی خصوصاً اگر اس کے ہم سفروں میں کوئی معزز خانوں یا نٹھانچہ بھی آ شامل ہو نہ تو پھر سفر کے یہ گھنٹے اس کے لئے قیامت کی ساعتوں میں تبدیل ہو جائے تھے۔ ابھی گذشتہ ہی مہینہ کا ذکر ہے جب ایک خانہ داری کی بائیس لکھ شہنائی خانوں کے گھی کا برتن ان کے شوہر کی غلطی سے اوندھا ہو کر رہ گیا، گھی کا طوفان تو خیر طوفان لوح کی یاد دلاتا ہی تھا۔ لیکن خانوں پر موصوفہ راستہ بھرنے شوہر اندا کی شان میں جو مدح سرائی کرتی ملی آپس۔ وہ اس طوفان سے کہیں زیادہ نا قابل برداشت تھی۔ اور اس تیار بچے کو کبھی تک وہ نہیں بھولا تھا۔ جو اپنی مال کی گود سے لپک لپک کر لے نیا پیغام محبت دینا رہا تھا۔ اور جس نے اس کے کوٹ پر مستند قسم کے داغ لگائے تھے۔ اور ابھی تک وہ داغ اگر کوٹ پر نہیں تو اس کے دل پر ضرور اسی طرح موجود تھے۔

اس دفعہ وہ گاڑی کے آخری دلوں میں سے ایک میں بیٹھا نہیں بلکہ یوں کہئے کہ پناہ گزین ہوا تھا۔ اور سٹرک ٹیشن پر خلوص دل سے دعا مانگتا تھا کہ آہی کوئی نہ آئے۔ پندرہ منٹ گذر گئے اور اب وہ خوش ہو رہا تھا کہ آواز گدگدائی اودھنا بچ بچے لیکن اتنے میں ایک ہندوستانی عیسائی خانوں گلابی ملل کی سادھی کا پو سنبھالتی ہوئی تقریباً گود کر اندر داخل ہوئیں ناصر کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بارہ نظر جو اٹھائی، تو ایک ادھیڑ عمر کی سیاہ فام آیا، تقریباً ایک پانچ سال کے بچے کا ہاتھ پکڑے بھاگتی ہوئی داخل ہوئی جبے اختیار ناصر کے منہ سے نکلا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون لیکن ابھی کہاں بس ہوتی تھی ایک قلی آیا اور اس نے عین اسی نشست کے نیچے جہاں وہ بیٹھا تھا، ایک ٹوکرا جس میں مرغ یا پر دکی تم کا کوئی جانور بندھا گھسیڑ دیا۔ دوسرے قلی نے ایک ہندو ساکتا اندھ بھینکا بس روح ہی تو فنا ہو گئی سیٹی ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی دوسو کبیر جن پر سے رنگ مدھن میں گذریں نصرت ہو چکا تھا داخل ہوئے اور ان کے پیچھے ایک نعمت خانہ آیا بھر ایک پرانا ٹھنر باسکٹ اور ایک بچے کا گود، اس کے بعد دو بستر نمودار ہوئے جو بشکل دروازے میں سے اندر داخل ہو سکے یہ اس قدر بھول رہے تھے گویا موٹر کا پیرپے کران میں ہوا بھر دی گئی ہے۔ اب گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ رادھ کر کے میں

وہ جانور چڑھتا رہا تھا۔ گوھر کتے نے گھیر کر بھونکنا شروع کیا۔ خاتون کھڑکی میں سے منہ نکالے باہر جلدی، جلدی کی ٹٹ لگا رہی تھیں۔ ناصر کا دل اس قدر سامان کو کچھ کر ڈوبا جاتا تھا۔ اس نے ناول پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈال کر اسے بیگ میں بند کر دیا اور دل میں کہا "اگر خود ہی یہاں سے زندہ نکل گئے تو بڑی بات ہوگی۔" اتنے میں قلی نے سب سے آخری اور رب سے بڑا صندوق اندر دھکیل دیا۔ گاڑی کی رفتار اب تیز ہو چلی تھی۔ اس لئے قلی پلٹ کر فارم پر کو دپڑا۔ اور مردوری طلب کی خاتون نے توقف کیا۔ یہاں تک کہ گاڑی کی رفتار ڈرا تیز ہو گئی۔ اس کے بعد نہایت فیاضی کے ساتھ چار آنے نکالے اور پلٹ فارم پر چار لٹیوں کے سامنے پھینک دئے۔ قلی چلائے میم صاحب نصاف کہتے۔ خاتون نے کچھ زیادہ توجہ نہ دی۔ صرف اتنا کہا تھا "گاڑی جاتی ہے یہ خوب نصاف کا وقت نکالا۔" پھر سر اندر کی طرف پھرتے ہوئے بولیں "اب تو کبھی یہ ٹرین نہ پکڑوں گی۔" آیا سے مخاطب ہو کر کچھ چائے دانی کا ذکر کیا۔ کہتے کو چکر کر اس کا منہ چڑھا اور اسے خاموش کیا۔ ناصر کی آنکھیں نفرت کے شدید احساس سے خود بخود بند ہو گئیں۔ اب تک وہ کہتے کو دنیا کی بدترین مخلوق سمجھتا رہا تھا۔ اس کے بعد خاتون نے آیا سے کہا "ادھر آؤ۔ ذرا یہ صندوق گھسیٹ کر ہٹھکے نیچے کر دو قلی دروازے ہی میں چھوڑ گیا ہے۔" آیا شاید یہی نئی کسی گاؤں سے آئی تھی۔ اپنی بھدی اور کرجت آواز میں بولی "میم صاحب اتنے بڑے مرد سے تو صندوق ہل نہ سکا۔ میں بڑھیا کہیں نیچے آکر دب مردوں کو کسی کا کیا جائے؟" خاتون نے کہا "ابھی ہمیشہ بھانہ کرتی ہے۔" پھر کمر نہایت لچکی لچکا ہوں سے ناصر کی طرف دیکھا ذرا اپنی آستین کو اوپر کی طرف سرکایا۔ ادویوں مخاطب ہوئیں۔ "آپ کو تکلیف تو نہ ہوگی؟" ناصر گھبراہٹ میں اس فقرے کا وہی مطلب سمجھا جس کی نقاضی اس کی دل کی فٹ پختی شرمندگی کے لیے میں رکھتے ہوئے بولا "جی بالکل نہیں۔" تشریف رکھتے "تو انہوں نے ایک لمحہ ٹھہر کر کہا میرا مطلب یہ تھا کہ اس صندوق کو ذرا ٹھیک کر لیا جاتا تو آرام سے بیٹھتے۔ دوسرے سٹیشن پر چڑھنے والوں کو دقت ہوگی۔" ناصر جلدی سے اٹھ کھڑا لیکن دل میں خیال کیا کیا ابھی اور چڑھنے والوں کی بھی گنجائش باقی ہے؟ خاتون کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صندوق کو ہٹانے میں خود بھی شامل ہو چکی۔ لیکن وہ ذرا حیران ہوا جب اس نے دیکھا کہ خاتون نے جلدی سے نیچے کا ہاتھ پکڑا اور یہ کہتے ہوئے نیچے ہٹ گئیں۔ "ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ مائی ڈار لنک صندوق آتا ہے۔"

اب ناصر صندوق کو ہلاتا ہے۔ تو اس میں گویا بولتا اور سید بھر دیا گیا ہے۔ ہلائے سے نہیں ہلتا۔ بدقت نما اسے گھسیٹ کر دروازے سے ہٹایا لیکن اتنے ہی میں چہرہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اور صندوق کا ٹھنڈا تو تقریباً ہاتھ میں گڑ کر رہ گیا۔ زخمی ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر درو کی تکلیف چہرے سے چھپاے ہوئے مسکرا کر بولا۔ بس یہاں ٹھیک ہے کہ خاتون نے کہا "تھینک یو۔" دیری گڈ۔" پھر فوراً ہی بولیں "دیکھئے وہ قلی اگر اوپر کی برتہ پر رکھ جاتا تو کیسی حفاظت کے ساتھ پلار ہنٹ میرا سفر بھی دوبارہ گھنٹے کا ہے۔" اپنی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے ناصر کے چہرے پر شرم سے ہلکی سی سرخی ہو گئی۔ گویا صندوق کو اٹھا کر اوپر رکھنا خود اسی کا فرض تھا۔ تھکے ہوئے بولا۔ اگلے سٹیشن پر دوسرے قلی

کو بلوا کر ٹھیک رکھو دیا جائے گا۔

خاتون نہیں نہیں آپ کو بہت تکلیف ہوگی" (ذرا ٹھہر کر) "سٹیشن قلی بھی بغیر مزدوری لیے ہاتھ نہیں ہلاتے"

اب ناصر پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

خاتون۔ آپ کس انٹرفیٹ لے جا رہے ہیں؟ ناصر کو خیال تو آیا کہ اگلے سٹیشن کا نام لے دوں اور یہاں سے انٹرکرسٹی اور درجے میں جا بیٹھوں لیکن بدقسمتی سے اگلے اسٹیشن کا نام ایسا جاننے سے گم ہوا کہ باوجود تھوڑا وقفہ سوچنے کے بھی یاد نہ آ سکا۔ آخر منہ سے سچ ہی نکل گیا: جی میں جالندھر جا رہا ہوں۔

خاتون۔ (تقریباً حیرت کر) جالندھر؟ خوب وہیں تو میری آنٹی رہتی ہیں۔ آپ تو شاید جانتے ہوں گے منہ

مایا داس، مشہور ہیں لیڈی ڈاکٹر۔

ناصر۔ (بلا سوچے سمجھے)۔ ہاں کچھ یاد تو پڑتا ہے۔

خاتون۔ (خوش ہو کر ذرا وضاحت سے) سنئے وہ عام طور پر وہاں ذرا نرس مشہور ہیں یہی تو وجہ ہے کہ ان کی ذات سے ہر خاص و عام کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ شہر کا کوئی شریف گھر ایسا نہیں جہاں وہ نہ جاتی ہوں میں تو کہتی ہوں بغیر ان کے شاید جالندھر کا شہر اڑ جائے (پھر خود ہی ایک قہقہہ لگاتی ہیں)۔

ناصر۔ جی ہاں۔ پھر تو ضرور ہمارے ہاں بھی آتی ہوگی۔

خاتون۔ (سنس کر) وہ ابھی خاصی موٹی ہیں۔ وزن میں مجھ سے دگنی ہوں گی۔ قد بھی مجھ سے کچھ کھٹا ہو جائے عینک لگاتی ہیں۔ چہرے پر کہیں کہیں داغ ہیں۔ لباس ہمیشہ سفید پہنتی ہیں۔ اب تو آپ کو خوب یاد آ جائے گا؟

ناصر۔ (دماغ پر خواہ مخواہ نادرے کر) ایک دن اس حلیہ کی ایک لیڈی کو غالباً میں نے زمانے میں سے بھٹکے تو ضرور دیکھا تھا۔ شاید وہی ہوں۔

خاتون۔ (زور سے) شاید کیا یقیناً وہی ہوں گی۔ اور کوئی نہیں ہو سکتی جب کہ آپ کو یاد بھی پڑتا ہے۔ اچھا یہ تو بتائیے چلنے میں ان کے دائیں پاؤں میں تھوڑا سا بالکل نحیف رجوش میں بلکہ بالکل بے معلوم سا کچھ لٹکا ہوا سا پن تو نہیں پڑتا۔

ناصر۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس وقت اس پر غور نہیں کیا لیکن ہو سکتا ہے۔

خاتون۔ آپ نے غور نہیں کیا، ٹھیک! اگر غور کرنے تو آپ بالکل یقین کے ساتھ کہہ سکتے تھے۔ آنٹی کسی ناک اور آنکھوں کے اوپر کا حصہ میری بستر سے بہت ملتا جلتا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی ہوتیں لیکن ایک جہہ سے نہ آ سکیں اگر وہ ساتھ ہوتیں تو آپ فوراً پہچان جاتے۔

ناصر جی ہاں پھر تو بہت آسانی ہوتی؟
خاتون: تو پھر آپ ایک کام کیجئے گا تکلیف تو نہ ہوگی؟

ناصر جی: نہیں تکلیف کا کیا ذکر (دل میں) الہی خیر!

خاتون: تو صاحب یہ کتنا عجیبے میری آنٹی کا ہے۔ ابھی بالکل پلہ ہی تھا کہ اس کی ماں مر گئی آنٹی کو بہت صدمہ ہوا۔ انہیں نوں میری ٹوسی (دکٹیا) نے بھی چار بچے دئے تھے۔ آنٹی نے اسے بھی میسے پاس بھیج دیا کہ ایک تو اسے ہر وقت دیکھ لیکر بچے سچ نہ ہو گا۔ دوسرے انہیں بچوں کے ساتھ پلٹا لے گا۔ (کئے کو پیا کر کے بچے کیسا شہر ہو گیا ہے ان نوں تو اس کے بچنے کی بھی امید نہ رہی تھی) ہاں تو اب آنٹی نے مجھے منط لکھا تھا کہ دلی جاتے ہوئے پیارے چکی کو ساتھ لانا میں آئین پر آکر سے نوں کی اب مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس خط کے جواب میں انہیں گاڑی کے وقت سے اطلاع دی تھی یا نہیں لیکن اب تو کچھ مشکل نہیں آپ کتنا ساتھ لے جائیے! اول تو آپ کے گھر میں سب جلتے ہوئے در کسی نوکر کے ہاتھ بڑے ہسپتال میں سسٹنڈا اس کے پاس بھیجا دیئے۔

ناصر (خواس باختہ ہو کر) لیکن میں... کتنا... اچھا خیر۔

خاتون: نہایت خوش و خروش سے، اول تو ناممکن ہے آنٹی نہ ملیں جبکہ آپ کے گھر میں ان کی آمد و رفت بھی ہے لیکن خیر اگر آٹھ دن چکی آپ کے ہاں بھی گزارے تو راج نہیں آٹھ دن بعد میرے شوہر جانندھر سے گزریں گے وہ کتنا آپ سے لے کر آتی کوئے دیں گے۔ اب خوب بات بتی۔

ناصر: درت ہے (دل میں) خدا کرے گاڑی الٹ جائے۔ اور سب فیصلہ یہیں ہو جائے۔

خاتون: اگر تمہارے شوہر ساتھ ہوتے تو آپ ان سے مل کر اس سے بھی زیادہ خوش ہوتے۔

ناصر: (دکھلا کر) انوس میں ان سے نہ مل سکا۔

خاتون: میں آپ کا ذکر کروں گی اور کسورگی جانندھر میں ضرور آپ سے ملے۔

ناصر: رہے شہرت۔ آپ کی مہربانی (دل میں) لیکن اس وقت تک شاید میرا انتقال ہو چکا ہو گا۔

اب خاتون نے بچے کی طرف توجہ کی اور ناصر نے دوسری طرف منہ پھیر کر آسانی سے سانس لیا۔

بچہ: ماما! یہ صاحب کون ہیں۔

خاتون نے ایک مقعدہ لگایا اور ناصر کو مخاطب کر کے یوں گویا ہوئیں۔

ایسے صاحب آپ کو تو ایک اچھے خاصے دوست مل گئے۔ ابھی ابھی آپ کی نسبت پوچھا ہے۔ اب تھوڑی دیر بعد دیکھئے گویا آپ اور یہ کبھی الگ۔ ہوسے ہی نہیں

آپ کا سفر اچھا لطف سے گزرے گا عام طور پر اپنے ہمراہیوں کو یہ خاموش نہیں بیٹھنے دیا کرتے۔

ناصر (آہستہ سے) بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا! لیکن فوراً ہی ہوش میں آگیا (زمرخند

ہنسی سنس کر، یہ بھی بہت اچھا ہوا کیا نام

خاتون (بات کاٹ کر) نام وغیرہ سب یہ ابھی خود بتائے دیتے ہیں۔ ذرا دیر ٹھہریے دیکھ عباد بنیاد و منا بلار ہے ہیں۔

یہ سننا تھا کہ بچہ بون کی سی تیزی سے ناصر کی طرف لپکا اور غلیظ بوٹ اس کی ٹیلون پر رکھ کر اوپر چڑھ آیا۔ اب ناصر کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ادھر بچے کے ساتھ غلطی کرنا ضروری۔ ادھر نئی ٹیلون کا شہر آنکھوں کے سامنے تھا اگر مٹی جھاڑے میں توڑ ہے کہ کہیں خاتون کے غلطی نہ سمجھیں غرض ٹیلون کو تو اس کے حال پر چھوڑا اور بچے کی سولیں غلاب جوئے۔

”آؤ میاں اچھے تو ہو، کدھر سے آنا ہوا“

لوکا۔ آپ پاپا کے دوست ہیں نا؟

ناصر: جھک کر انہیں۔

لوکا۔ آپ اونچے تو اتنے زیادہ ہیں۔ اور مونچھیں آپ کی پاپا سے کتنی چھوٹی ہیں؟

ناصر (جھنجھپ کر) کچھ پڑھتے بھی ہیں آپ (اسے خود کو کسی بچے سے گفتگو کرنے کا ابھی تک کم ہی اتفاق ہوا تھا لیکن اتنا وہ ضرور جانتا تھا کہ اس عمر کے بچوں سے لوگ مونا ہی سوال کرتے ہیں)

لوکا: میں پڑھتا تو نہیں لکھتا ہوں

ناصر: کیا لکھتے ہیں؟

لوکا: یہی — وہ دے

ناصر: (یہ بھول کر کہ غلاب محض بچہ ہے) بہت خوب! آپ کی لغت میں وہ دے (نکل ہی سہی اہم اور غلاب توجہ لفظ ہے)

لوکا: (کچھ نہ سمجھ کر) دیکھئے دیکھئے ذرا اپنی ٹیلون کو کیسا ستیا ناس کر دیا آپ نے (تالی بجاکر) اب آپ خوب پٹیں گے

ناصر نے کچھ کہنے کے لئے ہوں کو جنبش دی۔ یعنی آپ ہی کی نوازش ہے کہ کہتے ہیں خاتون نے ایک نمونہ دیکھا یا بچے اب یہ آپ کو تہذیب کا پورا سبق سکھا کر چھوڑیں گے۔

ناصر: ٹیلون جھاڑے جوئے واقعی خوب باتیں کہتے ہیں۔

لوکا: جناب یہ مینک آپ کی ہے؟ ناصر نے دیکھا بغیر کسی سے مینک بیگ سے باہر ہی رہ گئی تھی۔ بخور دیکھ

تک بچے نے اسے دھرا دھرا سے کہینا۔ اور اس کے بعد مینک اس کی آنکھوں پر تھی،

خاتون (بے ساختہ ہنستے ہوئے) بس وہی پرانی عادت۔ ذرا سنئے تو اپنے پاپا کی تین مینکیں اب کس فریم سے

جدا کر دیں ادھر عینک رکھی ادھر انہوں نے اٹھالی۔

ناصر: (زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ) بچہ ہے نا!

خاتون: سبھی بچے ہوتے ہیں۔ یہ بچہ ہی کچھ عجیب قسم کا ہے۔ دیکھئے دیکھئے ذرا اس کی آنکھیں کس قدر شرارت ہے۔

ناصر: (اخلاقاً) بہت پیارا بچہ ہے۔

خاتون (خوش ہو کر) میں کہتی ہوں اس کی شکل بالکل اپنے پاپا کی طرح ہے اور میری ماما کہتی ہیں کہ نہیں یہ بالکل تمہارے بچپن کی تصویر ہے۔
ناصر مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے۔

خاتون: لیکن میں بچپن میں ایسی شہر کہاں تھی؛ البتہ میرے شوہر اپنے بچپن کی شرارتوں کے بہت قصے سنایا کرتے ہیں

ناصر: (کافی صبر کے بعد بچے کو مخاطب کر کے) لاؤ امیاں عینک تمہارے کام کی نہیں بڑی ہے۔
لڑکا: میں اگلے ٹیٹن پر دوں گا۔

خاتون: ہاں ہاں ضرور دے دینا ورنہ یہ تم سے خفا ہو جائیں گے۔ (پھر ناصر کو مخاطب کر کے) اس کے پاپا تو بس اس کی ہر بات مان لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں بچہ ہی کیا جس میں اتنی سی شرارت بھی نہ ہو۔

ناصر: جی ہاں وہ بچہ ہی کیا؟

خاتون: سنئے اس شہر کی بات ہمارے پڑوس میں کہیں خود کشی کی واردات ہو گئی۔ ان کے پاپا نے فخر جاتے ہوئے خاص طور پر ممانعت کی کہ تم ادھر نہ جانا پولیس اظہار وغیرہ لے رہی تھی لوگوں کا خاصا مجمع تھا۔ ان کی خط بھی بہت کی گئی لیکن جب نمٹش کی تصویر اترتی تو اس کے پاپا یہ دیکھ کر رنگ رہ گئے کہ لوگوں کے ہجوم میں سب سے آگے انہیں کی تصویر تھی۔

ناصر: (ہنس کر) کیوں بھی تم وہاں کہاں پہنچ گئے؟ (لڑکے نے سر اٹھا کر ادھر دیکھا تو عینک غائب تھی) ناصر: (گھبرا کر) عینک کہاں گئی؟

لڑکا: خاموش

خاتون: ننھے عینک کہاں رکھی ہے؟

لڑکا: (بے پردائی سے) بکری کے پاس

ناصر: بکری کے پاس؛ بکری یہاں کہاں آگئی!

لوکا کھڑکی سے جنگل کی طرف اشارہ کر کے "وہاں تھی"

اب ناصرو کو معلوم ہوا کہ وہ خاتون کی بات سننے میں نہایت اخلاق سے مہذب مشغول رہا۔ اور ادھر لڑکے نے کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کیا کہیں جنگل میں کبیریاں چر رہی ہوں گی۔ وہیں عینک گر گئی۔ یا ان حضرت نے دیدہ و دانستہ کبیری کو خوجہ کرنے کے لئے پھینک دی۔

خاتون۔ (ذرا تیزی سے) اسی لئے میں آپ سے کہنے کو تھی کہ عینک بے بیجے معلوم نہیں کتنی قیمت کی تھی آپ کے چائے تھانہ دیتے یا کہیں پوشیدہ رکھتے۔ کچھ ہی تو بے یکا جانے کام کی چیز ہے یا کبھی کیا قیمت تھی عینک کی؟ یہ بھی ایک نقصان ہو گیا۔ بیٹے جانے۔

ناصر۔ (اس بلا وجہ بوجھاڑے گھر پر اور بد وقت تمام چہرے پر سکراہٹ کے آثار پیدا کرتے ہوئے) جانے دیئے کچھ اسی قیمت تھی۔

خاتون۔ (مطمئن لہجے میں گویا نہایت ہی برحق فیصلہ ہو گیا) یہ بھی اچھا ہوا میں تو گھر لگتی تھی کہ نہ جانے کتنا نقصان ہو گیا۔ آپ کی فریم شاید معمولی سی تھی؟

ناصر۔ (جلدی سے) جی ہاں لیکن بعد میں اسے خیال آیا کہ دراصل فریم سونے کی تھی۔

خاتون۔ میرے شوہر کی عادت ہے کہ ہمیشہ اس قسم کی چیزیں خالص سونے کی بنواتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بس ایک دفعہ چیز پائدار اور خوبصورت خرید لی جائے۔

(جواب نہ پا کر) ایک طرح یہ عادت اچھی بھی ہے اور ایک طرح نہیں بھی۔

ناصر۔ (دلاسو چے سمجھ کر زبان سے کیا نکل رہا ہے) ہاں اچھے ہیں اب دراصل اُس میں بات کرنے کا پارا باقی نہ تھا۔ ایک عینک کتنی دوسرے کتنے کا رُخ فرساختہاں تھا کہ اب اسے بھی ساتھ لے جوئے خدا جانے کہاں کہاں لہجے ہو گا اور آیا نے عادت اپنی چندھی اس کمبھیں نہایت بے شکم طریقے سے ناصر کے چہرے پر گرا دیں آیا کا تو معمول ہی یہی تھا۔ بلکہ اسے محسوس بھی نہ ہوتا ہو گا کہ وہ کدھر دیکھ رہی ہے۔ لیکن ناصر نے ان نگاہوں کو بھی اپنی پریشانیوں کا ایک اہم جز قرار دے لیا بار بار چہرے کو ادھر ادھر پھر اگر اس کی نظروں سے بچنے کی بے حاصل کوشش کرتا خوش قسمتی سے عین اس وقت گاڑی ایک اسٹیشن پر آ کر رُک گئی۔ وہ جلدی سے نیچے اتارنے لگا۔

خاتون۔ کہاں جائیے گا؟ دراصل وہاں لوٹے گا۔ ٹری یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی ناصر نے کہا۔ ہاں غالباً زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرتی اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ وہ خیال کروا تھا کہ کسی طرح یہاں سے نجات حاصل کر سکے کسی اور جگہ میں جا بیٹھے چنانچہ کچھ دور جا کر وہ چپکے سے ایک ٹرے میں جا داخل ہوا۔ دو ایک فوجی رہا نہ طور پر جو بھی ٹرے میں دیکھا اتنے میں ایک صاحب بیٹھتے ہیں بیگ لئے ہوئے اندر داخل ہوئے بیگ پر نظر پڑتے ہی معاً ناصر کو اپنے بیگ کا خیال آ گیا اور پھر جلدی

سے وہ نیچے اتر پڑا طوفان کا دھڑکا اسے واپس لوٹنا پڑا اور خاتون متفکر انداز میں کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھیں۔ ناصر کے دل میں چونکا رہے تھے "گمراہی کا احساس تھا اس لئے اب اُسے مجبوراً ایک نیا پرانی ڈالا۔ ایک آدھ گئی کی۔ اس کے خیال میں یہ ثابت کر دینا ضروری تھا کہ گاڑی سے کسی کام ہی کے لئے باہر نکلنا ضرور نہ خاتون تاڑ جائیں گی کہ یہاں سے فرار ہونے کی فکر میں تھا۔ لیکن خاتون کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ یہ اس خوشگوار صحبت سے اس قدر تنگ آچکا ہے۔ ناصر گاڑی میں داخل ہوا۔ چہرے پر زبردستی کچھ مسکراہٹ کھینچ کر آنا پیدا کئے۔ لیکن آنکھوں سے ایسی دہشت برس رہی تھی کہ گویا شہنشاہی سے ابھی پاگل ہوا چاہتا ہے۔ خاتون نے اسے دیکھتے ہی ایک قہقہہ لگایا پھر بچے کو مخاطب کر کے بولیں "وہ آگئے تمہارے پرانے دوست۔ بس اب چپ ہو جاؤ۔ لڑکا کچھ بسور رہا تھا۔ اور یہاں سے اٹھ کر اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ ناصر اپنی جگہ کو غالی پا کر کچھ خوش ہوا اور اطمینان سے بیٹھنے لگے۔ پوچھا: "کیوں رونے لگے؟" خاتون: "بس ادھر آگئے۔ ادھر انہوں نے رونا شروع کر دیا کہ مجھے ساتھ لے کر کیوں نہیں گئے۔ میں بھی میٹیشن پر گھومنے جاؤں گا۔ دراصل اس کے پاس کی دیکھی عادت ہے کہ ساتھ ہوں۔ تو بس اسے ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیتے۔ ہر شے پر ساتھ لیا اور گھوم آئے وہ کہتے ہیں کہ اس طرح بچہ ایک جگہ بیٹھا گھبرا جاتا ہے۔ اب انہیں ایک جگہ بیٹھے دیر ہو گئی۔ تو لگے گھبرانے کہ میں یہیں چھوڑ گئے اور خود میٹیشن کی سیر کرنے چلے گئے۔"

ناصر (ابیں) گھٹکے کے مچھوڑوں میں مچی سے صبا کی پڑا۔ اسٹیشن پر اتر کر بھی چند اطمینان کے سانس لینے سے ناخیر اسی میں سے کڑیاں حرکت کر رہی تھیں۔ اس نے پھر اٹھ کھڑا تھا اور تیس منٹ میں کیا بات، پھر اس نے اس ناول پر توجہ نہیں دے کر بچے کی معمولی سے معمولی حرکت پر جس میں کوئی دلچسپی یا دلکشی نظر نہ آتی تھی اسے خاتون کے ساتھ اپنی غصوں میں شریک ہونے سے نجات حاصل ہو جائے جو اس ذہن اس کے دیکھتے ہوئے دل پر نمک پاشی کا کام کر رہے تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی کچھ ہی عرصہ گزرنے پا یا تھا کہ دھڑک سے کوئی چہرہ آکر اس کی گود میں گر سی اور ساتھ ہی آواز آئی "لوہاں مٹیو" نظر جو اٹھا کر دیکھا تو وہی گناہ اس کی گود میں تھا اور لڑکا پاس کھڑا ہنس رہا تھا۔ بے ساختہ ناصر کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی گئی اور اس نے جلدی سے کئے کو نشست پر چڑھ دیا۔ لڑکے نے تائیاں بجاتی شروع کیں اور ہوا اتنے بڑے آدمی جو کڑھئے "خاتون بھی ہنس رہی تھیں۔ جلد ہی ناصر کے چہرے سے تعرت کا اظہار کم اور نہایت کے آثار زیادہ ظاہر ہونے لگے۔ خاتون نے کہا آپ پڑھنے میں لگے ہوئے تھے لیکن ان کو آپ کی خاموشی ناگوار گذر رہی۔ ناصر نے ناول پھر بند کیا اور لڑکے سے یوں مخاطب ہوا "اچھا یہ آپ کا کتاب ہے؟"

لڑکا۔ ہاں۔ لیکن دیکھئے صاحب! یہ ایسا گندہ ایکوں ہے۔ بار بار منہ سے ٹھوک نکالتا ہے۔ ساتھ ہی تیزی سے ناصر کی جیب سے اس کا زبانی رہاں کھینچ لیا۔ اور اس سے کئے کا منہ اچھی طرح صاف کر کے پھر اسی تیزی سے ساتھ دوبارہ اُسے ناصر کی جیب میں ڈال دیا۔ ناصر اب بالکل خاموش تھا وہ خیال کر رہا تھا کہ چلتی گاڑی سے نیچے کو دکر جان پر کھیل جانا زیادہ آسان ہے۔ یا کچھ دیر اور اس لڑکے کے کھیلوں کا ختمہ مشق بننا رہنا کچھ دیر کے لئے بچے نے اپنی تمام توجہ

کتے کی طرف مبذول کر لی اور خانون آیا سے دلی پہنچنے کے متعلق گفتگو کر گئیں۔ ناصر نے غنیمت سمجھا اس نے جلدی کر کرکڑی سے باہر نکال دیا۔ قحط۔ یہی دیکھنے لے اس کو شام منظر سے نظر ہٹا لینا اس کے لئے بے غنیمت تھا وہ چاہتا تھا کہ کہیں جلد جانے کا اسٹیشن آجائے لیکن ساتھ ہی جب کتے کا خیال آتا تو پھر دل بیٹھ جاتا، حقیقت میں وہ دُعا مانگ رہا تھا کہ ”اُپہی کتے والی کو ضرور اسٹیشن پر موجود رکھیں“

کچھ دیر بعد پھر لوکے نے اس کا شانہ بلایا۔ اور کہا آپ ذرا ادھر تو دیکھئے۔ ابیں جبکی شری کی طرف یہ پھر کونے لگا ناہر نے ذرا رخ کر دیکھا اور پھر بدستور سر کرکڑی سے باہر نکھا۔

لوکا۔ (دوبارہ شانہ ملا کر) ذرا رومال تو دیکھئے؟

ناصر۔ (بغیر ادھر دیکھنے خود ہی لے لو۔

لوکے نے پھر رومال جیب سے کھینچ لیا لیکن اس دفعہ ساتھ ایک چھوٹا سا بٹو ا بھی نکل آیا۔

لوکا۔ ”صاحب یہ میں لے لوں؟“

ناصر۔ (بغیر دیکھتے آئے تو اس نے دل میں کہا۔ اچھا ہے کہ اس ناپاک رومال سے یہیں ٹھہکا رہا ہو جائے ٹھوے کا خیال نہ کہ اس وقت اس کے دل میں نہ تھا۔ لوکے نے ٹھوے کو ادھر ادھر سے دیکھ کر جیب میں رکھ لیا۔ اور اپنی جیب خالی کرنے کے لئے ڈبل بند کی کا ایک توس نکال کر رومال کے ساتھ ہی ناصر کی جیب میں ڈال دیا۔ ناصر نے پھر بھی مکر کر دیکھنے کی ہمت نہ کی کچھ عرصہ کے بعد لوکا کتے سے بھی تنگ آ گیا۔ اور اس نے کھیلنے کے لئے جیب سے چاک کا ایک ٹکڑا نکالا پھر دفعۃً کچھ سوچ کر مسکرایا۔ اور چاک سے ناصر کے کوٹ کی لپٹ پر کچھ لکھا۔ اس کے بعد پھر اسے جیب میں رکھ لیا۔ ناصر نے یہ سمجھ کر کچھ جنبش نہ کی کہ غالباً انگلیوں سے پھیر رہا ہے۔

آخر خانون نے پھر ادھر توجہ معطفت کی۔ اور پکار کر کہا کیا دیکھتے ہیں آپ؟ اب تو آپ کا بالندہر قریب آ

رہا ہے۔“

ناصر۔ فوراً اندر کی طرف سر پھر کر سیدھا ہو بیٹھا جی ہاں۔ آپ کو تو ابھی کافی دیر بٹھرنا ہو گا۔

خانون۔ ”کیا اچھا ہوتا اگر ہمارا اور آپ کا ساتھ دلی تک رہتا؟“

ناصر۔ جی ہاں پھر تو خوب ہوتا۔“

لوکا۔ ”کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟“

ناصر نے سر کی جنبش سے ”نہیں“ کہا۔

لوکا (کتے سے) ”جبکی انٹیک بیٹہ صاحب جاتے ہیں۔“ کتے نے فوراً اپنا دایاں پنجہ اُپر اٹھایا۔

رشتید نے کچھ جنبش نہ کی۔

لوکا۔ آپ ہاتھ بڑھائیے تو یہ کانٹا نہیں آپ سے ٹیک ہینڈ کرے گا۔ ناصر مسکرا کر خاموش رہا۔
لوکا۔ آپ ڈرتے ہیں؟

خاتون۔ نہیں نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے آپ ذرا متاثر نہ کیجئے۔

اب مجبوراً ناصر کو ہاتھ ذرا آگے بڑھانا پڑا لیکن جونہی کتے نے پنجہ اوپر اٹھایا بے اختیار اس نے ہاتھ پھر پیچھے کھینچ لیا۔ اس پر خاتون منہس دیں لوکے نے تالیاں بجانی شروع کیں اور منہستے ہوئے بولا آپ بہت ڈر لوگ ہیں۔
خاتون۔ (نہایت ہی مسرت کے لہجے میں) آپ بھی تو یاد ہی کریں گے۔

جانندہ کراسٹین آگیا۔ خاتون جو کھڑکی سے منہ نکالے باہر جھانک رہی تھیں ایک دم تالی بج کر منہستے لگیں پھر زور زور سے رومال ہلاتے ہوئے مسرت خیز لہجے میں بول اٹھیں وہ آگیاں آئی۔ ان الفاظ کو سنتے ہی گویا جاکسی جان میں عین آگئی۔
فرز شکرسے آنکھیں جھک گئیں۔ اتنی خوشی اسے شاید عمر بھر کسی شخص کے آنے سے نہ ہوئی ہوگی۔

ایک تقریباً ۲۰ برس کی سائونی سی خاتون جو ضرورت سے کچھ زیادہ قد اور اداسی تناسب سے فرما ہذا مقیم سامنے دکھائی دیں ان کی دونوں جوان لڑکیاں اور دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔ ان سب نے گاڑی کے کتے ہی اگر اس درجہ کو گھیر لیا۔ خاتون اور بچے کی توجہ اب زیادہ تر اپنے عزیزوں کی طرف تھی۔ ناصر نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی چٹری اور بیگ سنبھالا اور خاتون کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا۔

لیکن ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ پیچھے سے پھر خاتون کی آواز سنائی دی۔ ذرا ٹھہرے تو آپ کو آنٹی سے انٹروڈیوس تو کر لیا ہی نہیں۔ مگر اب وہ آزاد تھا کسی نئی قید میں پھنسا اس وقت اسے کہاں گولا ہونا۔ وہ آگے بڑھتا گیا گویا کچھ مٹا ہی نہیں کچھ دوزخ آگ کی طرح پھیلنے لگا۔ خاتون کے قدموں پچوں کے چھپوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور جب یہ آوازیں بھی ختم ہو گئیں تو اسے پوری طرح طمینان کا سانس لیا لہتے ہیں پیچھے سے آواز آئی تسلیم احضرت! کتنے عجیب و غریب خطاب ہے کسے کارمنایاں کے عوض حاصل کیا ناصر اس وقت شاید کل بنی نوع انسان سے اس قدر خوف نودہ ہو رہا تھا کہ باوجود آواز شناسا معلوم ہونے کے بھی اس نے غر کر پیچھے نہ دیکھا کہ یہ مبادا کسی اور آفت سے سامنا ہو جائے اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ابھی تک اس کا سر جھک رہا تھا گویا برسوں کی قید بامشقت سے مائی پاکر چلا کر رہا ہے۔ دنیا دہانیاں کی کچھ خبر نہ تھی مکینٹ کلکٹر کی صوٹ دیکھ کر کھٹکٹا دیا۔ اور اس نے بڑا مکانے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن جواہر ہاں کہاں تھا؟ ڈبل روٹی کے توس کو اس نے پھونکا کڑکھالا۔ اور بندہ دیکھے جاپی گھمانے کے لئے ہاتھ کو عجیب طرح جنبش دی۔ اس بڑکے کلکٹر کے علاوہ دو ایک اور پہلے آدمی بھی سکر لئے بغیر نہ رہ سکے۔ ناصر کی نظر توس پر پڑی۔ اور وہ سخت خائف ہوا۔ ویں میں جبران

خفا کہ خدا یا یہ کیا ماجرے پھر ایک ایک کے تینوں جیبوں کی خوب تلاشی لی لیکن ٹوا یہاں تھا ہی نہیں۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ اُس آفت جان لڑکے کی نوادشیں ابھی تک اس کے ساتھ ہیں بلکہ کلکٹر سے مشابہ کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ناصر نے کہ میرا ٹوا ایکٹ سمیت گاڑی میں رہ گیا ہے۔ اور پھر واپس جانے کے لئے پلٹا ایکٹ کلکٹر نے تیز نظر سے دیکھ کر کہا ذرا اچھی طرح تلاش کیجئے گا۔ اس فقرے سے اسے اور بھی اذیت ہوئی۔ آخر پھر اسی پلیٹ فارم پر آیا دل میں سوچ رہا تھا "اب پھر اسی آفت کا سامنا ہو گا۔ جس سے خدا خدا کر کے نجات ہوئی تھی" کبھی سوچتا کہ وہ لوگ یہ نہ کہیں کہ چوری کا الزام لگانے آیا ہے۔ کبھی خیال آتا خدا جانے بولے باندھے۔ اور خواہ خواہ کوئی نیا عذاب ہول لے آؤں۔ ایک فعدیر بھی خیال آیا کہ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ شیش پر ہیک مانگ کر گرا یہ ادا کروں لیکن ہاں نہ جاؤں۔ اسی ادھیڑ میں کبھی قدم آگے رکھتا تھا اور کبھی پیچھے۔ اتنے میں پہلی مٹی کی آواز سنائی دی۔ آخر اپنے قدم بٹھایا اور جلد ہی پھر گاڑی کے اس ڈبے کے سامنے جا پہنچا۔

خاتون۔ (خوش ہو کر) آخر آپ پھر آگئے۔ آٹلی کو آپ نے نکلے کا بہت افسوس تھا؟

ناصر۔ جی میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ میرا ٹوا یہیں کہیں گاڑی میں رہ گیا ہو گئے علاوہ نقدی بھی اسی میں تھی؟

جی۔ میں کٹ کی قیمت بھی ادا نہیں کر سکا؟

خاتون۔ یہاں گاڑی میں رہ گیا؟

ناصر۔ جی ہاں ذرا جلدی دیکھئے گاڑی جا رہی ہے؟

خاتون۔ (ادھر ادھر دیکھ کر) یہاں تو بالکل نہیں۔

ناصر۔ بچے سے پوچھئے؟

لوکا۔ وہ تو میں نے پھینک بھی دیا۔

ناصر۔ اگھر اگر کہاں کہاں؟

لوکا۔ بہت دور ابھی گاڑی کھڑی کہاں ہوئی تھی؟

ناصر۔ (جیتا ہی مکے لیے ہیں) تم نے کیوں پھینکا؟

لوکا۔ میری جیب میں جگہ تنگ ہو گئی تھی۔

خاتون۔ (ہنسی کو بہت روک کر) دیکھئے اس کی شرارت بھلا آپ کا ٹوا اس کی جیب میں کیسے گیا۔ اس

کی تو عادت ہی شرارت کی ہے۔ آپ سچ مان گئے۔ آپ کو چاہئے تھا۔ ایسی چیرصاف سے رکھتے۔

ناصر۔ (منہ ہی منہ میں) احتیاط میں کیا خاک کرتا۔ اتنے میں گاڑی کو حرکت ہوئی۔ (خاتون اپنی غلاموں کے

لوگوں سے زحمت ہونے کے بعد ناصر سے منکر لہے ہیں، اب آپ کا کیا انتظام ہو گا؟ پھر فوراً ہی نہایت تدبیر کے ساتھ اچھا

آٹلی! آپ فی الحال ان کے ٹکٹ کی قیمت اور جمانہ ادا کر دیجئے یہ پچارے اپنا ٹکٹ کھو بیٹھے۔

گاڈ ہی کی رفتار تیز ہو گئی۔ خاتون نہایت اخلاق کے ساتھ برابر رومال ہلا رہی تھیں۔ لیکن ناصر کو بھی چاہتا تھا کہ اُس کا بس چلے تو اس ذات تمام دنیا کی عورتوں اور بچوں کو یک قلم دنیا کے تختے سے نیت و نابود کر دے۔

بالآخر وہ گھر پہنچ ہی گیا۔ اس قدر شدید نقصان اٹھانے کے باوجود اسے اس وقت ایک سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنا کوٹ اتار کر کھوٹی پر لٹکا دیا لیکن جونہی کوٹ کی ٹیٹ پر نظر پڑی کیا دیکھتا ہے کہ سیاہ کوٹ کی ٹیٹ پر سفید چاک سے نہایت نمایاں طور پر "D" لکھا ہوا ہے۔
اس نے کوٹ اٹھا کر زور سے فرش پر ٹپک دیا اور کہا جمعی میں بھی کموں۔ ہر سانے سے آنے والے کی نسبت بڑے بچے سے آنے والا کیوں ایک دفعہ زیادہ غور سے میرے چہرے کو دیکھتا ہے۔

”راہرو“

اقوال

انسان کا پہلا اور آخری منزل یہ تھا کہ بتوں کو پوجنے کے قابل نہ رہا۔ نہ چھٹ پیر اقبال کیلئے کی بات کہہ گیا ع
تراشیدم، پرستیدم، شکستم

مگر بتوں کو توڑنے والا وہ کب ٹوٹے گا، عمارتوں کے کھنڈ رچھ بھی نہیں، وہ کھنڈر جنہیں دیکھنے سے اصلی عبرت
ہوگی انسان کے کھنڈر ہو گئے۔ انہیں کون دیکھے گا۔ خدا

یہ جتنے سیرکفر و برہراہ آج کل بکتا ہے محض ایسی بھلائیوں کا پھل ہے اصل دلائلی کفر یہاں آتا ہی نہیں یہاں کے
ایک کافر نے ایک ڈالاک محض پانے کی پیر کی وجہ سے خدا شیطان کی مدد نہیں کرتا در نہ دنیا کہیں کہیں ترقی کر جاتی کس قدر کچا
کافر تھا کہ اس کے نزدیک گویا اب تک یورپ و امریکا خدا کی مدد کے محتاج ہیں بلکہ کافر ہونا کس قدر مشکل ہے۔

تنبیہ کا تازیانہ انسان سے کیا کسی نے قبول کیا؟ یہ تو مدت ہوئی کہ انسان انگوٹھا لگا کر تھوڑے چمکاک مذاہب اور مذاہب
کے دھم سے باطل تہذیب کی لڑیٹ سے مجبور رہا۔ انسان نے پہلے تو خدا کو بتائوں سے کمال کر لیا پھر بتوں سے کمال کر لیا اور خدا کو اپنے
ذہن کی تنگ داریک کو ٹھہرایا جس سے بتی طلق کہہ کر اسے متفید کیا اب انسان خود اس قدر ذہنی زندان سے بھی کسبے کائنات سے انسان
کے پیچھے کس غرض سے یورپس لٹکا رہی ہے، کس جرم کے بدلے، بس یہی کہ عقل ہے کہ عقل ہے، کبھی جو یونہی گردن ٹوڑ کر ان سالہ کو
دیکھ لیتا ہوں جو اب پس پشت میں تو جلدی سے منہ پھر لیتا ہوں اُس نام نہند کے میں اگر کچھ اجالا ہے تو دوچار اٹھانے سے منہ لٹکاتا
اب بھی وہی غلطیاں کرتا جاؤں، کیا انسان غلطیاں کرتے کرتے صراط المستقیم کی طرف جھٹک نہ سکتا ہے؟ یا کیا یہ ہے کہ جنہیں
ہم نادانیاں سمجھتے ہیں وہی اصل زندگی ہیں۔ کون بتائے اور کون سمجھے؟

فلک پیم

غزل

آج دل میں اثرِ الفتِ کامل دیکھا آج دل کو ترے ارمان کے قابل دیکھا
 دونوں عالم کی خوشیِ نذرِ مسکری بیٹھا آپ نے بندہ درگاہ کا بھی دل دیکھا
 ہم نے پایا بھی تو اک دردِ بھرا دل پایا ہم نے دیکھا بھی تو یزیدیت کا حاصل دیکھا
 طلبِ دوست کے صفتِ کربلاں کو دن رات دوست کے نام کی تسبیح میں شاعلی دیکھا
 طالبِ دوست کو اللہ کا طالب سمجھو واصلِ دوست کو اللہ سے واصل دیکھا
 ہتم و محتاج ہیں، شاہوں کو گدا بن کر تیری سرکارِ گدا و دست میں سائل دیکھا
 ساتی بزمِ انزاجِ سام بہ کفِ آنا تھا بزم کی بزم کا ایسا سہو منہ نزل دیکھا
 بحرِ الفتِ متلاطم ہے تو ہو — کیا پردا اب خدا پا ہے تو نظارہٴ ساحل دیکھا
 شکرِ صد شکرِ معذوباتِ سفرِ ختم ہو میں اور آنکھوں سے جمالِ رُخِ منہ نزل دیکھا

عشقِ اصنام بھی ہے، دعویٰ اسلام بھی ہے

تم کو آزادِ عجیبِ مُرشدِ کامل دیکھا
 حکیمِ آزادِ انصاری

وہ

میں نے اُس دن جارج مور کا ناول "ایسٹھروڈ" پڑھ کر ختم کیا تھا کچھ عرصہ میں آرام کر میں پڑھیم دراز ناول کے عجیب و غریب اثر پر جو مجھ پر ہوا اتفاقاً غور کرتا رہا۔ سب سے نمایاں یہ احساس تھا کہ مصنف نے گھوڑ دوڑ اور متعلقہ شرط بازی، اور اس کے الم ناک نتائج پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اسی وجہ سے افراد تصدیقاً ابھرے نہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اگر ان سے ان کی زندگی کا ہلکا جُدا کر دیا جائے تو بھائے خود وہ کوئی نمایاں یا ناؤر شخصیت نہیں رکھتے، اگرچہ ہیروئن کی سیرت مصنف کے فائز مطالعہ زندگی کا نتیجہ تھی، پھر بھی پڑھتے پڑھتے یہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی سیرت کی عظمت کا رعب مجھ پر چھا جائے۔ بلند سیرتوں اور ان کی زندگی کے عظیم واقعات کے بیان میں جہاں کسی موقع پر کسی کشمکش کی بدولت ان کی ہستیاں بہت بلندی حاصل کر لیتی ہیں، پڑھنے والے پر عموماً ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس کے دل میں ایک ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت اس ناول سے مجھے محسوس نہ ہوئی۔ کتاب متعدد جگہوں پر مؤثر تھی، مگر وہ بات نہ تھی۔

یہ سوچ جی رہا تھا کہ شہ پر ہوا کہہ کر تاریک سا ہو رہا ہے، اور تھا بھی اونہی باہر نکلنے سے معلوم ہوا کہ آفتاب غروب ہوئے کہے مشرق کا شمسوار اپنے سنہرے جلال میں رخصت ہو رہا تھا میں کچھ دیر گیلری میں کھڑا رہا مگر شام کی طرہتی ہوئی خاموشی افسردگی نے کوئی تازگی بخشتی ہوئی ہلکی ہلکی ہوا چلی ہی تھی جس سے مانتے کو ایک خوشگوار ٹھنڈک محسوس ہوئی مگر دل تھکا ہوا سا تھا۔ اس لئے کمرے میں لوٹ آیا اور چراغ جلا کر کتابوں کی الماری کے پاس اکھڑا ہوا۔ ایسے لئے مطالعہ یا کسی حسین شے کے تصور کے بعد اگر کوئی دلچسپی ہے۔ تو اپنی کتابوں پر نظر ڈالنا ہے گھینٹوں پر دن تو نہیں مگر منوں نقطہ نظر سے پڑھنا، اور لطف اٹھانا رہتا ہوں چنانچہ اس موقع پر بھی شیٹل عرصہ تک باسو پتا تھا کہ کونسا ناول پڑھوں۔ پھر خیال آیا کہ متواتر کئی دنوں سے ناول پڑھ رہا ہوں۔ کوئی مفید علمی کتاب نہیں پڑھتا یہ بہت بری بات ہے چنانچہ فیصلہ کیا کہ ایک مختار تاریخ، یا سیاست یا سائنس کی کتاب مطالعہ شروع کر دینا چاہیے۔ اوپر کے تختے پر نظر دوڑائی۔ وہاں نقطہ محسوس "ان اپنی"۔ رات کا وقت تھا میں نے سوچا کہ ایسے مضامین ان کے لئے ہوتے ہیں۔ رات کو کوئی ملائم سا اور لیکن مضمون ہو تو پڑھا جائے۔ آخر داعی اذیت سے بھی تو کوئی فائدہ نہیں اس لئے ایک پل کے لئے خیال ہوا کہ نظر پڑھوں، ایک دیکھتے دیکھتے لمحے کے لئے ایک سے زبردست محسوس ہوا مگر پھر اس کے لئے بھی صبح کا وقت ہی ہو تو دن بھر ایک پل کے لئے خیال ہوا کہ شام کا طویل ڈرامیک ڈراموں ہی پڑھ لیا جائے مگر پھر سوچا کہ شام تو ناول سے بھی دلچسپ ہوگا اور پھر وہ کافی محسوس ہوگا کہ کچھ ناولوں کا کفارہ

ادا کر سکے۔ اس لئے تطفی فیصلہ کر لیا کہ تنقید کی کوئی کتاب پڑھی جائے چنانچہ ایسبرک ایسے کی ایک نکال لی اولہاماری کو بند کیا کتاب لئے ادھر بٹھا اور اس کی دہن گردانی شروع کی مگر جہاں تک مجھے خیال ہے میں ساتھ ہی بیچ رہا تھا کہ مصنف نے اگر اپنے نظریہ کی توضیح اور تشریح کے لئے نظموں کے آئینہ سبابت لئے ہوں تو خوب لطف ہو مگر مجھے ایک خفیت سامدہ ہوئی جب یہ دیکھا کہ اگر حوالے لئے ہیں تو انگریزی شاعر کے نہیں بلکہ انانی بلاطینی شاعر کے ہیں مگر ساتھ ہی کتاب کے کچھ فقرے ہونے کا یقین ہو گیا۔ اب خیال ہوا کہ منسل ضرور ہا قدیس ہونی چاہئے تاکہ بوقت ضرورت نشان لگنے میں تکلیف نہ ہو اس لئے منسل کے لئے میز کی دراز رکھ لی پہلے حضور سی کیونکہ خیال تھا کہ منسل پاس ہی پڑی ہوگی مگر معلوم ہوتا تھا کہ ہٹنے لگانے سے کہیں ادھر ادھر ہو گئی ہے۔ اس لئے دراز کو اور باہر کھینچا اور کاغذات اٹائے پلاٹے مگر نہ ملی۔ دراز میں بہت سے کاغذات تھے، دو سونوں بھائیوں کے خطوط اور اخباروں کی کاٹیں ڈائری، نوٹ بک اور دیگر شیا ہوا چکا کہ یہ بے ترتیبی کسی حالت میں جائز نہیں چلوانے درست کر دو۔ پہلے کاٹوں کو علیحدہ کیا۔ ایک طرف دو ایک کاغذ نظر پڑے جو اشتہار کی غرض سے مغربی زمین مفت بھیج دیتی ہیں۔ انہیں ایک طرف کی خطوں کو چھانٹا۔ چند ایک کو غیر ضروری سمجھ کر بھاڑ دیا۔ باقیوں کو ایک کونے میں لٹک دیا ایک ان میں ایسا بھی تھا جسے دوبارہ پڑھنے کو جی چاہا۔ اس لئے اور کام چھوڑا اسے اٹھا کر شروع سے آخر تک پڑھا۔

لٹانے اور بہتر ترتیب سے ایک جگہ رکھے کہیں سے اپنے کتب فروش کا بل لکھ آیا اسے رکھنے میں بہت الجھن ہوئی جی تو چاہتا تھا بھاڑ دوں مگر پھر ایک کونے میں کھڑی دیا۔ مجھے اکثر اس کی یاد دہانیوں کی وجہ سے بہتہ فضا آکر تھابے اور اب بھی بہت آیا مگر یک دم میں شغل ہوا۔ اس دیکھا جہاں میں ایک فوٹو فریم ہانڈ آگیا، یہ فریم سلولائیڈ کا بنا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف انگوڑی ہیں ابھری ہوئی تھیں۔ انگوڑیاں سی سنگ کے تھے۔ البتہ بیل سنہری تھیں یا آدیا کہ یہ فریم ایک دست نے چھ سال ہوئے دیا تھا کسی دفعہ گم ہوا پھر مل گیا اسے کھڑا کرنے کے لئے پشت پر جو سہارا لگا ہوا تھا وہ تو کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔ اس لئے جتنی قضا دیکھتے پاس ہوتی تھیں۔ اسی میں رکھ دیتا تھا۔

سب سے اوپر جو تصویر تھی وہ خاص طور پر اچھی نہیں تھی۔ ایک دست نے دت ہوئی کھینچی تھی۔ اس میں چار ہم عمر لڑکے ایک ٹوپ پر بیٹھے تھے۔ ان میں ایک میں بھی تھا مگر بہت تھا سا۔ اپنی تصویر دیکھ کر جیران سا ہوا کہ کچھ سال پہلے کتنا مخمخی سا تھا۔ اس لئے تصویر پسند نہ آئی۔ اسے نکال دوسری تصویر دیکھنے لگا۔ یہ ایک جوان لڑکی کی تصویر تھی، جو ایک بھولانے والا ٹی پیٹنے بید کی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ بالوں پر ایک فیتہ بندھا ہوا تھا چہرے سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ اس لئے اس میں کوئی خاص دلکشی معلوم نہ ہوتی تھی۔ کچھ عرصہ اسے دیکھتا رہا مگر تصویر بروکھی روکھی سی تھی۔

اس کے بعد ایک اور تصویر نکلی جس میں دہی لڑکی اپنی ہن کے ساتھ کھڑی تھی۔ اور کھڑا رہی تھی تصویر سے اس کا تبسم جین جین کر دل میں اترتا جاتا تھا کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا کہ آنکھوں میں جب ہوا جاتا تھا کسی منٹ اس تصویر کو دیکھتا رہا مگر کوئی بات یاد نہ نہ ہوتی۔ دل کی حرکت بھی نہایت پر امن رہی اس کے بعد فریم سے ایک پشما جو پرانہ سماں ہوا

ایک پرانے کاغذ کا تہ شدہ پرزہ! اتنا پرانا بھی نہیں مگر پھر بھی یوں معلوم ہوتا جیسے صدیاں ہی گزر گئی ہیں۔ کاغذ کا مضمون مجھے یاد تھا۔ یاد ہی نہیں تھا بلکہ کبھی بھول ہی نہیں تھا۔ الفاظ تو انگریزی میں تھے مگر ان کا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے اس کے ساتھ ایک بڑبڑاتی لڑکی کا سر ددل 'پٹا آتا ہے، خدا جانتا ہے میں تمہارے لئے اتنی افسرہ ہوتی ہیں مایکے والی بہن! یہ کبھی سے پاس آیا، اور کیسے، اور یہ اس کے کیا معنی ہیں یہ ایک انسان ہے میں نے وہ پرزہ کھولا اس میں ایک نئی سی تصویر تھی۔ ایک بچہ لمبی اور کوئی نصف انچ چوڑی ہوگی۔ اس میں ایک لڑکی کا نہایت خوب صورت اور اتنا تھا معلوم ہوتا تھا کسی گرد پیں سے تصویر کاٹ لی گئی ہے میں نے اسے غور سے دیکھنا شروع کیا۔ یہ اسی بچہ لدا راجہ والی لڑکی کی تصویر تھی۔ مگر کیا تصویر تھی جس طرح ایک نہایت میٹھے رنگ کو سن کر دل میں ایک شیریں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے یا جیسے کسی باغ میں ایک آراستہ اور رنگین پھولوں کے تنے کو دیکھ کر ایک دم آ جاتا ہے۔ ویسے ہی اس چھوٹی سی تصویر پر کو دیکھ کر میرے دل نے ایک ملائم سی گرمی محسوس کی شاعر فطرت کے لٹا ہے، پرندوں کے گیت، شمع کی پرسرور خوبصورتی، عورت کا سراپا بیان کرتے ہیں، مگر جو نشہ، جو لطف، جو لذت اُن کی نہیں ہیں مگر میرا دل جانتا ہے۔

بہت سے سال گزر چکے ہیں۔ ہندوستان بڑا ملک ہے۔ وہ کہیں کی کہیں ہیں، مگر وہ ہنسی مجھے نہیں بھولتی۔ میں اپنی زندگی کے اس واقعہ کو بھول چکا ہوں، مگر میرے دل کے تاریک گوشوں میں ان کی وہ ہنسی ابھی تک روشن ہے۔ مجھے اب بھی یاد پڑتا ہے۔ کہ جب وہ بنا کرتی تھیں تو میں سوچا کرتا تھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ بھی کوئی حسین شے ہوگی! میں کسی جگہ پھرا ہوں۔ کئی حسین چہرے دیکھے ہیں! کئی ایک کو ہنستے بھی دیکھا، مگر میں نے وہ آب و تاب وہ جھلک کہیں نہیں دیکھی۔ ان کا حسن صبح تھا، اور ہنوت گلانی تھے، ہلکے گلانی اور نرم، اتنے نرم کہ دیکھنے ہی سے نرمی کا احساس ہو جاتا تھا۔ مگر جب وہ ہنستی تھیں۔ تو سوسائے اُن کے دانتوں کی چمک اور ہنسی کے شمار آگئیں اثر کے کچھ محسوس ہوتا تھا نہ تھا کہ لوگ ہنسی کو سردیوں میں سورج کے یکدم بادلوں سے نکلتے پارات کو کچھ بڑی کے چلنے کو شبید دیتے ہیں۔ مگر جب تک انہیں نہ دیکھا تھا۔ یہ نشیماں بالکل بے مزہ اور بیکار معلوم ہوتی تھیں۔

اور یہ تصویر کتنی قدر دلکش تھی۔ کتنی سیاری تھی۔ ان کے سر پر درپشاؤں کا ڈھکا ہوا تھا۔ اور بال کچھ بکھرے ہوئے اور اب جو میں سوچتا ہوں۔ نوک ان کے بال بکھرے ہوئے نہیں ہوئے تھے، اور چہرہ نہایت ہوا۔ اس کا ان کا سارا دکھڑا چھل کی طرح کھلا ہوا نہ تھا۔ آنکھیں کیا اور نہ سار کیا سارا چہرہ گفتہ تھا۔ اور یہ تصویر کتنی نشتوں کے بعد اور کب ملی۔ جب میں لاگتا تو وہ کہیں۔ یہ میری سیلیوں کا گرد و پ ہے خراب ہو جائے گا میں کیسے کاٹ دوں۔ اور پھر کس طرح بنانے لگی!۔

وہ دن بھی اور دنوں کی طرح ایک دن تھا۔ دھوپ تھی، ہوا تھی، مگر خدا اور میں تھا۔ ان کی بہن نے مجھ سے کہا۔ تمہیں ایک خوشخبری سناؤں۔ میں کتاب پڑھ رہا تھا میں نے کہا کیا ہے آپا جان، کچھ لکھیں۔ اچھا تم بوجھو، میں

نے کہا۔ توبہ خوشخبری ہے کہ بھارت ہمارا ساتھ ہی اس موقع پر جب کتاب دلچسپ ہو رہی تھی۔ ان کے آنے سے کڑھا۔ مگر یہ سن ان سے عمر میں بڑی تھیں۔ میں کہ کیا کہنا خوشخبری سننے کے انتظار میں کتاب کو بند کر دیا۔ مگر وہ مجھ سے ہٹ کھڑی کے پردے درست کرنے لگ گئیں۔

بران کے مکان کا واقعہ ہے میں دودن کے لئے ان کے ہاں یہاں تھا۔ ان کی والدہ میری بھوپھی تھیں۔ صبح چار کے بعد کتاب دیکھ رہا تھا۔ کتاب بھی وہ اپنے کلمہ کی لاٹری بری سے لائی تھیں۔ اسکو والڈ کی اسپائنس آف بی انگ ارنسٹ، مٹی میں زبان کی گفتگو کی چاشنی سے لطف اٹھا رہا تھا۔ دنیا دہیہا سے بے خبر تھا۔ اگر کسی خوشخبری کے لئے کتاب سے جدا ہونا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر ان کی بات سننے کے لئے ایک شائق اور چاک چوند سامع چاہتا تھا۔ اور ادھر صبر میں ایک دلچسپ کتاب سے زبردستی علیحدہ کیا گیا تھا۔ اسلئے انہیں میرا استغاپسند نہ آیا۔ پردوں سے ہٹ کر وہ میز کی چیزیں درست کرنے لگ گئیں۔ اب انہیں انتظار تھا کہ میں پوچھوں، مجھے لگن تھی کہ وہ چاہیں تو کتاب پڑھوں۔ میز کی آرائشی دقت تو وہ گویا بھول ہی گئیں کہ کیا بات کہنی تھی میں نے کتاب کھول لی۔ اس پر انہوں نے کہا۔ ”تم بھی ایک ہی ہو“ اب مجھے کچھ کہنا ہی پڑا۔ تو آخر نبیائے نادہ بات کیا تھی؟

”سکینہ کی منگنی ہو گئی ہے“

”آجھا! آجھا! میں نے یہ اتنا کہا۔ اور بس۔“

تعب یہ تھا کہ میں نے ابھی تک سختی سے اپنے جذبات کا مطالعہ نہ کیا تھا۔ اور مجھے ان کی گہرائی کا کچھ اندازہ تھا۔ بلکہ یہ بھی صحیح علم نہ تھا کہ ان میں صداقت کتنی ہے۔ شروع شروع میں تو موقع ہی نہ تھا۔ مگر بعد میں بھی میں نے صورت حالات تسلیم کر لی تھی۔ اپنی سریر طبعی کا مجھے پتہ تھا۔ اور چونکہ ایسے تاثرات سراب صفت نظر آ رہے تھے میں ناپید ہو جایا کرتے تھے۔ اس لئے میں نے حسب نفس کی طرف توجہ نہ دی تھی چنانچہ اس خبر کا فائدہ ہر مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ ہاں یہ بات مجھے یاد ہے کہ اس خوشخبری کی تمہید اور اسے مکالمہ اور کتاب کی لچکی نے جو بے جا اشتہار چہرے کو دے رکھی تھی۔ وہ ایک سخت موقوف ہو گئی جیبت ہے کہ اس امر کا احساس کیوں مجھے فوراً ہو گیا۔ مگر یہ سچ ہے کہ آپاسے بائیں کرتے وقت جو شکن کالوں پر پڑ گئے تھے۔ شاید میں کرا رہا تھا یا کیا۔ ان کا مجھے فوراً احساس ہوا۔ کہ وہ بے محل ہیں۔

میں نے کتاب اٹھالی۔ مگر اب آپا شروع ہو گئی تھیں۔ اس لئے میں سننا گیا۔ وہ ڈپٹی ہے۔ اس کی زمین بھی ہے۔ ٹھیکہ پر دے رکھی ہے۔ لاہور میں کوٹھی بنوا رہا ہے حال ہی میں موٹری ہے۔ باپ نہیں ہے۔ ایک بہن ہے۔ اور وہ بھی بیباہی ہوئی بہت ہی اچھا رشتہ ہے چچا جان نے رشتہ دہندہ بنا ہے۔ وغیرہ اور وغیرہ۔ اتنے میں آپا چپ ہو گئیں۔ مجھے یونہی سا احساس ہوا کہ وہ بھی کمرے میں وجود میں ہیں نہ ہٹ کر

دیکھتا تو اس دروئے میں جو سافہ کے کمرے میں کھٹنا تھا۔ وہ کھڑی تھیں۔ اور ان کا چہرہ خشک سا تھا۔ میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ میرے جذبات کی عکاسی کر رہا ہوگا کیونکہ وہ یکدم مسکرا پڑیں۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ اس مسکراہٹ سے مجھے تکلیف ہوئی یا خوشی مگر جو اب مجھے مسکراتا ضرور پڑا۔ پھر سب بیٹھ گئے۔ کچھ دیر چپ رہے۔ اب بات کون شروع کرے۔ میرا بولنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ یونہی بدن سست سا پڑ گیا تھا۔ مگر وہ موجود تھیں میں نے ناچار ان سے پوچھا۔ آپ نے یہ دراما پڑھا ہے؟ مگر اس کا جواب انہوں نے اس بے انتہائی سے دیا کہ میں پھر نہ بولا۔ آپ نے دو ایک باتیں کیں مگر میں کسم کسم تھا۔ جوں جوں وقت گزرنا جاتا تھا۔ میری طبیعت کی گرائی بڑھتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ آپا آکتا لگیں۔ اور انہیں سافہ کے کسی کپڑے کی بیونت کی فکر میں چلی گئیں۔

ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ مگر میں نے کتاب کے مطالعہ میں دو صفحات سے زیادہ ترقی نہ کی تھی۔ دماغ کے کسی پردے میں الفاظ کی جڑبگی اور ظرافت کا احساس تھا۔ مگر کتاب پڑھی نہ جاتی تھی۔ اس سے یونہی پڑا سوچ رہا تھا۔ پریشان خیالات کھلے پھر رہے تھے۔ ان میں کوئی ربط نہ تھا۔ مجھے یہ باتیں یاد ہیں۔ کیونکہ ایک مدت کے بعد اس دن میں نے اپنا مطالعہ کیا تھا۔ اگرچہ کچھ غنودگی سی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ مگر یہ سب باتیں کچھ عجیب طرح سے دماغ پر نقش ہیں میں نہیں کہہ سکتا کب تک ایسے ہی پڑا رہتا۔ مگر ایک لحظہ میں چونک پڑا۔ درباری دروازے کا پردہ ہلا اور وہ اندر آگئیں۔ اب کی انکا چہرہ افسردہ تھا۔ اور ان کے ہاتھ میں ایک پٹیا سپا پرزہ تھا۔

فیاض محمود

ترازا بھول میٹھا مری سب نیا زندگی
تری نرم ناز ظالم ہے عجب طلسم حیرت
غمر آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
بغور در دل ربائی یہ یقین دل پسندی
کہ جہاں ہے جیسے دل کو سرخدرت پسندی
مری ہمتوں کی بستی مرے شوق کی بلندی

ڈھونڈتی ہیں جسے مری تھیں
کوئی اُس سا نظر نہیں آتا
جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

اے غائب از نظر بہ خدای سپارست
تا با بیدم شدن سوئے ماروت با بلی
جانم بسوختی تیر دل دوست دارست
مدد گو نہ ساحری بکشم تا بیا رست

مختل ادب

ایک نظم

میں نظم لکھ چکا۔ اس کے الفاظ کیسے آسان کیسے خوبصورت ہیں۔ اس کی زبان کیسی پیاری ہے۔ اس کے جذبات کیسے بلند اور پاکیزہ ہیں اسے میری جی پی نے بھی پسند کیا ہے۔ اور مجھے تو خواب بھی اسی کے آتے ہیں۔ یہ نظم نہیں نظموں کی طرح ہے لیکن اب کیسی بلند مرتبہ سالیہ شائع ہو جائے۔ تو لوگوں پر بھی میری عظمت آشکار ہو۔ سمجھتے ہیں مہولی آدمی ہے چونکہ اٹھیس گئے رملے شہر میں شور مچ جائے گا۔ اب میں شاعر ہوں۔ پہلے صفحہ پر شائع ہوگی۔ آئندہ ماہ ایڈیٹر صاحبان تصویریں مانگیں گے۔

مگر انفس ایڈیٹر موقوف نکلا۔ اس نے میری نظم ٹوٹا دی۔ بالکل احمق ہے شعر و شاعری کی قدر کیا جانیے۔ امیر باپ کا بیٹا ہو گا۔ ایڈیٹر بن بیٹھا۔ مگر اس سے ادب شناسی کی قابلیت تو پیدا نہیں ہوتی۔

چلو خود شائع کر دیں۔ یہ بھی کیا یاد کئے گا کسی شاعر سے بلا ٹیڑھا ہوی کا ایک بوز بیچ دیں گے اور کیا۔ میرا خیال غلط نکلا ساری دنیا بھی اندھی ہے نظم شائع ہو گئی لیکن بازاروں میں لوگ اسی طرح خرید و فروخت کر رہے ہیں۔ تختہ پلیر سی طرح جھبے پڑے ہیں۔ دوکاندار اسی طرح دوکانوں میں بیٹھے ہیں کسی کو پروا نہیں کہ میری نظم شائع ہو گئی یا نہ ہو گئی۔ ساری دنیا بیوقوف ہے۔ اگر کاہل داس زندہ ہوتا تو آج اُسے مینڈ نہ آتی۔ اگر تلمی داس زندہ ہوتا تو آج اُسے پرمانت پڑے۔ کیا کرنا بھول جاتی۔

چندن کجاوہ رتنا کر پونا (مرہٹہ)

میر مہدی مخرج دہلوی کا ایک خط

از ہدی ۵ فروری ۱۸۸۲ء

شاہ عالی کو میر مہدی مخرج کی طرف سے سلام دو عادوں پہنچیں سلام اس لئے کہ محمد دم بلدے ہو دعا اس لئے کہ بھائی کرلمت حسین ہمدانی مرحوم کے بیٹے ہو۔ استاد غالب مرحوم کے زمانے میں شعر و شاعری کا جو چہا تھا اس کا حال کیا لکھنا اگلی صفحین جو یاد آتی ہیں تو آنکھ سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑتا ہے۔ اس زمانے میں تلخہ علی میں شاہی ہتھم سے شاعر سے ہوا کرتے تھے مخصوص اشخاص کو شرکت کی اجازت ملتی تھی۔ بادشاہ اور دربار بعد دونوں شعر گوئی کے دلدادہ تھے۔ بادشاہ و تشریف لاتے تھے اساتذہ وقت کے علاوہ دوسرے مشہور شعر گو بھی باریابی کا موقع ملتا تھا جب کسی لہیر و تیس کے صاحبزادے جرنیت شاعر (میر مہدی)

میں آتے تھے۔ تو سب سے پہلے بادشاہ سلامت کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اور پھر وہ اپنا کلام سناتے تھے۔
 استاد غالب مرحوم اپنی زندگی میں دوبار کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ مندرجہ ذیل شعاریں انہوں نے اپنی غریب وطنی
 کی حالت اور اہل کلکتہ کی ماضی کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

لے زبیاں ایں سوا غنیمت لے فراہم شدہ نعمت اقلیم بظلم رسیدہ استنایں جا بہ امید آرمیدہ استنایں جا
 اسد اللہ بخت برگشتہ در غم و غم بجز سرگشتہ اس وہ در کم کار سازی کو شبوہ پیمان نوازی کو
 گرچہ ناخواندہ میمان شہادت ہے سخن یزید چہین خوان شہادت باسن آخیش کم و کس مرتفع دریغ من خیل تاجنیں دریغ دریغ
 استاد مرحوم کی اصلاح بہت دیر پہنچی تھی ایک بار خواجہ الطاف حسین حالی نے بیشتر کھا تھا۔ عالی سے

یارب اس اختلاط کا انجام ہو گا کیا ؟ تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہ
 میرا خیال تھا کہ شاید اس پر اصلاح نہ ہوگی۔ مگر حضرت نے پہلے مصرعہ میں صرف ایک لفظ ایسا رکھ دیا جس
 سے شعر کا عالم ہی کچھ اور ہو گیا۔ دیکھو کیا اچھی اصلاح دی ہے۔

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بھیگا ؟ تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہ
 "انجام ہو بھیگا۔ اس ٹکڑے کا کیا کہنا ہے۔ ہائے استاد مرحوم اب کہاں۔ اللہ بس باقی ہو۔" (ص ۱۶)

مالی سے

اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!!
 میں نے ابھی آنکھ کھول کر دنیا کو نہیں دیکھا۔ ابھی تک میری خوبصورتی دنیا کے سامنے نہیں آئی۔ ابھی تک
 میرا چہرہ طفلی کی مومنی سے محروم ہے۔ اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!
 مجھے تیرا دندہ بولے بھی ڈر لگتا ہے، پانی کی بچھاڑ سے بھی ڈر لگتا ہے۔ مجھے دھوپ سے بھی ڈر لگتا ہے مجھے چھاؤں
 بھی ڈر لگتا ہے۔ اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ۔

میں چاہتی ہوں سکھوں سے ملوں۔ آہستہ آہستہ ہوا میں قص کر دوں اور دنیا کے سرسبز دشاو اب مناظر دیکھوں
 اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!

طغی کا زامہ پھرنے لگا۔ بیڑی جلدی بیت جاتا ہے اور بڑی دیر میں بھولتا ہے۔ اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!
 وہ دیکھ میرا شباب! انکھیدیاں کرتا ہوا آڑ لے۔ وہ میری قدر و قیمت لوگوں کی نگاہوں میں پیدا ہو رہی ہے۔
 وہ چاند کی کرنیں میرا منہ چوئے کو آسمان سے زمین پر اتار رہی ہیں۔ اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!

ابھی مہل نے میری شان میں گیت نہیں گائے۔ ابھی دیوتاؤں کے جسم نے میری خوشبوؤں میں غسل نہیں کیا۔ ابھی
 سورج کی مشاعروں نے منہ لگا کر گھٹ نہیں لٹا۔ اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ! (چندل کو الونگ پر بھاڑنگالی)

فہرست مضامین ہمالیوں

نمبر:- ۵

جلد:- ۲۱

بابت ماہ مئی ۱۹۳۲ء

تصویر:- نجات

صفحہ	صاحب مضمون	مضمون	صفحہ
۴۱۹		ساگرہ زہر کے متعلق رائیں	۱
۴۲۱		جہاں نند	۲
۴۲۳	عابد علی خاں	گریرہ (نظم)	۳
۴۲۴	جناب بی محمد علی صاحب ایم ایس سرج سکاڑچا، یونیورسٹی کن اسٹاک ایکسچینج، لاہور	اقبال اور سیاست	۴
۴۲۶	جناب مولوی مقبول حسین صاحب مقبول بی اے	نیمین کشمیری (نظم)	۵
۴۳۳	جناب مسٹر قحقی علی صاحب یاسمی	مادھوری (افسانہ)	۶
۴۴۹	خاں بہادر سید محمد علی صاحب وحشت	غزل	۷
۴۵۰	رائے بہادر نیند نثر نرائن صاحب شیم ایڈوکیٹ ہائیکورٹ پنجاب	بدھ ادراک کلامت	۸
۴۵۸	جناب مولانا سید علی اختر صاحب اختر	اصلاح (نظم)	۹
۴۵۹	عابد علی خاں	عدنان (افسانہ)	۱۰
۴۶۲	ذوب	رخصت!	۱۱
۴۶۳	حضرت نشتہ جانہ دہری	اصلاح ادب	۱۲
۴۶۷	جناب سیفی دوکانوی	غزل	۱۳
"	جناب مولوی محمد علی صاحب کینی	"	۱۴
۴۶۸	جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چشتی ڈی. اے۔ ایل۔ ایل۔ بی	خانہٴ فسانہ	۱۵
۴۷۰	جناب مشر رام رتن صاحب مہط	خوائے مہط	۱۶
۴۷۵	جناب مشر عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے	اسلامی فن تعمیر پر ایک نظر	۱۷
۴۷۸	جناب لطیف انور گورداسپوری	غزل	۱۸
۴۷۹	جناب حافظ غلام سرور صاحب ایم اے ازپنانگ	اردو ادب اور میانہ روی	۱۹
۴۸۰		محفل ادب	۲۰
۴۸۲		تبصرہ	۲۱

ہمایوں کے سالگرہ نمبر کے متعلق رائیں

(۱)

(کپتان سردار سکندر حیات خاں صاحب ریونیو ممبہر)
جنوری نمبر جب سابق فیئر معمولی طور پر خوبصورت ہے اور اس کے مضامین بحیثیت مجموعی اس کے بلند معیار کے مطابق ہیں جس کی مثال اردو رسائل میں پیشکل مل سکتی ہے۔

(۲)

اس وقت میرے سامنے صرف ہمایوں کا سالگرہ نمبر نہیں بلکہ کئی دوسرے سالانے اور خاص نمبر بھی ہیں۔ *Armenial* نامیگزین انڈیا کا ادنیٰ رنگ خیال کا دیگر متعدد رسائل کے مختلف سالوں کے خاص نمبر ہیں۔ اس نے میری رائے مقابلہ ہوگی کسی خاص جذبہ یا رعایت کو دخل نہ ہوگا۔ عیاں دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا مردنی دیدہ زیب ہے میں توجہ بھی پرچہ اٹھاتا ہوں۔ ٹائٹیل کو دیکھتا ہوں۔ طباعت عمدہ مضامین کے لحاظ سے کسی خاص نمبر سے کم نہیں بلکہ اپنی ندرت کی وجہ سے خاص شان رکھتا ہے۔ یوں تو تمام مضامین اور نظمیں بہتر ہیں اور عام دیگر اردو رسائل کے مقابلہ کی ہیں لیکن اس بلند باگ دعا دی کرنے والے رسائل کی نہرت میں نہ آنے والے ہمایوں میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو اپنی ندرت اور وحدت کے لحاظ سے کسی مغربی جیدہ سے کم نہیں اب بھی انگریزی دال اصحاب و درجہ اذ کے مطالعہ کو تصنیف اوقات سمجھیں تو بیان کی مغرب زدگی کی علامت ہے۔ مگر نہ کلام ہمایوں، کام سنڈیس، تنذیب اور فلسفہ زندگی نہایت اعلیٰ چیزیں ہیں۔ کاش دام ہم رنگ نہیں اور زلف و خال کے شیدان نظموں سے سبق حاصل کریں اور قوم کے فوجانوں کے افلاق کی تفریب کے بجائے تعمیری کی طرف متوجہ ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں نظمیں انمول ہوتی ہیں۔ درناستہ ہیں۔ بالخصوص فلسفہ زندگی اور تنذیب تو مجھے بار بار متاثر کرتی ہیں۔ آپ میری رائے کی قیمت تب جانیں جب ان نظموں کا انگریزی میں ترجمہ ہو۔ اور یورپ والے بھی ان کا مطالعہ کریں۔ حضرت جوش بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ان کا خطاب شاعر انقلاب سمجھ ہے۔ اور آپ نے بھی فلسفہ زندگی بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ کام سنڈیس بھی اچھی چیز ہے۔ کلام ہمایوں تو نوادرات کے ہیں۔ ہمایوں ہینڈ توم کو عمل کا پیغام سناتا رہا اور مجھے بالعموم ان کی ایسی نظمیں مطالعہ کرنے کا موقع نصیب ہوا جتنی یہ ہے کہ انہوں نے پیغام پہنچانے میں کبھی غفلت نہیں کی لیکن

تنتنا اٹھا لوں میں بھی ذرا لطف گرہی اے رہنا مجھے مری قسمت پر چھوڑ دے

بار بار پڑھتا ہوں اور سر دھتلم ہوں اور ستیرہ رہ جاتا ہوں کس قدر عمدہ تخیل ہے۔ شریں بھی عمدہ مضامین

موجود ہیں تراجم کو چھوڑ کر اجتماعی زندگی پر ایک نظر اچھا مضمون ہے ہمایوں کا ہر سا لکھ نمبر ایک ایسے قیمتی مضمون سے مزین ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر تو آپ کو شاباش نہیں دے سکتا۔ کیونکہ شش ماہ کا تعلیم و تربیت کے نئے طریقے کچھ کم قیمتی مضمون تھا۔

فلک پیا صاحب کی فلک پیمانی ایک اچھی چیز لائی ناسا ہی ہوگی اگر نپولین اور اس کا خواب "توحید" تاریخ عالم پر ایک نظر کے مرتب مورخ ہمایوں کو (جو شاید منصوبہ کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ کے مصداق ...) اس محنت و کوشش کی داد دے دی جائے۔ بارہ صفحات میں تاریخ عالم کو لے آنا حیرت انگیز اور قابلِ تعریف کام ہے۔ یہ اپنی قسم کی واحد چیز ہے اور نہ صرف متنبروں بلکہ علمائے علم خود فضلہ کے لئے بھی مفید ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی مضامین اچھے نہیں وہ تو میں نے پہلے کہہ دیا ہے۔

المان نگہ تنگ دل گل حسن تو بس یاد

البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ آئندہ دسمبر کے پرچے میں مضمون نگاروں میں کسی ایسے صاحب کا نام نہ لکھ دیا کریں جو وعدہ پورا نہ کریں یا جس سے آپ مضمون (خواہ کسی وجہ) حاصل نہ کر سکیں کیونکہ ہمایوں ان چیزوں سے بلا ہے یہی مراد و سرشار اور ان کے افسانہ سے ہے۔ یہ دعاوی بلند نامک رسائل کی قسمت ہیں، میں مکمل رسالہ ابھی پڑھ نہیں چکا ورنہ دیگر خصوصیات یا اگر نقصان نظر آتے تو بھی ظاہر کرتا۔ اس کامیاب سا لکھ نمبر پر آپ کو دعا و عطا و امداد کو مبارک باد عرض کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا ہمایوں کو ایسی ہیسیوں سا لکھیں نصیب کرے

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کہ ہوں دن بپاس ہزار

عائد اور منصور اچھا کام کرتے ہیں۔ ہمایوں کے لئے ایسے ہی مدیروں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ عائد کا غم نصیب (افسانہ) اور عطاء میں عائد آج تک شاہوں کو بھی لایا نہیں۔ بے برگ و بے ساماں گدا اور اس پنودہ اور اس قدر غزل اور منصور کا کمید و کا منصور تجھے کبھی نہ بھولیں گے۔

(۳۲)

کل سا لکھ نمبر امید کے موافق مل گیا بھان امداد کے مضامین اور وجہ آفرین نظموں کی کیا تعریف کر دوں۔ خصوصاً عائد علی خاں اور جوش ملیح آبادی اور قبلہ گاہ جب ا صاحب کا کلام!

(۳۳)

رسالہ غور سے دیکھا شروع سے لے کر آخر تک دلچسپ تھا۔ ہر مضمون افسانہ۔ ڈراما نظم یا غزل یا *Requiem* کے الفاظ میں *from the pen of a modern* تھی۔

فضیالہ دین شمس ایب آباد

جہاں نما

گداگری کا مسئلہ

”ینگ سن آؤنڈیا“ میں مسٹر والٹر پی دارن کا ایک مضمون گداگری کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ امر تمدن دنیا کے لئے موجب صد تنگ و عدا ہے کہ تہذیب و تمدن کے اس ترقی یافتہ و دیرین ہندوستان میں بڑا ملک اس قابل نہ ہو کہ گداگری کے مسئلہ کے حل کے لئے کوئی مفید قانون وضع کر سکے۔

شمارہ اعداد کی کتابوں میں گداگری کی حد سے بڑھی ہوئی تعداد کے متعلق جو لرزہ خیز بیانات شائع ہوتے ہیں وہ اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ انہیں پڑھنے سے اربابِ حل و عقد کے دل اب اس طور پر متاثر نہیں ہو سکتے کہ وہ فرع انسان کے اس تعبر مذلت میں گرے ہوئے طبقہ کے مصائب کا کوئی ہمدردانہ حل تجویز کرنے کی تکلیف گوارا کریں۔ اس کا دامنِ حل یہ ہے کہ عوام میں اس کے متعلق تحریک کی جائے اور اس معاشری لعنت سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس قدر موثر اور پر جوش مظاہرے کئے جائیں کہ آخر بڑے بڑے لوگ اس طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ عوام کو پرزور طریقے پر اس حقیقت کی طرف توجہ دلانی چاہئے کہ بیمار اور محتاج گداگری ہماری محبت کے لئے ایک سخت خطرناک مصیبت ہیں۔ یہ طرح طرح کے روگی اور طرح طرح کے بیمار بقسمت لوگ تم قسم کے رہتے ہوئے ماسوروں اور مختلف النوع بیماریوں کے جراثیم لے ہوئے ہمارے بازاروں میں اگلی کوچوں میں اڑ گزر لگا ہوں اور شاہراہوں پر ادمر ادمر بیٹھے اور پھرتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اپنے متعدی امراض سے یہ ہمارے کھانے پینے کی چیزوں کو مہلک بنا دیتے ہیں۔ ہمارے مکان کے فرش پر ان کا ہر نقش قدم ہلاکت خیز جراثیم چھوڑتا جاتا ہے۔ اور جب ہمدے ملازم ننگے پاؤں دماں پھرتے ہیں تو ان کے ذریعہ سے یہ جراثیم ان دربوں، قالینوں اور خیموں پر پہنچتے ہیں جہاں ہمدے بچے کھیلنے میں ہمارے بچے مہموم بیمار رہتے ہیں لیکن ہم بیماری کا اصلی باعث سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہتے ہیں۔ ہم ہندوستان کی ناسانگہ گداگر آب و ہوا کو ملزم گردانتے ہیں اور ان لوگوں کو مطلق اس بیماری کا ذمہ دار نہیں ٹھہرتے جو عوام کی دی ہوئی طاقت کا دیانت دارانہ استعمال نہیں کرتے جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور مرض کے حقیقی علاج کی طرف توجہ دینے سے بالکل بے پروا ہیں۔

پیشہ ور گداگر ملک کے لئے ایک عذاب ہیں اور ان کا وجود عوام کے کندھوں پر ایک غیر ضروری بار ہے۔

جس سے نجات صرف قانون کی مدد سے حاصل ہو سکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ عوام کی خدات اور سادہ لوحی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ایسے گدگد اگر جو فی الواقع اپنا جائز کارِ رفتہ ہیں ان کی مدد کے لئے ضرور محتاج خانے قائم ہونے چاہئیں اور ان کے متعلق نہایت سخت قوانین وضع ہونے چاہئیں تاکہ انصاف کا منشا پورا ہو۔

شادی محبت اور مسرت

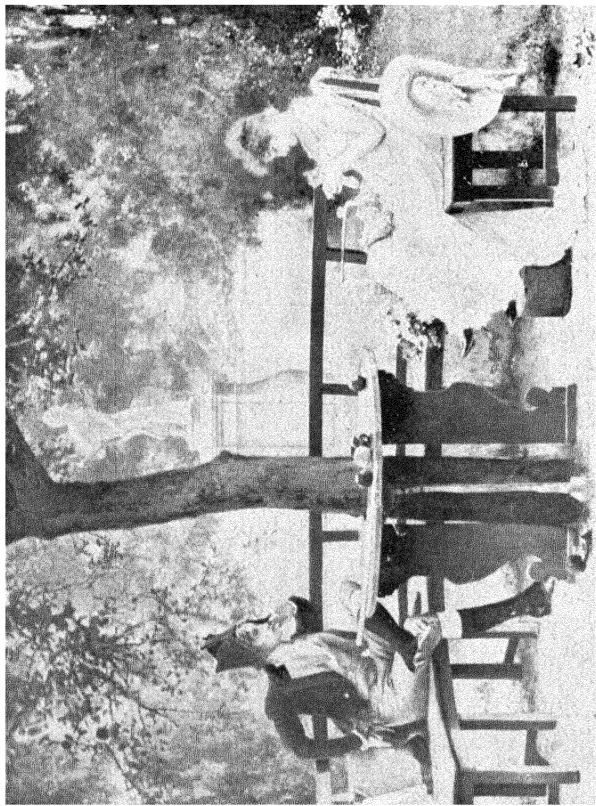
برٹریڈ رسل نے جنسی محبت "اور مسرت کے موضوع پر ایک مضمون میں لکھا ہے کہ آدم اور عورتوں کے عرصت کی ملاپ سزا کے نازل ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ جن میں تدریجاً مرد و عورتوں کا شواہد وہ کسی نہ کسی صورت میں اس فہم کی کافر یا بوس گرفتار عذاب ہیں اس لئے قانون میں جو چھتے ہیں کہ وہی بنائیں اس جذبہ کے طفیل انہیں زیادہ راحت ملی جو یا کلفت زیادہ گذشتہ میں مردوں کا عورتوں پر ہر طرح اقتدار مقام و طرح مختار تھے اور عورتیں مجبوراً ان دنوں نوجوان انسان کا صرف ایک حصہ عذاب میں نکالیں جو وہ مساوات کے عہد میں جب مرد و عورت کے یکساں حقوق کا غلغلہ بلند ہوا جو فرزند و دونوں ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں اور دونوں کی زندگیاں یکساں ناخوشاں ہیں برائے قصوں کا انجام ہمیشہ یہ ہوا کرتا تھا کہ اس کے بعد ان کی شادی ہو گئی اور وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اگر کراچ بھی لوگ اپنی زندگی کے فلسفے کا یہی انجام کریں تو جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ جس کی شادی کے کچھ بعد بعد یا ہوی اکتا جاتی ہے یا شوہر یا دونوں اس کا نتیجہ آخر کار طلاق ہوتا ہے بل نے لکھا ہے کہ میں نے لیڈیوں کے گھنگھو کے ہوتے بار بار یہ دیکھا کہ گھر گھبراہٹ کی شخص کا نام میں اتفاق سے لیا اس کے متعلق مجھے یہ بتایا گیا کہ وہ کسی نہ کسی وقت ان کا شوہر بچھا ہی یہ حال ان فرنا کہیں لیکن ان کا باعث یہ غلط خیال ہے کہ لوگ جنسی تعلقات کو مسرت کا موجب سمجھتے ہیں حالانکہ اگر وہ اس رنج کی توقع رکھیں تو شاید انہیں بعد میں اتنا غلاب نہ ہو اگر ہم حقیقت پر توجہ دلائیں تو ان کے حصار و بند زنجی وغیرہ کو اعتدال پر لے آئیں تو کتنی سکین آسان ہو سکتی ہیں جو وہ اپنے کی شادیاں نہ صرف عورت اور مرد کی مسرت کی مناسبت میں بلکہ ان سے قبل اطمینان کے بچے بھی پیدا نہیں ہوتے حالانکہ بحیثیت ایک معاشرتی نظام کے شادی کا یہ مقصد آج کل کے بچے کو نارواور کی طرح نہیں ہے اور ان کی پرورش اس قسم کے در زمانہ جن میں ہوتی ہے کہ وہ اچھی طرح پھلنے پھلنے ہی نہیں پاتے موجودہ زمانے کے اکثر مصائب کا باعث یہ ہے کہ لوگ روٹیک محبت کو شادی سے الگ نہیں سمجھتے حالانکہ وہ ایک مثالی اور شاعرانہ جذبہ ہے اور شادی ایک معاشرتی ضابطہ یا نظام وہ شاعری ہے اور حقیقت۔

انصوری، یہ ایک انگریز مصور ماکس سٹون (۱۸۵۸ء) کی مشہور تصویر ہے۔ اس قسم کی شاعرانہ مصوری کے کسی نفیس اور پاکیزہ نمونے اس کے موقع اور لطیف نمونے پیدا کئے۔ اس کی ایک تصویر پہلا محبت نامہ سٹاٹس چار ہزار پاؤنڈ میں کی گئی۔ اس مصوری کی تاریخی تصاویر بھی مشہور ہیں۔ مثلاً "واٹر لو سے پیرس کو" ہنری شہنشاہ اور این بولین "دنیہ موجودہ تصویر پاکیزہ نمونہ" و تصورات کی بہترین آئینہ دار ہے۔

گریہ

جلا کر شمع پروانے کو شب بھر آپ بھی روئی
 نہ بے جا اعتمادِ عشق ٹوٹنے آبرو کھوئی
 پنہیں سات آسماں چکریں ہیں، یارب یہاں کیا
 فغاں اک بے نوا درویش کی سُنتا نہیں کوئی
 جگانے والے روئے آسماں کو دیکھ کر برسوں
 جو سوتی بھی تو کیسی نیند اے تقدیر تو سوتی!
 مکڈرد دست سے ہو کس طرح، جس کی یہ حالت
 بُرائی دل میں دشمن کی، نہ لب پر اُس کی بدگوئی
 حقیقت کھل گئی شبنم چُڑن بے وفا تیری
 ادھر منہ پھول کا چُوم اُدھر جی کھول کر روئی

حامد علی خاں



عاشقی چیست بگو بند؛ جانان بودن دل بدست دگوت دادن : حیران بودن

اقبال اور سیاسیات

اقبال نے اگرچہ سیاسیات کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی لیکن اس کے باوجود اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اقبال کی تعنیفات سیاست کے بے شمار بلند حقائق سے لبریز ہیں۔ لیچرژن زبردست اور عامل قبول میں سے ہے جو قوموں کو ایک زبردست ذہنی انقلاب کے لئے آمادہ کر دیتی ہیں۔ اقبال کی شاعری کو صرف شاعری ہی کے نقطہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس حیثیت سے بھی اس پر نظر ڈالنی چاہئے کہ اس کا شاعری کے علاوہ ایک اور بلند تر مفہوم بھی ہے۔ اقبال کی شاعری اور سیاسیات باہم اس طرح ملی جلی ہیں جس طرح دانٹے کی شاعری اور فلاسفی کی سیاسیات۔

در دیدہ یعنی نگاہیں حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیغمبر تو ان گفت

اقبال ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوا جب کہ مشرق و مغرب میں زندگی اور اس کے مختلف شعبوں میں عجیب و غریب انقلاب نمودار ہو رہا تھا۔ مشرق کی جہاں گیریاں، جہاں ستائیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اور مغرب کی سیاسی فتح مندیوں کے قدم بقدم ذہن اور فکر کی فتوحات کا سد بھی بیڑا تھا۔ اہل شرق اور ملی المصنوع مسلمانوں کی آنکھیں مغرب کے روشن اور آنکھوں کو خیر و کر دینے والے تئیں سے چند حیاتی جابر تھیں۔ ہر سمت زوال، اور پستی کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ اور موجودیت کی حدیثی کہ ہر شعبہ حیات میں مغرب کی تقلید ضروری فرض بن گئی۔

اقبال اگرچہ استادانِ فزنگ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کر چکا تھا اور تندیب فزنگ کے فتاویٰ سے مدتوں تک ریاہ ہوتا رہا۔ لیکن اسے پیرانِ مشرقی کا نفیس صحت کہتے یا سعادت ازلی کی یاکوی اور سعادت کہ جس قدر یورپی افکار اور خیالات کے مطالعہ کا زیادہ موقع ملتا گیا اس کے ذہن میں مغربی انسان خیالات کے خلاف ایک شورش ترقی پکڑتی گئی۔ مغربی سیاست کے نظری اکسبات اور تجرباتی ادراک نے اقبال کو اس نظر فریب تہذیب کے دام میں پھنسنے سے بچا دیا۔ بگسار جس تہذیب ہر بڑے سپنر کے خیالات کا گہرا مطالعہ کرتا جاتا تھا اسی قدر اس کے دل میں مادیت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہونا جاتا تھا۔ اقبال بھی مغربی استادوں کی کتابوں سے جس قدر قریب ہوا اتنا ہی وہ ان نظریات زندگی سے بیزار ہوا جس سے وہ لبریز تھیں۔

مشرق کی اس پیچیدگی اور فکرِ جمیع کی اس دراندگی کے احساس نے اقبال کے نہاں خاندانِ دماغ میں خیالات

الوٹ، بیضون اسلاک، یسرج، انٹی ٹیٹ، ٹیٹ، ہٹام، اقبال ڈے کی تقریب پر چڑھا گیا تھا۔ داقم

کی ایک نئی بستی کی بنیاد رکھی جو اپنی ترکیب اور نوعیت کے لحاظ سے تو خالص اسلامی طرز کی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ شرقی و مغربی کے افکار کے آزادانہ مقابلے اور موازنے اور امتزاج اور اختلاط کے بعد تیار ہوئی ہے۔ یہ نیا فلسفہ سیاست جو اقبال کے نظموں سے دنیا میں پھیلا وہ صرف افلاطون، ارسطو، مکیاوی، بابس کانٹ اور روسکے علم ہی پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کی تیاری میں، نثران و حدیث، عراقی اور رازمی، ماوردی اور نظام الملک، ابن حزم اور ابن خلدون کے خیالات سے بھی مدد لی گئی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ عام انسانی تجربات نے بھی اس کی تعمیر و ترکیب پر خاص اثر ڈالا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اقبال کی سیاست کا ایک ایسے زمانے میں جب کہ مغربی انداز خیال بے حد مقبول ہے یورپ میں بلکہ خود ہندوستان میں زیادہ خیر مقدم نہیں ہوا لیکن ہمیں ہرگز یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اقبال جن خیالات کی تعلیم دے رہے ہیں۔ وہ ہوا اور رضا کے بالکل مخالف ہیں جنہیں وہ شاعر فردا لہونے کی حیثیت سے کل کی بجائے آج ہی ظاہر کر رہا ہے۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہو رہا ہے کہ ان تعلیمات کی صداقت کی بعض دلیلیں خود شاعر کی زندگی میں مل رہی ہیں اور دنیا اس نصب العین سیاست کی طرف خود بخود کھینچی آتی ہے جو اقبال کے نزدیک اصلی اور صحیح ترین نصب العین ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جہاں اقبال کا نصب العین تقریباً وہی ہے جو اسلام کا عین منشا ہے۔ وہاں خود مسلمان اس وقت تک طوفان مغرب میں اس قدر تیزی اور شدت کے ساتھ بہہ گئے ہیں کہ انہیں یہ نصب العین کچھ اجنبی سا معلوم ہوتا ہے۔

اقبال کے سیاسی فکر کا نشو و ارتقا۔ اقبال کے بعض مغربی معترضین، عام طور پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اقبال کا سیاسی نصب العین اکثر بدلتا رہتا ہے۔ اور اس کے افکار میں اوقات کے ساتھ تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اسراخودی پتھرہ کرتے ہوئے، انگریزی رسالہ "انٹینیم" کے ایک مضمون نگار سٹرن فارنر نے یہی کہا تھا کہ اقبال کا قدم کسی ایک راستے پر نہ رہے گا۔ اس اعتراض کی تائید میں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اقبال کسی زمانے میں ہندوستان کے جذبات سے مرعش ہوتا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر تصویر درد، ترانہ ہندی، انیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت جیسی قومیت آفریں اور وطنیت سے لبریز نظمیں لکھتا ہے پھر اُسے ہی عرصے کے بعد، اس کے خیالات میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس وطنی عقیدت سے بیزار ہو کر بلاد اسلامیہ ترانہ ملی، خطاب یہ جوانان اسلام، شکوہ، اور جواب شکوہ اور اس قسم کی سینکڑوں ملی اور خالص اسلامی نظمیں لکھتا ہے۔ اس اعتراض کی صداقت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اقبال کے سیاسی فکر کی پختگی میں ان تجربات کا حصہ کثیر بھی شامل ہے جو اُسے افضل و اطوار عالم کے عمیق مطالعہ سے حاصل ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اقبال ایک زمانے میں وطنیت اور قومیت کے امید اور حامی تھے۔ لیکن ان کے یہ خیالات زیادہ تر اس کتابی علم اور مطالعہ پر موقوف تھے جو انہیں مغرب کے ایسے مصنفین کی کتابوں سے حاصل ہوا جو عموماً قومیت اور وطنی خصیئت کو اپنے افکار و سیاسی کا جزو لاینفک خیال کرتے ہیں آج دنیا

کے اکثر ارباب علم یورپ کے نظریہ اور دل کو لہجائے دالے تمدن سے اس قدر متاثر نہیں کر یورپ کی ہرجوت کو قطع اور ہر خیال کو دھکی ناطق سمجھتے ہیں۔ جو خیال یورپ سے اٹھتا ہے۔ قبول کر لیا جاتا ہے۔ جو بات یورپ کی زبان سے نکلتی ہے مشرق میں اس پر درست اور بجا کا غلط بلند ہوتا ہے۔ مولانا شبلی فراہ گئے ہیں :-

نکتہ شرع با فائدہ برابر یعنی یورپ اگر پند زندان نیز مسلم باشد
 سچ تو یہ ہے کہ تہذیب و فکر کی تابانی کے سامنے بڑے بڑے خودی آشنا اور خود آشنا بھی آنکھیں نیچی کر لیتے
 ہیں۔ اقبال بھی چندے اس کے دام میں گرفتار ہوئے لیکن فلاسفہ مشرق کے گہرے مطالعہ اسلام اور مشرقی
 تمدن کی روح کے صحیح ادراک یورپ کے سفراء و تمدن مغرب کے قریبی نظائے نے ان کو بہت جلد اس کی تابانی سے
 بدظن کر دیا۔

دائے برسا دگی ماکہ فوشش خود دیم دہن نے بود کہیں کرد و رہ آدم زد
 یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اقبال نے جب تک یورپ کو نہ دیکھا تھا ان کے ذہن میں مغربی رجحان زیادہ تھا۔ لیکن
 جب یورپ کو نزدیک سے دیکھا تو ان کے خیالات میں مغرب سے دُوری پیدا ہو گئی جواب تک قائم ہے۔ اس کا مطلب
 نہیں کہ اقبال ماہو کے ہر جھوٹے کے ساتھ رائے بدل لیتے ہیں اور زمانے کے معمولی سے انقلاب کے ساتھ نیا رنگ
 گمانے لگتے ہیں۔ اقبال نے جب سے اپنے سیاسی افکار کے لئے ایک مرکز و محور تجویز کر لیا ہے اور گرد و پیش کی تمام مسائل
 قوتوں اور ماضی و استقبال کے تمام سیاسی اور تمدنی مسائل پر غائر نظر ڈال کر اپنے لئے دائرہ فکر معین کر لیا ہے،
 اس کے بعد ان کی ساری قوت، اُسی کی تبلیغ و اشاعت میں صرف ہو رہی ہے۔ زمانہ ہر لحظہ جو رنگ بدلتا جاتا ہے
 اور جو نیرنگیاں دکھلاتا ہے، اقبال ان پر اسی ایک زاویہ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں جو ان کے نزدیک معقول ترین ہیں۔
 تیس اور صحیح ترین زاویہ نگاہ ہے۔

اقبال کے سیاسی فکر کے مآخذ۔ اقبال کے سیاسی فکر کے نشو و ارتقا کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا
 ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنے چمن فکر کی آبیاری کے لئے کن کن سرچشموں کی جانب التفات کیا ہے اور ان کے تغیر
 کو موجودہ قالب میں جوھانے میں کون کون سے زبردست اثرات کار فرما ہوئے ہیں۔ مغربی نقاد اور بعض مشرقی
 دوست عموماً فرمایا کرتے ہیں کہ اقبال نے بہت حد تک ولیم بیک، نیٹشے اور برگساں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن
 ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے اس قول کی بنیاد صرف اس مفروضے پر ہے۔ کہ اقبال اور نیٹشے، یا اقبال اور
 برگساں ہیں، بعض معاملات میں اتحاد خیال پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف معمولی سی وحدت خیال اس
 امر کے لئے ایک محکم ثبوت نہیں بن سکتی کہ اقبال نے تمام تر خیالات ان فلسفیوں سے لئے ہیں۔ اس سے قبل
 ذکر کیا جا چکا ہے کہ اقبال بہت حد تک مغربی تحیل سے غور ہیں لیکن اس کے باوجود بعض مغربی مفکرین کے

ساتھ ان کا بعض معاملات میں اتحاد خیال ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا ایک خاص زاویہ بنگاہ ہے۔ جس کی روش انہیں نیٹھے اور برگساں کا انداز خیال پسند ہے جس کی وجہ سے اس کے کچھ نہیں کہ ان دونوں کے افکار میں اقبال کو اپنے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کی مزید توضیح اس بات سے ہو سکتی ہے کہ اقبال کو نیٹھے اور برگساں سے بعض اہم معاملات میں اختلاف ہے جو اصولی حیثیت رکھتے ہیں اور جنہیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جو لوگ اقبال کی کتابوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اقبال پر مولانا سے روم کا کتنا زبردست اثر ہے یہاں تک کہ وہ اپنی تازہ تصنیف باوجود نہایت مولانا سے روم کو اپنا اسی طرح رہنما تسلیم کرتے ہیں جس طرح دانتے نے درجل کو اپنا رہنما تسلیم کیا تھا۔ یہ بات بلاغوت تردید پیش کی جاسکتی ہے کہ اقبال نے پیر روم کے فکر و روش سے جس قدر روشنی حاصل کی ہے اتنی کسی اور گوشے سے انہیں دستیاب نہیں ہوئی۔

بیاض کس زخمِ سپید روم آورد ۴ سنے سخن کہ جواں تر ز باور و نہایت

البتہ یہ ضرور ہے کہ مشرق اور مغرب کے علوم کے استخراج نے، اقبال کو اپنے لئے ایک نئی اور مستقل شاہراہ اختیار کرنے میں مدد ضروری ہے عجمی فلسفہ اور نفوس کو مغربی دانش و حکمت کے معیار پر رکھا اور پھر ان کے مقابلے اور توازن سے ایک معتدل اور زندہ حکمت پیدا کی جس پر مغرب کے بجائے مشرق کا اثر زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ خود اقبال لکھتے ہیں:-

”مقام تا سفت ہے کہ مغرب اسلامی فلسفہ سے اس قدر نا آشنا ہے کہ مجھے اگر اس بحث پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کی فرصت ہوتی تو میں یورپ کے فلاسفہ کو بتلا سکتا کہ ہمارے اور ان کے فلسفہ میں کس بڑی حد تک اثر و اثرک ہے۔ پھر فرماتے ہیں:-

”میرا جو فلسفہ ہے وہ قدیم مسلمان صوفیہ و حکماہی کی تعلیمات کا مکمل ہے۔ بلکہ بالفاظ صحیح تریوں کو سنا چاہئے کہ یہ جدید تجربات کی روشنی میں قدیم متن کی تفسیر ہے۔“

اقبال کا پیغام سیاسی ہے یا اخلاقی؟ تمہیدی مباحث میں سے اب صرف ایک بحث باقی ہے جس کی طرف اشارہ کرنا یہ مد ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اقبال کو پیغام، ایک خاص سیاسی حیثیت رکھتا ہے یا اس کی بنیادیں اس سے بھی زیادہ گہری اور دقیق انسانی فطرت پر رکھی گئی ہیں؟ عام طور پر اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اقبال کا کلام تمام تر ایک بارعانہ سیاسی مفہوم رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے فلسفیانہ اشعار اور شعراانہ غزلیات کا مفہوم بھی سیاسی ہے۔ یہ بغول مضر کہ جسے ایک شگوبن غص ہے جو فساد، ہلاکت اور خونریزی کا پتہ دیتا ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ استعمار پسند یورپ جب مشرقی اقوام میں زندگی اور احساس کی معمولی سی علامت بھی کچھ پاتا تو اس کے جسم پر ایک ارتعاش کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کا ذہن مرعوب ہو جاتا ہے اور مشرق کی مظلومیوں کے زلزل کا تخیل ایک انتقام کا کاہوس بن کر اس کے دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے جب مشرق کو متحد ہونے کی دعوت دی تو یورپ نے اس جنبش اور اثر زندگی کو ایک خوفناک تحریک کی شکل میں پیش کیا اور خود ہی موہوم خطرے کی خیالی تصویریں بنا بنا کر، اس کو ایک معیوب صورت دے دی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا جاتا ہے کہ مغرب ان بخیروں کو ذرا زیادہ سخت اور گراں کر دے جن سے اس نے مشرق کی جانب ناواقف کو مکر طور رکھا ہے۔ نکلسن ہوں یا فائر سٹریٹ کو نکلسن انہیں مشرق سے ایک ایسی گونج سنائی دی جو فطرت انسانی کے عمیق اور پختہ ادراک پر مبنی ہے۔ جس کا اثر یقینی طور پر بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ مشرق زندگی کے اس احساس سے بہرہ ور ہوگا۔ جس سے غور میں ایک انقلاب پیدا ہونا بے مدلیقینی ہے اور جس کے اثرات دور رس اور جس کے نتائج ہم گیر ہوں گے۔ مغرب اپنی کم نگی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ اقبال کا پیام سیاسی ہے۔ لیکن یہ خیال اس کے محدود ادراک تخیل کی پیداوار ہے جس کا طول و عرض صرف "ادیت" ہے۔ حالانکہ اقبال کا منہ سنائے نظر باب تبتا کے ان تاروں کو چھیڑنا ہے جو ارضی نہیں بلکہ آسمانی ہیں جو صرف آب و گل اور مادہ کی بستی کو متاثر نہ کریں گے بلکہ روح کی اقلیم کو مسخر کریں گے۔ ان کا اثر حجازیہ اور تاراج کی زمینی حد بندیوں سے کہیں زیادہ قلوب کی پہنائیوں پر ہوگا۔ اقبال خود اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

"میں اس کشمکش کا جو مضمون لیتا ہوں وہ اصلاً اخلاقی ہے نہ کہ سیاسی۔ درآں حالیکہ بیشکے کے پیش نظر اس کا سیاسی نصب العین ہے"

پھر پیام مشرق کے دیباچے میں اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:-

"اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لایغیر بالقوم حتیٰ یغیرہ والما یغیرہم کے سادہ اور بلند الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اور میں نے اپنی فارسی تصنیفات میں اسی صداقت کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی ہے" اقبال نے جن اندرونی گہرائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان سے مراد وہ کچھ ل اور اخلاقی انقلاب ہے جو اقوام کے شعور کو تبدیل کرتا ہے اور ان کے ضمیر کو ایک ایسے قالب میں ڈھالتا ہے جس سے خودی کے رنگ نکلتے ہیں۔ اس کے لئے کشمکش کا عمل ضروری ہے اس لئے کہ وضاحت کے لئے میں یہ عرض کروں گا کہ اقبال نے مسلسل ادیبیم مغرب کے پھر اور تمدن

کی اس بنا پر مخالفت کی ہے کہ اس میں عقل "Intellectualism" اور مادیت کے عناصر اصولی اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے اقبالؒ اپنے تمام کاموں کی بنا عیشیت پر رکھتے ہیں اور اسی ایک چیز کو کائنات کی ترقی اور موت کا باعث سمجھتے ہیں۔ مغربی کلچر کے تمام شعبوں کے خلاف اقبالؒ کو جو تنکیت ہے وہ یہی ہے کہ اس کے تمام شعبے، اسی مرضِ مادیت و عقلیت کے جراثیم سے متاثر ہیں جن کی بدولت تہذیبِ یورپ کا وجود روز بروز کمزور ہو رہا ہے۔ مشرق جو خود فراموشی کے عالم میں ہے، جب انہی ہملک جراثیم سے متاثر ہوتا ہے تو اقبالؒ کو رنج ہوتا ہے۔ ان کے دل میں بیقرار سی اور اضطراب کے طوفان پیدا ہوتے ہیں۔ یہ طوفان کچھ تو اشکوں اور کچھ نالوں کی صورت میں زبان اور آنکھوں سے منظرستانِ عالم میں نمودار ہوتے ہیں۔ یہی تالے ہیں جو پیامِ مشرق، باگبگ درا، جاویدنا اور زبورِ عجم کا محسوس جامہ پہن کر بابر آتے ہیں اور دنیا کو متاثر کرتے ہیں۔ ان سب میں ہم اقبالؒ کو مغرب کی مادہ پرستی اور روحانیت سے بیگانگی پر ہیچ تباہ کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اقبالؒ کی نظر مغرب کے سیاسی استبداد اور ملک گیر مری پر بھی رہتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اسے مغرب کی روحانی ہلاکتوں اور اس کی تہذیب میں اخلاقی عنصر کی کمی دیکھ کر رنج ہوتا ہے اور اقبالؒ یہ دیکھ کر رنج میں ڈوب جاتا ہے کہ سادہ لوح مشرق بھی مغرب کے روحانی امراض سے متاثر ہو رہا ہے۔

غرض اقبالؒ کے پیغام کا مقصد دو گنا ہے۔ اولیٰ یہ کہ وہ مشرق کو اس روحانی بیماری سے بچائے دوم یہ کہ یورپ کو اس مرضِ ہملک سے آگاہ اور خیر داکر کرے۔

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ پیامِ مشرق کے بابِ نقشِ فسرنگ سے خوب واضح ہو گا جس کے کچھ اشعار یہاں لکھنا ہوں:-

ازمن لے باو صبا گوے بدانے فرتنگ	عقل تباہال کشودرت گرفتار زمرست
برق را این تجسگ سچ ز غلغلہ رام کند	عشق از عقل فسوں پیشہ مجر دار ترست
چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ	آنچہ در پردہ رنگ است پیدار ترست
عجب آں خیرت کہ اعجازِ میسیحی داری	عجب اینست کہ بیمار تو بیمار ترست
دانش اندوختہ دل ز کھنہ انداختہ	آہ ازل نقد گراں مایہ کمر دباختہ

زبورِ عجم میں فرماتے ہیں:-

بر عقل فلک پیما ترکا نہ شبینوں بہ یک ذرہ و در دل از علم فلاطوں بہ
یہ اور اس قسم کے ہزاروں اشعار، اسی ایک امر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ اقبالؒ کو یورپین کلچر کی روح سخت نفرت ہے۔ یہ نفرت لینن، ایچ۔ جی۔ ویلز اور بزنارکوشا کی نفرت سے جدا گانہ ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہنوز اس نسخہ شفا

کی تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ کاش مغرب اقبال کی آواز کو سن سکے لیکن اگر مغربیوں کو اپنی مہموم بلند اور تغاخر کا خیالِ باطل ایک مشرقی کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے مانع آئے تو پھر وہ اپنے ہی ایک ہموطن بگڑاس سے ان علالتوں اور پریشانیوں کا علاج دریافت کر لیں جو اقبال کی زبان میں یکہتا ہو سانی دے گا۔

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہامِ باطل است عطفے ہم رساں کہ ادب خوردہ دل است

اقبال کے فلسفہ سیاست کے اہم اجزاء

ان گذارشات کے بعد میں اقبال کے فلسفہ سیاست کے اہم اجزاء کی طرف توجہ کرتا ہوں۔

ایک کامل سوسائٹی۔ اقبال کا سب سے بڑا سیاسی خیال یہ ہے کہ وہ ایک زندہ اور ہمہ وجہ کامل سوسائٹی کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہے جو موجودہ قوانین، موجودہ انداز خیال، موجودہ جذبات اور ارادوں سے باطل جدا ہوگی۔ جس کے سب افراد، مافوق الانسان ہوں گے جو خدائے لم یزل کے زیادہ قریب ہوں گے۔ یہ نئی سوسائٹی، مساوات، اخوت، اور یک جہتی کا زندہ نمونہ ہوگی اور اس میں مادیت اور عقلیت سے پیدا شدہ خرابیاں بہت کم ہوں گی۔ اقبال کے خیال میں ایسی زندہ اور باعمل جماعت، کسی ایسے نظام کی بنیادوں پر اٹھے گی جو اپنے زاویہ نگاہِ مغربی اقوام کی طرح تنگ نظر اور کوتاہ بین نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا تصور، انسان اور کائنات کے متعلق زیادہ وسیع، زیادہ آزادانہ اور زیادہ روحانی ہوگا۔ اس وقت دنیا میں جس قدر ترقی پذیر نظام معاشرت و سیاست موجود ہیں۔ اقبال ان میں اسلامی نظام کو اپنے خاص نصب العین اور اپنے خاص تصور ملت کے قریب تر سمجھتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اقبال ایسے فلسفی اور مفکر کا کسی خاص جماعت اور قوم کو یوں سراہنا، بادی النظر میں اکثر لوگوں کو عجیب معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ یورپ اور ہندوستان کے بعض متعصبین کو اقبال کی یہ بات سخت ناپسند بھی ہوتی ہے چنانچہ مؤرخین فارٹر اور مکلس اس تصور پر بہت مین مین نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عیسائے خد اقبال اپنے ایک مقالے میں وضاحت فرما چکے ہیں۔ ان کا بیخیل کسی اندھی اور جاہل تقلید اور خوش اعتقادی کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ عملی سہولتوں اور نظام اسلامی کے اندر ترقی پذیر ممکنات کی موجودگی نے انہیں اس یقین پر مجبور کر دیا کہ وہ دنیا کے بے شمار نظام ہائے زندگی میں سے اپنی زندہ اور کامل سوسائٹی کی تعمیر کے لئے صرف اسلام ہی کو بطور نیا و عمل اپنے پیش نظر رکھیں۔ اقبال نے اپنی ساری تصانیف میں "ملت اسلام کو صرف اپنے ہی خاص زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور جانجا، اس قوم کو مستقبل کی بہترین قوم قرار دیا ہے۔ سب سے بڑی دلیل جو اس سلسلے میں پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں وسیع تر، انسانی برادری اور قوم کا جو خیال "ملت اسلام" پیش کیا ہے وہ کسی اور نظام اور گروہ میں نہیں ملتا۔ اسلام کی حدود بہت وسیع ہیں۔ اس کی مابینت غیر عمدہ و اور لا فتنہ ہی ہے۔ اس کا

وجود زمان اور مکان کی قیود سے آزاد ہے اور عیساکہ اقبال خود فرماتے ہیں "اسلام تمام مادی قیود سے بیزار سی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی قومیت کا دار و مدار ایک خاص تشریفی تصور پر ہے جس کی تعبیر فی کل وہ جماعت اشخاص ہے جس میں جتنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔" اسلام کی قومیت کا تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی۔ بلکہ اس کا اصل اصول مظاہر کائنات کے متعلق ایک ایسا اتحاد خیال ہے جو رب انسانوں کو ایک رشتہ و مدت میں پروں دے سکتا ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس کے ماتے والے افریقہ کی کالی دنیا سے متعلق ہیں یا ریگستانِ بلخا کے شجاع عرب۔ رنگا کی دادیوں میں سے والے آریا ہیں یا پامیر کے بلند کوہساروں کے مکین۔ کوئی زمینی قیدان میں تفرقہ نہیں ڈال سکتی۔ کوئی مادی جدائی، ان کو جدا نہیں کر سکتی اور کوئی نسل یا زبان کا امتیاز ان میں باہمی امتیاز کا باعث نہیں ہو سکتا یہی معاشری قانون ہے جس کی وسعت اور ہمہ گیری کا اقبال کو یقین ہے اور یہی نکتہ ہے جسے اقبال رب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

انہی خیالات کو اقبال رموزِ قیود میں اپنے دلکش انداز میں بار بار پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر کہ چونکہ ملتِ اسلام کا دار و مدار توحید و رسالت پر ہے۔ اس لئے مکان (Space) کے پختہ نگاہ سے وہ لا اہتہلجہ آپ فرماتے ہیں :-

جو ہر با مقابے بست نیست	بادۂ تندش بجائے بست نیست
ہندی چمنی سفال جامت	رومی دشامی گل اندامت
قلب از ہند و روم و شامت	مرز و بوم از بحر اسلام نیست
صورت ماہی بجسار بادشہ	یعنی از قید مقام آزاد شہ

اقبال کے اس خیال کا یورپ میں زیادہ خیر مقدم نہیں ہوا لیکن بایں ہمہ غصہ دیت، یورپ میں ایسے اہل دل موجود ہیں جو ان الفا کی درستگی کے قائل ہیں۔ مثلاً پروفیسر گرگوبے نے اسلام اور مسلمانوں کو بھونکتے ہوئے ان تمام امور کا اعتراف کیا ہے اور ان کے علاوہ بے شمار دوسرے اہل قلم نے اسلام کی اس برتری کا اقرار کیا ہے۔ ملتِ اسلام جس طرح مکانی لحاظ سے لا محدود ہے اسی طرح زمانی معیار سے بھی اس کی کوئی مقرر حد نہیں چنانچہ رموز میں لکھتے ہیں :-

گرچہ ہم ملتِ میر و مثلِ فردو از ازل فرماں پذیر و مثلِ فردو امتِ مسلم را بابتِ خداست اصلش از ہنگامِ قانوں علی

ان اہل ایس قوم بے پردہ تھے استوار انھن کو نہ تھے شعلہ مائے انقلابِ رودگر چوں بلیغ مار سگر دوسار
 ماکہ توجید خدا را جستیم حافظِ رمز و کتب و کتبیم رومیوں را گرم بازاری نہاند آں جہانگیری جہان داری نہاند
 آسمان ہا با سر پیکار داشت دینعل یک فتنہ تا تار داشت شیشہ ساسانیانِ رخو شست رونقِ خمیازہ یوںانِ شکست
 خفتہ صد آشوب و آغوش او صبحِ امر و نئے نرید و دوش او مصر ہم در امتحانِ ناکام ماند استخوانِ ادوہ اہرام ماند
 سطوتِ سلم بجاکِ خون پید دید بنیادِ آنچه رونما ہم ندید در جہاں با نگہ ازاں بود بہشت ملتِ اسلامیوں بود بہشت
 تو مگر اچرخ کج رفتار پرس ناں نو آئین کہن پندار پرس عشقِ آئینِ حیاتِ عالم است امتزاجِ سلامتِ عالم است
 آتشِ تانہ دیاں گلزارِ کیمیت شعلہ مائے ہو گلِ ستارِ کیمیت؟ عشقِ از سوز دلِ ماندہ است از شرِ لالائہ پایندہ است
 گرچہ نخلِ غنچہ دو گبریم ما گلستانِ میرد و گبریم ما

یہی حکمت کی باتیں جو اپنے اشعار میں سنی ہیں۔ اقبال انہیں "مدرس لیکچر" میں پیرایہ نثر میں ادا کرتے ہیں
 یہ خیال کہ ملتِ اسلام کا زمانہ کے مکملہ نظر سے کوئی محدود انجام نہیں اس وقت تک صحیح شکل اور قالب نہیں اختیار
 کر سکتا جب تک اس کے قوانین کی ہر زلزلے میں نئی تعبیر و توجیہ نہ کی جائے۔ صرف اصولِ اسلامی نظام کو فرسودہ پرانا
 اور ناقابلِ عمل ہونے سے بچا سکتا ہے۔ اور اسی کی بدولت اسلام انسانی معاشرت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے
 کے قابل ہو سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک، یہ چیز اسلام کا اصول "اجتہاد" ہے جو مفکرین کو نئے مسائل کے حل اور
 مختلف معاملات میں اصولِ شریعت کی زمانی تعبیر کا اختیار دیتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اقبال "مالاں کمر" کے اجتہاد کے
 مخالف اور ہرگز وہ کہ اجتہاد کو ملت کے لئے بے حد مفر سمجھتے ہیں۔

غرض یہ وہ آئیڈیل سوسائٹی ہے جس کی تعبیر اقبال کی زندگی کا مقصد ہے۔ ڈاکٹر ملکسن جنہوں نے اس پر
 کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے، نکایت کرتے ہیں کہ ان خیالات میں اقبال ایک پرجوش مذہبی مسلمان معلوم
 ہوتے ہیں نہ کہ فلسفی۔ ادھر ان کا ہر قول و ہر خیال ایک مسلمان کا قول اور خیال معلوم ہوتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ
 ملکسن کے اس قول کی تائید کروں یا تردید کیونکہ یہ دونوں چیزیں مجھے مشکل معلوم ہوتی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ڈاکٹر
 ملکسن جب ان خیالات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے سامنے یہ ایک موجودہ زمانے کی مسلمان سوسائٹی آجاتی ہے جو حالانکہ
 اقبال کی نگاہ مذہب اسلام کی ان ممکنات اور ترقی پذیر عناصر پر ہے جو اسلام کی فطرت میں موجود ہیں مگر انہیں
 پھیلنے پھولنے کا موقع نہیں ملا اور کوئی تعجب نہیں کہ خود ہمتوں اقبال مسلمانوں کی فتوحات ہی اس کے راستے

میں رب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی ہوں حقیقت میں "اسلام" کائنات کے ضمیر میں ہنوز ایک تخیل کا درجہ رکھتا ہے اور فطرت کی قوتیں اپنے عمل اور رد عمل سے اس تخیل کو وجود کی شکل دے رہی ہیں۔ ع
ہنوز اندر طبیعت سے غلاموں شہور روزے

اقبال کے اس تصورِ ملت پر عموماً اعتراض کیا جاتا ہے کہ اصولی طور پر تو اقبال کا فلسفہ عام ہوتا ہے لیکن اس کو ایک خاص قوم سے وابستہ کر دینا تنگ نظری ہے۔ اس کا جواب خود اقبال کی زبانی سننا چاہئے:-

"شاعری اور فلسفہ میں انسانی نصب العین ہمیشہ عالمگیر ہوتا ہے لیکن جب اس کی تفصیل عملی زندگی میں کیا جائے گی تو لامحالہ اس کا آغاز کسی مخصوص جماعت سے کرنا ہو گا جو اپنا ایک مستقل اور مخصوص موضوع رکھتی ہو اور جس کے حدود میں تبلیغ عملی و لسانی سے وسعت ہو سکتی ہو۔ یہ جماعت میرے عقیدے میں اسلام ہے۔

طوالت کے خوف سے اس سوسائٹی کے مختلف ترکیبی اجزاء پر تفصیل تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم مختصر اہم حث کی طرف اشارہ کر دینا نامناسب نہ ہو گا۔

انسانِ کامل - اقبال کے نزدیک ایسی سوسائٹی کے لئے ویسے ہی آئیڈیل (مثالی) افراد کی ضرورت ہو جو اس نظام کو کامیاب بنائیں گے۔ یہ آئیڈیل افراد ایسے ہوں گے جن میں خودی کی تکمیل ہو چکی ہوگی۔ خودی اقبال کے نزدیک ایک فوری نقطہ ہے۔ جو محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی محبت، خودی کی تکمیل کا باعث ہوگی اور یہی خودی ان افراد میں بے خوفی اور مردانگی پیدا کرے گی۔ خودی نظامِ عالم کی بنیاد ہے جس کے بغیر نئے ترکیب نہیں پاسکتے۔

می شود از بہر اغراضِ عملِ عامل و معمول و اسباب و علل
خیزد از پیسند و قند تا بدد سوزد از فرد و خرامد پرزند
دانودن خویش را خوئی خودی ست
خفتہ در ہر ذرہ یزدی خودی ست

چونکہ زندگی خودی کی تکمیل سے ہے اسی لئے سختی اور سخت کوشی، استواری اور طاقت، زندگی کی ضروریات میں سے ہیں۔ افراد جس قدر کش مکش اور بخل و برداشت کے عادی ہوں گے اسی قدر ان میں خودی کی تکمیل زیادہ ہوگی لیکن خودی کے تسلسل اور بقا کے لئے مقاصد اور نصب العین کا ہونا ضروری ہے کیونکہ زندگی جستجو میں پوشیدہ ہے۔ آرزوؤں اور کوششوں کا نام کامیاب زندگی ہے۔ جب تک آرزو اور مقاصد کو حاصل کرنے کا جنون نہ ہو گا زندگی پختہ تر نہ ہوگی۔

زندگی جستجو پوشیدہ است اصل اور آرزو پوشیدہ است
خونِ تخلیق تمسک باز ماند شہرِ ششک و داز پرواز ماند
دل ز سوز آرزو گیر و حیات غیر حق میرد چرا گیر و حیات

اقبال ان سب اثرات کا سخت مخالف ہے جو خودی کو ذرا بھی کمزور کرتے ہیں وہ اعلیٰوں کے گوسفندانہ فلسفہ کو اسی لئے ناپسند کرتا ہے کہ اس نے زندگی کا انجام موت کو قرار دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک ایسی تعلیم خودی کو کمزور کرتی ہے۔ اور خودی کو کمزور کرنے کا حربہ ان اقوام نے ایجاد کیا ہے جو خود کمزور ہیں اس لئے ان کی خواہش ہے کہ طاقتور بھی کمزور ہو جائیں۔ اقبال نے ایسی تعلیم کی قباحتوں کو ایک حکایت کے ضمن میں بیان کیا ہے جس میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ ایک شیر نے بکریوں کے اسی قسم کے خودی کش وعظ سے متاثر ہو کر گوشت کھانا ترک کر دیا تھا جس کے معنی ”شیر“ کی موت اور نباہی کے بغیر کچھ نہ تھے۔

اگر کہنے کو سفند از لشکار کردین گو سفندی اختیار
از علف آں نیز نمی ندان مانند ہیبت چشم شرافشاں نمائند
بالہنگام سازگار آمد غشت آخر کو ہر شیرے غزت
آں جنون کو شش کامل نمائند آں تقاضای عمل رد نمائند

شیر بیدار از منون میشش خفت
اخطا و خویش را تہذیب گفت

نیشے کی طرح اقبال بھی استیلا، قوت اور جہاد کو خودی کی تربیت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ نیشے کہتا ہے ”نیکی قوت اور بہت مردانہ کا نام ہے بلکہ ہر اس شے کا نام ہے جو انسانوں میں استیلا اور قوت کے جذبات کو ترقی دے۔ اور بدی ہر وہ چیز ہے جو کمزوری سے پیدا ہو“ اقبال جہاد کو زندگی کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں کیکن کو نسا جہاد ساری دنیا کو غلام بنانے کے لئے نہیں بلکہ خدا کی کلمہ کی تبلیغ کے لئے۔ جوع الارض اور دنیا کی تخریب کا جہاد اقبال کے نزدیک حرام ہے۔

ہرگز خنجر بر غیر اللہ کشید
تنہا و در سینہ او آرمید

اس جہاد کے سلسلے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اقبال کا ملحدانہ مادی قوت نہیں بلکہ روحانی قوت ہے جیسا کہ خود اقبال ایک مقام پر کہتے ہیں :-

”بدید سائنس سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ قوت مادی کا ہر سال ہزار سال کے ارتقا کے بعد اپنی موجودہ قوت تک پہنچا ہے۔ اس پر بھی اُسے دوام نہیں اور وہ انحلال قبول کر لیتا ہے بالکل یہی حال روحانی قوت کا ہے یعنی فرد انسانی بے شمار فرقوں کے تنازع اور جدوجہد کے بعد اس مرتبے تک پہنچا ہے اور پھر بھی آسانی کے ساتھ انحلال قبول کر لیتا ہے۔ . . . اس لئے اگر اپنے وجود کو برقرار رکھنا ہے تو لازم ہے کہ گذشتہ زندگی میں جو خوبات حاصل ہوئے ہیں اور ماضی میں جو قوتیں اس کے ثبات میں مددگار ہوئی ہیں ان سے مستقبل میں بھی کام لیتا رہے اس سے معلوم ہوگا کہ میں نے تنازع اور جنگ کی ضرورت جس مفہوم میں تسلیم کی ہے انحلالی ہی ہے۔“

جہاد کے بعد خودی کی تربیت کے لئے تین مرحلے ہیں۔ اعلیٰ قوت ضبط نفس۔ اور نیابت الہی

ظہر بادریاست از آئین وصل
ذره یا صحر است از آئین وصل

بالن ہر شے ز آئینے قومی تو چراغانل از بس سماں دی
جب ایک فرد اطاعت اور ضبط نفس کے مراحل طے کر چکے ہوتا ہے۔ تو پھر وہ نیابت الہی کی منزل میں آ پہنچتا ہے۔ اقبال اس پختہ عنصر فرد کو نائب حق کا خطاب دیتے ہیں جس کی عقیدت سے ان کا دل سرشار ہے۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است بر عناصر کمر اں بودن خوش است
نائب حق چو جان عالم است ہستی او ظن اسم غم است ذات او تجوید ذات عالم است از جلال او خجالت عالم است
از نور جسہ و کل اگر بُو در جہاں قائم بامر شد بود زندگی رائے کند تفسیر نو سے وہاں خواب الغیر نو
نوع انسان را بشیر و ہم نڈ ہم سپاہی ہم سپر گر ہم امیر طبع فطرت عمر را در خون تپید تادویت اوتاد و مردوں
مشق خاک ماسر گردوں را رسید زیں غباراں شمسوار آید پدید

اقبال اس مرد میدان کا شدت سے اتنا کر کرتے ہیں جس کا وجود اطاعت کامل اور ضبط نفس کی تمام قیود اور استخوانوں سے کامیاب ہو کر اس درجے تک پہنچا ہے۔ فرماتے ہیں :-

اے سوار شہد دورں بیا اے نسفر غز ویدہ اسکاں بیا خیزد قانون اخوت سازدہ جام صہبائے محبت باز دہ
روزن نہ گمانہ ایک باد شو در سوار دیا باد آباد شو باز در عالم بیار ایا تم صبح جنگجیوں ابدہ پیغام صلح
شورش اقوام را خاموش کن غمہ خود را بہشت گوش کن سجدہ اے طفلک برنا سپر از زمین شمسار با بجیر
از جو د تلوسہ را فر ازیم ما پس بہ سوز ایں جہاں ازیم ما

یہ نائب حق کا تخیل اقبال کا کیا تخیل نہیں بلکہ مشرق و مغرب کا پرانا تخیل ہے نیٹشے کا "ما فوق الانسان" کا رابل کا ہر دور گوئے کا *omnipotent* اسی قسم کے افراد ہیں۔ نیٹشے اور اقبال میں جو مدت پائی جاتی ہے اس سے بعض مغربی نقادوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اقبال نے انسان کامل کا خیال اسی جرمن فلسفی سے متعا لیا ہے۔ حالانکہ اقبال خود فرماتے ہیں کہ :-

میں نے یہ خیال نیٹشے سے نہیں لیا بلکہ تصوف کا انسان کامل آج سے بیس سال قبل میرے پیش نظر رہا ہے۔ انگریزوں کو اپنے ایک ہرطن فلسفی ایگنیزڈر کے خیالات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ لیکن ہم دونوں میں رقیہ ہے کہ ایگنیزڈر کے خیال میں حقیقت تصور ایک خدائے ممکن الوجود کی شکل میں جلوہ گر ہوگی لیکن میرا خیال یہ ہے کہ شان الہی ایک برتر انسان کے قالب میں جلوہ گر ہو کر رہے گی۔

اقبال نے تصوف کے جس انسان کامل کی جانب اشارہ کیا ہے وہ محی الدین ابن عربی اور ابوسعید اہلبلی

کا انسان کامل ہے۔ افسوس کہ اندیشہ طوائف مانع ہے۔ درندہ بتایا جانا کہ ابراہیم جلی کا انسان کامل اقبال کے نائبِ حق سے بہت مختلف ہے۔ اس کا مفصل حال اقبال کی کتاب "فلسفہ بحکم" اور مجلس کی کتاب "Mind and Matter" میں ہے۔

میرزا خیال ہے کہ میں نے اجمالاً مگر وضاحت کے ساتھ اقبال کی کامل سوسائٹی اور کامل انسان کا حال آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ جس کی بعض تفصیلات کو دانش نژدہ کر دیا گیا ہے۔ ساری کی ساری تصنیفات میں اقبال اس کامل سوسائٹی کے بلند مقاصد کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں نہ صرف تخیل اور فلسفہ ہی میں بلکہ اپنی مختصر عملی سیاست کی زندگی میں بھی انہوں نے ایسے خیالات اور افکار کی پرچوش مخالفت کی ہے جو انہیں فرا بھی اس خاص نصب العین کے لئے حضرت رسالہ نظر آئے۔ اقبال شروع سے راجہ جگ، اس زندہ سوسائٹی کی کامیابی کے متعلق ایمان اور ابقان رکھتے ہیں اور اپنی بصیرت سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ غامبی مگر خودی آشتی نا افرادیک دن فرشتوں سے بھی بڑھ جائیں گے۔

فردی غامبیان از نوریاں افزوں شود رونے زمین از کوکب تقدیر ما گردوں شود رونے
یکے در معنی آدم مگر از من چہ ہے پرسسی ہنوز اندر طبیعت می غلہ موزوں شود رونے
چنان موزوں شود میں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزدان را دل از تاثیر او پر خوں شود رونے
اقبال کا نظریہ حکومت و خلافت۔ حکومت اور خلافت کے متعلق اقبال نے بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا تاہم خلافت انسانی کے اہم اصول انہوں نے اپنی نظمیں میں بیان کر دئے ہیں۔ اقبال ایک عادل اور موثر حکومت کے لئے ایمان اور عشق کو ضروری سمجھتے ہیں۔

دلایت پادشاہی، علم اشیا کی جستگیری یہ سبب کیا ہے فقط اک نکتہ ایمان کی تفسیریں
حکومت اور سروری اقبال کے خیال میں غمگنہ گری کا دوسرا نام ہے لیکن انسان میں حقیقی اور بے لوث خدمت خلق کا مادہ نہیں پیدا ہو سکتا تا آنکہ تمام کاموں کی بنیاد عشق پر نہ رکھی جائے اور تمام امور میں یقین اور ایمان کی شعل سے روشنی نہ حاصل کی جائے۔ گویا دوسرے الفاظ میں۔ درویشی اور سلطانی کا اجتماع ہونا ضروری ہے۔ یہاں بھی اقبال اپنے انسان کامل کو فراموش نہیں کرتے اور حکمرانی کے لئے عشق مصطفیٰ کو ایک ضروری شرط قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ یہی عشق افراد قوم کو ایک نقطے پر جمع کر سکتا ہے اور اسی کی ذات کے ساتھ ہی
اس پریشان شیرازے میں ایک نظم پیدا کر سکتی ہے پیام میں فرماتے ہیں:-

سرزمی در دین باغ و شکرستی عدل فاروقی و فقر حیدری است
 دلجویم کھانے لکے دیں بادل خویک نفس خلوت گزین
 آل مسلمانان کہ میری کردہ اند و شنشاهی فقری کردہ اند
 ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان است بحر و درگوشہ داناں است
 روح را جسز عشق و آرام نیست عشق اور در زیرت کو راشام نیست

اقبال جس طرح باقی امور میں عقلی بنیاد عمل کے مخالف ہیں اور عقلیت یعنی *intellectualism* کو عالم انسانیت کے لئے بے مد مضرت سمجھتے ہیں اسی طرح نظریہ سلطنت میں بھی انہیں عقلی بنیاد سے خاص پرغاش ہے کیونکہ جو قوانین عقلیت فسر سودہ دماغوں سے وضع ہوں گے ان میں انسان کی خود مرضی اور انفراد پسندی کی چاشنی ضرور ہوگی اور ظاہر ہے کہ انسان، سوسائٹی اور اجتماعی امور میں اس لئے نہیں شامل ہونا کہ اس سے اجماع کو زیادہ مستحکم کرنا منظور ہوتا ہے بلکہ اس کے پیش نظر صرف یہ چیز ہوتی ہے کہ سوسائٹی کے تابع رہنے سے، اس کے خاص مفاد بہتر طریق سے محفوظ ہو سکتے ہیں یعنی وہ ہے کہ آئین سب لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے اور جو اقلیت غیر مطمئن ہوتی ہے وہ ان قوانین کے خلاف آواز بلند کرتی جو پس اقبال کے نزدیک، یہ صورت حالات جو کہ عقلیت کی کہوں میں حل ہے اس لئے اس سے بچنا چاہئے اور اس کے بجائے دجی کے لئے ہوئے قوانین کی اطاعت کرنی چاہئے۔ جاوید نامیہ میں فرماتے ہیں :-

بندہ حق بے نیازانہر مقام نے غلام اورانہ اوکس افلام
 بندہ حق مرادناست و بس ملک آئیش خدا اور است و بس
 دجی حق نیندہ سود ہمہ زندگاہش سود و ہوس ہمہ
 عادل اندر صلح دم اندر رضا و صلح لا برای لایبات
 عقل خود بین فائل از ہوس و غیر سود خود بیند نہ بیند سود غیر
 حاصل آئین دستور ملک وہ خدایاں فرہ و دہقاں دگر
 مذہب اور حکومت دین اور سلطنت کی پرانی بحث میں اقبال اسلامی طریقے کی پر زور حمایت کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک، مارٹن لوتر، سمیت کا سب سے بڑا دشمن تھا جس نے مذہب اور حکومت کو دو مختلف اور مستقل وجود قرار دیا ہے۔ آپ کے خیال میں مذہب اور حکومت کی مثال جسم اور روح کی ہے جن کا رابطہ باہمی، زندگی کے لئے ضروری ہے اور جن کا ایک دوسرے سے قطع تعلق، موت کے مرادف ہے۔ اقبال کے اس خیال کی اس مانے میں شاید زیادہ تائید نہ ہو سکے لیکن خود یورپ میں سیاسیات کے مصنفین نے، مترجہوں اور اٹھارہویں صدی میں ان مضامین پر پیر عمل بحثیں کی ہیں جن کا کامل اطلاق، ان حالات پر نہیں ہو سکتا جو اقبال کے پیش نظر ہیں کیونکہ ترقی و دہلی میں یورپ کا ایسی نظام حکومت و مذہب بالکل ایک خاص قسم کا نظام تھا جس میں پوپ اور بادشاہ دونوں کو یکساں طور پر جسمانی اور روحانی بزرگ تسلیم کیا جاتا تھا لیکن اقبال کی حکومت میں جسمانی اور روحانی کوئی دو جدا بستیاں نہیں بلکہ ایک

ہی شخص اور ایک ہی نظام میں دونوں ملی ہوئی ہیں بگلشن راز جدید میں لکھتے ہیں :-
 تن میان را دولت گشت کلام است تن جان او دنیا دیدن جماعت کلیسا سے بغیر شہاد و کربا و حاکمی کا یہ نادر
 بدن آنا رنگ انباں جدا دید نگاہ ملک دین اہم تھاؤ خرد را بادل خود ہمسفر کن یکے بہلتہ رکال نگر کن
 بہ تعلیقہ سرنگ از خود رسید میان ملک و دین ربطے ندیدند
 روز میں فرماتے ہیں :-

تا حکومت مسند مذہب گرفت این شخص در گلشن مغرب گرفت
 قصہ دین میسائی فرود شعلہ شمع کلیسائی فرود

دور جدید میں ترکوں نے یورپ کی دیکھا دیکھی مذہب اور حکومت کو الگ کر دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک، ترکوں
 کی یہ تدبیر صحیح نہیں۔ اس لئے کہ یہ اس نظر پر حکومت کے خلاف ہے جس کی بنیاد عشق اور عشق مصطفیٰ پر ہے
 مصطفیٰ کمال نے یورپ کی اس چیز کو جسے خود اہل یورپ اب پرانا سمجھتے ہیں نیا سمجھ کر اختیار کر لیا ہے حالانکہ مومنین
 کو اپنی دنیا خود پیدا کرنی چاہئے۔ مگر یہ قوت عمل صرف عشق ہی کی کار فرما ہوا ہے ممکن ہو سکتی ہے جاوید نامہ میں لکھتے ہیں
 ترک را آہنگ نو در چنگ نیست تازہ اش جز بند کمنہ آفرنگ نیست

جمہوریت۔ اقبال یورپ کے جمہوری نظام کے متعلق بہت زیادہ حسُن ظن نہیں رکھتے ان کا خیال ہے
 کہ یہ جمہوریت بھی، استبداد تسلط اور غلبہ عام کی ایک نئی شکل ہے۔ اصولی طور پر اقبال حکومت میں عوام کی مداخلت
 کے زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک عوام میں سے ہر فرد کو قدرت نے مصالح حکومت کو سمجھنے
 کی توفیق نہیں دی۔ آپ نے ایک زمانے میں خلافت اسلامیہ کے موضوع پر ایک سال لکھا تھا جس میں کسی حد تک
 انتخاب کے طریقے کی تعریف کی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ اس مسئلہ کے متعلق ان کے خیالات میں
 یک گونہ تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ آپ ایک نظام سیاست میں ایک کامل طور پر حساس فرد *personality* کے قائل
 ہیں اور بیشک یہ طرح زندہ اور طاقتور *personality* کی حکومت کو زیادہ کامیاب اور مناسب خیال کرتے
 ہیں پیام میں آپ فرماتے ہیں :-

منزلت معنی بیگانہ اندوختن است چوئی زمور ان شوختی طبع سلیمانے نمی آید
 گریز از طرز جمہوری غلام بخت کاسے شو کہ از مغر و صدمہ بگریزانے نمی آید
 رد و اگرچہ ایسی جمہوریت کا قائل تھا جس میں حریت، اخوت اور مساوات بطور اصل الاصول ہوں لیکن

جمہوریت کے اصولی نقائص کا اسے پورا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اس کا قول ہے کہ ایسی طرز حکومت تو فرشتوں کی دنیا کے لئے مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ہم انسان تو اس کے قابل نظر نہیں آتے۔ لیکن اب یورپ میں جمہوریت کے خلاف زبردست راستے پیدا ہو گئی ہے۔ اور میسوں کو تاہیں اس کی خرابیوں کو ظاہر کرنے کے لئے لکھی جا رہی ہیں۔

انتہا کو سب سے بڑی شکایت اس طرز حکومت سے یہ ہے کہ اس میں قابلیت نہیں بلکہ مقبولیت معیار کا لائحہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص قابل ہونے کے بغیر مقبول ہو۔ اس پر اقبال کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جمہوریت گروہ بندی اور فرقہ پرستی کو ترقی دیتی ہے۔ لاسکی اگرچہ جمہوریت کی خوبیوں کا بے حد معترف ہے لیکن اسے بھی سب سے زیادہ اسی بات کا خطرہ ہے کہ یہ عوام کی مداخلت اور عدم استحکام کی وسعت، فرقوں میں بے حد وسعت اور کثرت کا باعث ہو رہی ہے۔ جمہور کی آزادی کی لاکھ برکات ہوں مگر اس میں شبہ نہیں کہ جمہور کا یہ غلبہ عام اور مطلق العنانی کسی نظام کو زندہ اور محکم نہیں ہونے دے گی۔ اور ارتقا کے فطری اور قدرتی طریق سے معاملات کی تکمیل کے بجائے انقلاب اور سریع وقوع تغیرات، عام اور زیادہ ہو جائیں گے۔ گلشن طراز میں انتہا نے انہی نکات کی جانب اشارہ کیا ہے:-

فرنگ تین چوٹی نہاد سن از گردن دیوے نہاد
چورہزن کار دلے دنگ تاؤ حکم بہر نانے دنگ دناز
نماند در غلاف خود زمانے
ان اشعار کے ساتھ خضر راہ کے ان اشعار کو بھی سن لیجئے۔

ہے دہی سار کمن مغرب کا جمہوی نظام
دوہر استبداد جمہوی قبا میں پائے کوب
مجلس آئین داصلاح در عایات و حقوق
گر می گفتار اعضائے محاسن الامان
جس کے پردے میں نہیں خیر اولائے قیصری
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے میسلم پر می
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
آہ اسے نادان نفس کو آستیاں سمجھا جو تو
اس سرب رنگ و بو کو گھٹان سمجھا ہے تو

قیصر و امیر اور رئیس کے مقابلے میں یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ انسانی طبیعت اطاعت پر مجبور ہے خواہ وہ ایک طاقتور فرد کی ہو یا ایک پارلیمنٹ کی۔ وہی خرابیاں جو مطلق العنان حکومتوں میں ہیں، وہی جمہوری اداروں میں بھی وارد ہو سکتی ہیں:-

گنناہ عشوہ و نازبتان چہیت طواف اندر شرت برہن بہت
اگر تاجے کئی جمہور پوشد ہماں نہنگامہ مادرانجن بہت
مانا ناز شیریں بے سیدار اگر خسر و نسا شد کو کہن ہر سیدار

قومیت کا تصور۔ قومیت یا نیشنلزم کے متعلق اقبال کے عقاید اس قدر واضح اور صاف ہیں کہ ان پر طویل تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ جو لوگ اقبال کے نقطہ نظر کے مطابق تھانگہ برادری اور وسیع انسانی اخوت کے تخیل کو سمجھتے ہیں وہ اقبال کو نیشنلزم کی اس شدید مخالفت میں ضرور حق بجانب سمجھتے ہوں گے۔ خود یورپ اس فرق پسندی سے تنگ آچکا ہے اور اس جماعت تراشی سے بھاگ کر جمعیۃ الاقوام کی تخیل میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ اگرچہ اقبال اس کی ان کوششوں کی کامیابی کے متعلق بھی یقین نہیں رکھتے۔ اور اس بظاہر یونیورسل نظم کو کفن چودوں کی انجن کا خطاب دیتے ہیں، کیونکہ اس کا مضمنا بھی وہی مادیت ہے جس کے خلاف اقبال نے اپنی زندگی صرف کر دی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ لیگ آف نیشنز کی پے در پے ناکامیاں اور طاقتور اقوام کا اس کے نظام پر تسلط اقبال کو بظن کر دیتا ہے اور اس بدظنی کے لئے اس کے پاس وجوہ موجود ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لیگ ابھی تک مکہ مکرموں کی حفاظت نہیں کر سکی اور *Dum moment* یا تخفیف السوح کی کوششیں بقول ریمزے میور *Armament* (اسلحہ اندوزی) پر ختم ہو رہی ہیں۔ لیگ کی اس ناکامی کا سب سے بڑا سبب بھی نیشنلزم ہی ہے جس طرح کہ دور جدید کی اکثر لڑائیوں کا اصلی سبب نیشنلزم ہی تھا۔ ہندوستان کے اکثر حضرات جب اقبال کو نیشنلزم کی مخالفت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو وہ بہت برہم ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے غلط فہمی کی وجہ سے اقبال کے خیالات کا صحیح اور گہرا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ اقبال نیشنلزم کی مخالفت اس لئے نہیں کرتے کہ انہیں آزاد آدمی پسند نہیں کیا، یا وہ غلامی کو محبوب سمجھتے ہیں بلکہ اس کی محرک بعض اور چیزیں ہیں جن کے متعلق اجمالی طور پر آئیڈیل سوسائٹی کے ضمن میں بحث ہو چکی ہے۔ انوس کا مقام ہے کہ جس شخص نے فخر بھر افراد اور ملتوں کو خودی کا سبق پڑھایا جس نے زندگی نامہ لکھ کر یہ ثابت کیا کہ زندگی اور زندگی و مخالفت چیزیں ہیں جس نے انسانوں کو عام حریت، عام اخوت، عام انصاف، اور عام رواداری کا پیغام دیا اس کے متعلق ہر بابران وطن اپنے دلوں میں یہ خیال جاگزیں کر لیں کہ اسے ان عام انسانی جذبات سے بھی نفرت ہے جو بقول "روس" کیڑے میں بھی موجود ہیں اور جن کے بغیر کوئی سیرت مکمل نہیں ہو سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال ایک یونیورسلٹ ہیں پس وہ ہر چیز جو اس خاص نصب العین سے ٹکرائے گی وہ اس کی مخالفت کریں گے۔ یہی یونیورسلزم کی عام تبلیغ ہے جسے بعض دوست "بین اسلامزم" کے نام سے

تعبیر کر دیتے ہیں، حالانکہ اقبال بین اسلامزم کو بھی ایک ناقص اور محدود تدبیر سمجھتے ہیں۔ یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ اقبال جا بجا مسلمان اقوام کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں اور وطن اور نسل کے امتیاز سے دوری کی تعلیم دیتے ہیں جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلامی تعلیم و تربیت کے حلقے میں صرف مسلمان اقوام ہی اس تعلیم کو بے آسانی سمجھ سکتی ہیں۔ باقی اقوام شینفرم سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ اس یونیورسل اپیل کو "خندہ ملالہ" سمجھیں گی یا اسے اپنے تسلط کے منافی سمجھیں گی۔

اقبال شینفرم کے ہر اُس تصور کا شدید مخالف ہے جس کا معیار وطن رنگ نسل اور زبان ہو۔ دنیائے کایہ مفکر کا اسلام اور سامنس باہم تناقص ہیں۔ صحیح نہیں کیونکہ اصل میں "اسلام اور نسل امتیاز باہم متناقض ہیں" اقبال خود ایک مضمون میں لکھتے ہیں :-

"میں نے جب یہ محسوس کیا کہ قومیت کا تخیل جو نسل و وطن کے امتیازات پر مبنی ہے۔ دنیائے اسلام پر بھی عادی ہوتا جاتا ہے اور جب مجھے یہ نظر آیا کہ مسلمان اپنے وطن کی عمومیت اور عالمگیری کو چھوڑ کر وطنیت اور قومیت کے پھندے میں پھنستے جاتے ہیں تو بحیثیت ایک مسلمان اور محبوب نوع انسان کے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں ارتقائے انسانیت میں انہیں ان کے اصلی فرض کی طرف توجہ دلاؤں۔ اس سے انکار نہیں کہ اجتماعی زندگی کے ارتقا اور دشمنی میں قبیلے اور قومی نظامات کا وجود بھی ایک عارضی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اگر ان کی اتنی ہی کائنات تسلیم کی جائے تو میں ان کا مخالف نہیں لیکن جب انہیں انتہائی منزل قرار دیا جائے تو مجھے ان کے بدترین لعنت قرار دینے میں مطلق تامل نہیں۔"

اس بحث کو زیادہ طول دینے کے بغیر میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ اقبال کے اُن سینکڑوں اشعار کی طرف مبذول کروں جن میں اقبال نے شینفرم کی مخالفت کی ہے۔ اور دنیا کی سب سے بڑی قوم، یعنی انگریز شینفرم بلکہ یونیورسلزم میں اعتقاد رکھنے والی قوم کو، ان جغرافیائی اور غیر فطری قیود سے احتراز کرنے کی تلقین کی جو وطنیت کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں لکھتے ہیں :-

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تفسیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
فانی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر جوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا ملتی ہے اس سے قومیت اسلام کی جو کلٹی ہے اس سے

ان اشعار اور سینکڑوں دوسرے ترانوں کو ریزے میوز کی ایک مختصر سی کتاب *The Political Consequences of Islam* کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو ان فقرات کی صداقت کا مزید یقین ہو جائے گا۔ **سوشلزم اور سرمایہ** کے موضوع پر اقبال نے نہایت صاف انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔

اقبال مزدور کا حامی ہے۔ سرمائے کی مضرتوں اور نا انصافیوں کا دردناک حال نہایت شیریں اور دلگداز نغموں میں ظاہر کرتا ہے۔ قسمت نامہ سرمایہ دار مزدور اور دھڑلے دار معرکتہ آرا راہبند ہیں جہاں سرمایہ دار کی شاخ نبات کا ذکر ہے اس بلخ پر ایسے میں مزدور کی محکومی اور مجبوری کا اظہار کیا ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں اقبال کو شکست سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن اقبال جس طرح باقی تخیلات میں مستقل راہ اور دھجوان رکھتا ہے اسی طرح اس معاملے میں بھی وہ ان مسائل کو اپنے خاص نصب العین کے معیار پر پرکھتا ہے چنانچہ جاوید نامہ میں سید جمال الدین افغانی کی زبانی جن اسرار کا اظہار کیا ہے وہ خاص غور کے قابل ہیں۔ افغانی پہلے تو یہ بتلاتے ہیں کہ قیصریت کی شکست اسود کی مذمت، زمین پر خدا کا قبضہ، تمام انسانی برادری کی مساوات وغیرہ میں سلمان درویشی متحدہ اقبال میں لیکن اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ روس کے تصور کی بنیاد شکم پر ہے اور روح کی ترقی کے بجائے اس کا منتہائے نظر، جسم ہے۔ روس کی تہذیب لاکھ مدح کے قابل سہی لیکن چونکہ اس میں "ذکر حق" کی کمی ہے اس لئے اس سے بھی احتراز لازم ہے۔ کارل مارکس کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں بلخ۔

صاحب سربلہ ازسں غلبیل یعنی آں سیمیر بے جبرئیل
 زانکہ حق در باطل و ضمیر است قلب و مومن و عاشق کا فرست
 غویاں گم کردہ اندالاک در شکم چوینہ جان پاک را
 اقبال سوشلزم کو وسیع انسانی برادری کی تعبیر اور ترکیب کے لئے اتنا مضمر نہیں سمجھتے جتنا یش شمنزم کو۔ مگر سوشلزم کو بھی روحانیت کے بغیر ناقص خیال کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اب تک میں یہ ظاہر کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکا ہوں کہ اقبال موجودہ تمدن اور اس کے مختلف شعبوں میں کس قسم کا انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں ان کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ فزنی تہذیب خود اپنے ہی خنجر سے خود کشی کر رہی ہے اور مغرب خود اپنی ہی تلوار کے زخموں سے گھٹاں ہو رہا ہے۔ ایشیا تاجک کے اس زبردست انقلاب کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا اس لئے اہل ایشیا کا فرض ہے کہ اس رتخیز میں دیدہ بینا اور گوش شنو سے کام لیں اور اپنے آپ کو ان مضرتوں سے محفوظ رکھیں جو یورپ کی ہلاکت کا باعث ہو رہی ہیں۔ جس طرح روسو اور دالیر کا لٹریچر فرانس میں ایک زبردست تبدیلی اور ہیجان کا پیش رو تھا اسی طرح اقبال کا لٹریچر ایشیا میں ایک عظیم الشان ذہنی قیامت کا پیغامبر ثابت ہو گا۔ جس کے آثار روز بروز زیادہ روشن ہوتے جاتے ہیں۔

انقلاب کے گنگدیر ضمیر اندالاک
 خرم آں کس کہ دریں گروہ ملے بیند
 بینم وینچ ندانم کہ چساں می بینم
 جو ہر نغمہ زلزلہ زین تاملے بیند

سید محمد عبد اللہ

نین کٹاری

سُن تو سکھی میں تجھ پر داری مجھ کو دیکھ نہیں زناری
 میں تو تن من دھن سب ہاری
 ہر دے لاگی نین کٹاری
 کل اٹھان کیا جو میں نے کوٹھا چھوڑ پڑھی اٹاری
 دیکھی صورت سناولی پیاری
 ہر دے لاگی نین کٹاری
 ہاتھ سے میں نے بال نچوڑ کنگھی لے کے ہانکھاری
 پہن رہی تھی مسندل ساری
 ہر دے لاگی نین کٹاری
 سکھی بنا کچھ، نو بگ کھیلی نئی نویلی میں دکھیا ری
 مار گیتو مو کو گر دھاری
 ہر دے لاگی نین کٹاری

مقبول حسین
 احمد پوری

لہ اٹاری کوٹھے سے اونچی جگہ زینے کی چھت

مادھوری

شہسختی جی نے ہنس کر کہا "ڈاکیا دو پترے گیا ہے۔ ایک بھگوانداس جی کا دوسرا ڈاکٹر ٹنڈن کا میں نے جواب دیا اچھا ہوا اس کی گاڑی سے ہم مسوری نہیں سمجھے۔ میں رام کشور کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا اس کو ریل سے گرے ایک ہمدینہ ہونے آیا ڈاکٹر ٹنڈن کہتے تھے کہ چوٹ بھی معمولی آئی ہے لیکن وہ ابھی تک کاشی کیوں نہیں لوٹے ڈاکٹر ٹنڈن کا خط یہ تھا :-

(۱)

از لکھنؤ۔ مورخہ ۳ مئی ۱۹۳۱ء

آپ کا خط ملا۔ معاف کیجئے جواب دینے میں دیر ہوئی۔ رام کشور کو زیادہ چوٹ آئی ہے تاہم جلد اچھا ہو جانے کی امید ہے لیکن مجھے سخت تعجب ہے کہ وہ اس عمر میں زندگی سے کیوں اکتا گیا ہے۔ ایک نامراد عاشق بھی اپنے محبوب کے التفات کے انتظار میں ایک طویل مدت کاٹ دیتا ہے۔ محض اس خیال سے کہ کبھی نہ کبھی اس کے دل کی بات پوری ہوگی لیکن یہ ۲۰ سال کا نوڈ از زندگی سے ایسا روٹھ گیا ہے کہ کسی طرح اس کا جی نہیں بہلتا وہ اخبارات سے ہنسنے کا کام لیتا ہے اور رسائل بوڑھے ملازم کے سر پر پھینک دیتا ہے خطوط تو کبھی پڑھتا ہی نہیں اگر اس کی یہی حالت رہی تو خدا نہ کرے کسی ہلکے مرض کے ہو جانے کا اندیشہ ہے آپ ازراہ فوارش اس کو خط لکھتے رہتے آئے یہ علم نہیں کریں اس کی کیفیت آپ کو لکھ رہا ہوں بسا اوقات تمام دن سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے اکثر الماری کی کتابوں اور رسائل سے غریب ملازم کے سر کی تواضع کرتا ہے اگر کلو میٹر پرانا ملازم نہ ہوتا تو یقیناً میرے گھر میں ملازم کا رہنا ایک دشوار امر تھا اور کیا لکھوں آج رات کی گاڑی سے میٹھ جا رہا ہوں۔ واپسی پر ملنے کی کوشش کروں گا

میں نے سوچا کل مسوری جا کر سب سے پہلے رام کشور کو خط لکھوں گا پھر کوئی دوسرا کام کروں گا۔

(۲)

مسوری۔ مورخہ ۳ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

ڈاکٹر منڈن کے خط سے یہ معلوم ہو کر کہ اب تمہاری حالت دوبارہ ہے میری فکر دور ہوئی مدہ بڑے غلیق اور ہمدرد ڈاکٹر ہیں تم کو بہت جلد پاؤں چلنا سکھادیں گے۔ میرے اس خشک اور روکھے پھیکے خط سے تمہارا دل کیا بے لگ کسی ہوٹل میں ٹھہر رہا ہو تو پریوں کا تذکرہ کرتا لیکن کیا کر دوں کرانے سے لئے ہوئے اس بنگلے کے ایک کمرے میں ٹھہرا ہوں جس کی مالکہ ایک عیسائی عورت (مسٹر کرجی) ہے عمر تقریباً اسی نوے سال ہوگی آج کل اس کے پاس صرف ایک بھتیجا ہے۔ سارا بنگلہ خالی پڑا ہے۔ سناہے دو تین دن میں دہلی سے مسٹر کرجی کی بہن کی لڑکی جو باں کر سچین کلر میں ٹپھتی ہے آنے والی ہے۔ اُس کی عمر چودہ سال کی ہے اور نام مادھوری ہے ایف نے میں ٹپھتی ہے گزشتہ سال انٹرنس کے امتحان میں اس کا چھٹا نمبر تھا۔

تمہاری بہن خط لکھنے کے باعث تم سے سخت ناراض ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ تم کو ان کا سلام نہ لکھا جائے۔ گو مجھے کاغذ سیاہ کرنے کی عادت ہے جلد اپنی خیریت کی اطلاع دو

شیام چرن

(۳)

از لکھنؤ مورخہ ۹ مئی ۱۹۳۲ء

پیارے شیام چرن!

تمہارا خط ملا بخلا میں کیا اور میری ناراضی کیا ٹانگ کا زخم اب مندمل ہوتا جا رہا ہے۔ سیتاجی کے بیاب کو آج پندرہ برس ہوئے لیکن اس عرصہ میں مجھے پلنگ پر رات دن پڑے رہنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا ابنتہ اس سے پہلے بیمار ضرور ہوا تھا۔

لکھنؤ ایسے مقام میں بھی میری طبیعت نہیں لگتی مجھے چاروں طرف دیرانہ نظر آتا ہے اس باغ میں مہینوں کوئی نیا چہرہ دکھائی نہیں دیتا بس مولیٰ اور ڈاکٹر دزانہ آتے ہیں اور ماں قریب کے قد آدم آئینہ میں ایک اور چہرہ نظر آتا ہے۔

یہاں شدت کی گرمی پڑ رہی ہے۔ تم روزِ خط لکھا کرو کم از کم دوسرے روز تو ضرور لکھ دیا کرو میں مادھوری کے حالات لکھنا۔ مجھے یہ علم نہ تھا کہ ہنوز نہ مار دل سن کا شہیار ہے۔ رب باتیں تفصیل سے لکھنا، بال کتنے لمبے ہیں دانت کیسے ہیں کس رنگ کا لباس پہنا کرتی ہیں وغیرہ۔ سینا کو پیادہ کر تمہاری مادھوری دراصل مادھوری ہوئیں تو میں بھی بہت جلد اُن کو دیکھنے آؤں گا۔

رام کیشور

(۴)

مسوری۔ مورخہ ۹ مئی

مس صاحبہ لگتی ہیں آج صبح درشن ہوئے۔ اُس وقت ہلکی گلابی ساڑھی پہنے ہوئے تھیں اور پاؤں میں

قیمتی کا مدار چتا تھا۔ خانسا مال سے میں نے دریافت کیا ہے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ گرمیوں میں اکثر مسوری میں رہتی ہیں ڈیکٹ جمع کرنے کا بہت شوق ہے کوئی دو ہزار ڈیکٹ جمع کر چکی ہیں ملازمین سے بہت اچھا رتاؤ کرتی ہیں ٹینس کھیلتی ہیں ناچ دیکھتی ہیں۔ بائیل پڑھتی ہیں۔ غرض بحیثیت مجموعی ایک جبریت انگیز ہستی ہیں۔ بس آج اسی قدر باقی کل۔ وجہ یہ ہے کہ میں آج مادھوری اور ان کی خالہ کے ساتھ سیبنا دیکھنے جا رہا ہوں شایام چرن

(۵)

مسوری مورخہ ۱۱ مئی

مادھوری ایک نہایت خوبصورت لڑکی ہے۔ ایشو نہیں جلد اچھا کر دے۔ تم خود دیکھ لو گے۔ جب منستی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے گویا پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ ایسی حسین دوشیزہ میری نظر سے پہلے نہیں گذری۔ آنکھوں کی خوبصورتی کے متعلق کچھ لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ اُس کے خصائل متعجب کن ہیں۔

چودہ سال کی لڑکی میرے کمرے میں دوڑتی ہوئی آکر پوچھتی ہے "در حاجی آج کچھ ڈیکٹ آئے کبھی نکاہ نہیں اٹھتی حالانکہ میں بہت محتاط ہوں تاہم اگر یہی کیفیت رہی تو تعطیل کسی اور جگہ گزارنی ہوگی اگر تم دیکھنا چاہتے ہو تو جلد بھجے چنگے ہو کر آؤ۔"

شایام چرن

(۶)

اڑکھنؤ مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے شایام چرن جی

بھگوان کے لئے اور دس بارہ دن مسوری ٹھہرے ہیں بہت جلد اچھا ہو جاؤں گا۔ ٹانگ کا زخم مندمل ہو چکا ہے دین دن کی کسر ہے۔ لیکن ابھی ڈاکٹر صاحب آٹھ دس روز نہیں اٹھنے دیں گے۔ کیا اس کی کوئی تصویر بھیج سکتے ہو یہ خط میں بہت عجلت میں لکھ رہا ہوں۔

(۷)

مسوری مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

تار کے پارسل سے رس گئے اور امر تی بھیجے۔ بے تکلفی روز بروز بڑھ رہی ہے اس نے بتایا کہ اُس کا پہلا نام فیلس ہے فیلس مادھوری دت تم یہ معلوم کر کے خوش ہو گے کہ وہ رباب پر بہت عمدگی سے گاسکتی ہے اس سلسلہ میں آج میں نے تمہارا ذکر کر دیا۔ کہنے لگی وہ کب تک آئیں گے۔ میں تو مینے سوا مینے میں چلی جاؤں گی۔ تمہاری تصویر دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے کل دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ باوجود عیسائی ہونے کے اس کا میلان زیادہ تر ہندو دھرم کی طرف ہے۔ ہندی منظومات سے بہت دلچسپی لیتی ہے کوئی ہندی فلموں کی اچھی سی کتاب اپنے ساتھ لیتے آنا لیکن میری مٹھائی مت بھولنا،

شایام چرن

(۸)

مسوری مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

صرف شکر یہ ادا کرنے سے کیا ہوتا ہے بغیر دس لکھ اور امرتی کے کام نہیں چلے گا میں محنت بھی تو خوب کر رہا ہوں ہاں تو بتاؤ تم خود عیسائی ہو جاؤ گے یا اس کو شدہ کر دو گے۔ وہ کہتی ہے کہ میں ہندو دھرم کی پرستار ہوں۔ لیکن نانا کے خوف سے اپنا مذہب چھوڑنا پسند نہیں کرتی۔ یہ کان کھول کر سن لو گا ایک عیسائی عورت سے ہمارا کوئی سروکار نہیں ہو سکتا۔

اس نے تمہاری تصویر دیکھنے کو لی تھی اب کہتی ہے کھو گئی اب میں تم سے اس کی سفارش نہیں کر سکتا۔ مجھے پسند نہیں کہ تمہاری بیوی جھوٹی ہو۔ تمہاری تصویر اس نے بائبل میں رکھی ہے اور روز بائبل پڑھنے کے جیلے سے تمہارے درشن کرتی ہے اُن عورت کا دل بھی کس قدر فریب آشنایا ہے اگر مجھ سے یوں ہی مانگتی تو کیا میں اس کو نہ دے دیتا۔ تم نے دریافت کیا ہے کہ کیا میں مادھوری کو ایک مختصر مکتوب محبت لکھ سکتا ہوں سنو تم ہرگز نہیں لکھ سکتے کیونکہ مندرجہ جی اس کے باہر سے آئے ہوئے خطوط کو بڑے غور سے پڑھتی ہیں دوسرے ابھی اُس کا سن ہی کیا ہو شیام چرن

(۹)

از مسوری مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

داغ ہو کہ بنی بنائی بات بگڑ گئی۔ مندرجہ جی نے کل بائبل میں تمہاری تصویر دیکھ لی۔ وہ مجھ سے بھی منہ پھلائے بیٹھی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے مادھوری نے بھی خالہ سے کچھ گستاخی کی ہے۔ ایسی حالت میں تمہارا یہاں جلدی کر کے آنا محض بیکار ہے ٹانگہ جب بالکل اچھی ہو جائے اور ڈاکٹر صاحب اجازت دیں تو روانہ ہونا۔ ورنہ ابھی ٹھہرو۔

(۱۰)

از مسوری مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۳۱ء

جناب ڈاکٹر صاحب

میں نے سوچا تھا کچھ اور جو کچھ رام کشور کا یہاں عجلت کر کے آنا یقیناً نامناسب ہے جس طرح ممکن ہو اُس کو اور کچھ دن روکے آج اُس کا تار پلا ہے کہ میں پرسوں روانہ ہو جاؤں گا۔

شیام چرن

رام کشور معرفت ڈاکٹر ٹنڈن سندر باغ لکھنؤ
فی الحال آنا بیکار ہے۔ ٹھیک وقت پر اطلاع دوں گا
شیام چرن
۳۱-۵-۳۱ تار

دو ماہری ویلا مسوری
میرا آنا پوشیدہ رکھا جاسکتا ہے کل روانہ ہو جاؤں گا۔
رام کشور
۳۱-۵-۳۱ تار

رام کشور معرفت ڈاکٹر ٹنڈن سندر باغ لکھنؤ
پاگل پن نہ کرو۔ تم اس سے مل نہیں سکتے۔ اُس نے اپنی محبت ظاہر کر دی ہے۔ اس سے
ہر قسم کی ملاقات بند کر دی گئی ہے۔
شیام چرن
۳۱-۵-۳۱ تار

دو ماہری ویلا مسوری
ملاقات بند کر دی گئی ہے؟ بس انتہا ہو گئی آج رات کی اکسپریس سے روانہ ہوتا ہوں۔
رام کشور

مسوری۔ مورخہ ۲ مئی ۱۹۳۱ء
پیارے رام کشور

مجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں۔ تم کو منہ نہیں دکھا سکتا لہذا آج مسوری سے روانہ ہو رہا ہوں۔ ڈاکٹر
ٹنڈن سے تمہاری کیفیت معلوم کر کے تمہاری طبیعت بہلانے کے لئے میں نے تیرے کرب سوچی تھی اور اس لئے
اس عیسائی لڑکی کا من گھڑت قصہ چھڑ دیا تھا میں کیا جانتا تھا کہ تم اتنے بے صبر ہو جاؤ گے۔ ابری ویلا ایک کشمیری
دوست کا بھگت ہے۔ میں نے پورا بھگت کرائے رکھا ہے میں یہاں نہ کسی کرسمس اور نہ کسی ہندو کا بچ کی لڑکی سے
آشنا ہوں امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔
شیام چرن

تقی علی یاسمی ناگ پور
(ترجمہ از مسروتی)

غزل

فقر پر دے میں پہناں ہی غنایمے لئے مسند شاہی ہے میرا بوریا میسے لئے
 اُس نے کی تجویز کچھ ایسی دوامیرے لئے دوست میسے کر رہے ہیں اب عامیسے لئے
 تو نہ کر افسوس اے جانِ وفا میرے لئے عشق تھا شرط اور محرومی جسدا میسے لئے
 کوئے جاناں کے لئے میں ہی نہیں ہوں مضطر کوئے جاناں بھی ہوا آتش زیر پامیسے لئے
 وہ نگاہیں کاہے کوہوتیں مر دت آشنا رہ گئی سرِ پستی میری وفا میرے لئے
 کعبہ مقصود ہے مجھ کو کسی کی رہ گزر ! ہے کل امید ہر ہر نقش پامیرے لئے
 اب خفا ہونے لگے ہو مجھ سے ہر بات پر تم کہ ہو جاتے تھے دشمن سے خفا میرے لئے
 دل دکھتا ہے ادھر ادھر زُند ادھر ان کا مزاج کس قدر مشکل ہے عرضِ وفا میرے لئے

محفلِ اغیار میں وحشت نہیں میں نامراد

مضطر ہے وہ لگاؤ آشنا میسے لئے

رضا علی وحشت

بدھ اور اُس کا ممت

سائنس کی ترقی کے ساتھ جہاں مذہب سے بیگانگی نے ترقی کی دہاں مذہب کے متعلق تاریخی تحقیقات کا ذوق بڑھا۔ اس سلسلے میں مذاہب کا مقابلہ شروع ہوا تو بدھ مت کی جانب دنیا کی توجہ مبذول ہونے لگی۔ حتیٰ کہ اب بدھ اور اس کے مذہب کے متعلق کئی مسبوک کتابیں ہمالیہ کے مذاہب میں شائع ہو چکی ہیں۔ حال میں ایک ضخیم کتاب سرسرنس ڈیوڈس نے "ساکیا" کے نام سے شائع کی ہے جس میں راج ہے کہ بدھی مذہبی کتابیں دنیا بھر کی مذہبی کتابوں سے شامیں کہیں زیادہ ہیں۔ اس کتاب میں بدھ مت پر نہایت مفصل نکتہ چینی کی گئی ہے۔ نگہ شدہ چند سال میں بدھ دھرم کی جائزہ (ڈاکٹر پریٹ) لائف آف بدھا (بروسٹر) لائف آف بدھا (ہرالد) اور سرہری سنگھ گوری کی کتاب "جوہر بدھ مت" شائع ہوئی ہیں مختلف کتب کے مطالعہ سے مذہبی تحقیق کے شائق پریشانی میں پڑ جاتے ہیں کہ کس واقعہ کو صحیح اور کس کو غیر صحیح مانا جائے۔ کثرت تغیر خواب ہی کو پریشان کر دیتی ہے۔ آخر کیونکر کتب قدیم کے ذخائر سمندر میں سے اصلی اوقات دریافت ہو سکیں۔

بدھ مذہب کے مختلف فرقے۔ جب کہ الہامی کتب کے پڑوں میں کثیر التعداد فرقے ہو گئے ہیں تو بدھ مذہب میں جو انسانی دماغ کا نتیجہ ہے۔ فرقے کیوں نہ پیدا ہوتے۔ واضح ہو کہ بدھ دھرم کے دو بڑے فرقے ہیں ایک جولپنے کو متایا نا کہتا ہے یعنی طبی سواری۔ اس نے دو کئے فرقے کو جس میں یا یعنی چھوٹی سواری کا نام دے دیا ہے۔ مگر وہ اپنے تئیں شراواڈا کہتے ہیں۔ اول اندر کے اصول میں دیانت کے فلسفہ کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ آخر اندر میں لا اور یہاں دہریہ خیالات کا رنگ غالب ہے۔ ان دونوں فرقوں کی کئی اور شاخیں ہیں جن میں کئی مونگا فیاں کی گئی ہیں میرا عقیدہ ہوتا ہے کہ مطالعہ سے قائم ہوا ہے کہ کوئی مذہب اپنی اصلی سادگی مدت تک قائم نہیں رکھ سکتا یہی صورت بدھ مت کی ہے۔ یورپین مصنفوں نے بدھ کو ٹھکانے پیرا بول میں دکھایا ہے۔ اور اس کی تعلیم کو اپنے خیالات کے مطابق رنگ دے دیا ہے۔ چنانچہ :-

ایک صاحب اس کو دہرہ کہتے ہیں اس کی تعلیم کو بے معنی کہتے ہیں اور اس کو فلاسفی کی نقل سمجھتے ہیں۔

دوسرے صاحب اس کو لا اور یہاں اس کی تعلیم کو موجودہ سائنس کے مطابق سمجھتے ہیں۔

تیسرے صاحب اس کو دیک مذہب کا پیر و اور آپ نشوون کا قائل بیان کرتے ہیں۔

چوتھے صاحب اس کو صرف انباتے جنس کے دروالم کو محسوس کرنے والا اور اس کا درمان تہانے والا کہتے ہیں۔

پانچویں صاحب۔ اس کو انسان و حیوان کا شفیق اور محبت کرنے والا تصور کرنے میں اور محبت کا پہلا موجد سمجھتے ہیں۔

چھٹے صاحب بُدھ نے پھر بعد کی تحریکیں اور بغیریں سمجھتے ہیں بقول ان کے صرف پہلا دھرم جو بُدھ نے سارا نہیں کیا مافظوں نے سید برہمنہ صحیح طور پر بُدھ کے اپنے لفظوں میں یاد رکھا ہے۔
جو مصنف بُدھ مت کے پیرو ہیں انہوں نے اپنے اپنے ایمان کے مطابق اس کے سوانح اور تعلیم بیان کی ہے۔ تاہم فرقہ کو سنسکرت اور پالی اور دیگر غریب زبانوں کی ناواقفیت کے باعث یہ جو صلاہ نہیں کر سکی وہ لائق یا اعتماد سے اہلیت کو بعد کی تحلیفات سے جدا کر سکے۔ تاہم اکثر ایسے واقعات ہیں اور بہت سا حصہ بُدھ کی تعلیم کا ایسا ہی جس میں اختلاف نہیں۔ چنانچہ بُدھ کے واعظ بننے سے قبل کے واقعات کتب معتبرہ میں یوں بیان ہوئے ہیں :-

بُدھ کی پیدائش اور حالات نیپال کے ترائی میں ایک بڑی زمینداری یا ریاست توتلی تھی جسے سنسکرت میں کپل و ستوا درپالی میں کپل و ستھو کہتے ہیں۔ اس کا راجا یا حکمران سدھو دھن ساکھیا قوم اور توئم گوت کا تھا۔ اس نے کوہیا قوم کے راجا کی دو بیٹیاں بیاہی تھیں ایک کا نام مایا تھا جس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سدا رتھ رکھا گیا۔ کوہیا قوم دریا کے دہن کی پار بسی تھی۔ یہ دونوں راجے کشرتری تھے۔ دستور تھا کہ رانی اپنے میکے جا کر بچہ دیتی تھی چنانچہ مایا میکے روانہ ہوئی مگر راستے میں ایک جنگل موسوم علم مینی میں اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سدا رتھ رکھا گیا۔ اس کا زائچہ تیار ہوا۔ اور ماہر ان علم جو تیش نے پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکا پھر درتی یعنی یا تو دنیا کا عظیم الشان بادشاہ ہوگا یا روحانی مملکت پر تسلط کرے گا۔ جب سدا رتھ عظمت کے درجے کو پہنچا، تو فطر العظیم سے بہت سے نام اُس کو دئے گئے مثلاً

ساکیا سنی۔ قوم ساکھیا کا دانشمند۔

بھگوت۔ مخمزم۔

ستھا۔ استاد۔

جنا۔ فاتح۔

بُدھ۔ منور۔

علی العموم اس کو بُدھ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اپنے نہیں بُدھ تھا گت (یعنی مثل دندکان سابق) کہا کرتا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ اس سے پہلے بھی بہت بُدھ گذر چکے ہیں جن کے سلسلہ میں وہ خود کو تصور کرتا تھا۔
بُدھ دھرم کا بانی ۵۶۵ء ق م میں پیدا ہوا۔ ساتویں صدیء ق م کی والدہ مایا انتقال کر گئی۔ اس کی ماں پر جاپتی نے جو ستوبی والدہ تھی اُسے پرورش کیا۔ انیس سال کی عمر میں اس کی شادی اس کی ایک رشتہ دار دوسوہل سے ہوئی۔ یہ کوہیا قوم تھی۔ ۳۰ سال کے بعد ایک لڑکا اس بیوی سے ہوا جس کا نام راہول رکھا گیا۔

ترک نہ کیا۔ سداۃ کی طبیعت نمایاں طور پر غیر معمولی تھی۔ وہ ثروت و دولت کے متقاضی نہیں تھے۔ آزاد خیال، ہر وقت سوچ سچا میں منہمک رہتا اور بے ثباتی عالم پر غور کرتا تھا۔ وہ بنی نوع انسان کے مصائب کا علاج سوچتا رہتا تھا۔ غلاموں، بیاموں اور مردوں کے نفاذ سے اس کے دل پر بے انتہا اثر کیا۔ ایک تاریک دنیا زاد کے دیکھنے سے اس کو سکون خاطر حاصل ہوا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ گھر سے نکل کھڑا ہو اور ایمائے جنس کے لامتناہی کرب و غم کو سچے کبھی امور مانع تھے لیکن جس دن اس کی پوری کے لڑکا پیدا ہوا اُس دن اس نے مستحکم عزم کر لیا کہ اس بچے سے بھی وہ آزاد ہو جائے گا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور گھر سے نکل پڑا۔ راستہ میں شاہی زیبائش کی سب چیزیں سائیس کے ماتھے واپس بھیج دیں۔ لمبے بال کٹوائے اور تاریک دنیا کا لباس زیب تن کیا۔ اور گندھکی راجہ جی راج گٹھ سپنچا دیاں فقرا، بوگی، برہمن، دیوتا و ان خادوں میں مراقبہ اور درس و تدریس میں مشغول پائے۔ آلا راکھانا اور ادکارا مینا جیسے دیوانوں سے اس کی تشفی نہ ہوتی چنانچہ وہ ایک جنگل کو جسے اُس زمانہ میں یوکر دیلا کہتے تھے روانہ ہوا۔ یہ جنگل گجیا جی کے نواح میں تھا۔ اس جنگل میں پانچ برہمن تسمیہ دھیان میں مصروف اُس کو ملے جو نفس کشی اور جسمانی بحالی کے لیے کی ریاضت میں مصروف تھے۔ سداۃ ریاضت میں ان پانچوں اہدوں سے بڑھ گیا۔ چھ سال یہاں وہ تپسیا کرتا رہا۔ اس تپسیا کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اس کی شہرت پھیلی کہ ہر شخص راہِ نجات کے قریب پہنچ گیا ہے لیکن اُس کی اپنی طبیعت پر پورے اثر ہوا اس کا تو منہ جرم اور جبین صورت محض ایک سایہ رہ گئے۔ ایک روز وہ بیہوش ہو کر گر گیا۔ ایک گوان شو مانے جس کا نام بُدھی کتابوں میں لڑواں ہو گیا ہے۔ اُس کو دودھ دیا ہوش میں آیا تو اُس نے غلط راستہ چھوڑنے کا عزم کر لیا۔ اس نے معمولی غذا کھائی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پانچ برہمن اس سے منغص ہو گئے۔ اور بنارس کو چلے گئے۔ جسے وہ زیادہ مقدس اور مناسب مقام سمجھتے تھے۔

نروان اور دیگر حالات، سداۃ ایک پہل کے تلے بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں جذبات کی کشمکش ہوتی رہتی۔ بیان ہوا ہے کہ ماٹا یعنی بدھی کے دیوتائے اُسے ڈرایا۔ لُبھا یا گمراہ اپنے ارادے پر قائم۔ باہرات ہنسنے محبت میں صرختے ہوئے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کو نور باطن حاصل ہو گیا ہے یعنی بُدھ ہو گیا ہے جس کے معنی ہیں کہ وہ پھر جنم نہیں لے گا۔ گویا کامل ست نگاری اسے حاصل ہو گئی۔ اس نے درد و الم کا درمان دریافت کر لیا ایک ہفتہ وہ اس دریافت کی مسرت سے غفلت اور دنگن رہا سوچتا تھا کہ اپنی دریافت کا انکشاف کسے یا نہ کرے۔ اسے خیال یہ تھا کہ کلن ہے کہ اس کا مسلک کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ آخر اس کے دل نے اسے ہدایت دی کہ نہیں خواہ کچھ ہو اس مسلک کو لوگوں پر ظاہر کرنا چاہیے۔ بُدھ مذہب کی کتابوں میں اس کی دماغی کشمکش کی حالت نہایت فصاحت اور بلاغت سے بیان کی گئی ہے۔ راتم لہر دھ میں وہ درویش نہیں کہ اس بیان کے منبع کی جرات جسے پہل کیجئے بدھ مٹھا تھا اس کا بچہ آپ تک موجود ہے۔ اس مقام کو بُدھ گیا کہتے ہیں۔ یہاں ایک عظیم الشان بے مثل مندر زمین سے برآمد ہوا ہے جو ایک

شیوہی رادھو کے زیر اہتمام ہے۔ اس میل کی ایک شاخ اشوکلکھمد میں اُس کا فرزند دھو جسٹھ لگے تھے جہاں وہ درخت ہو گیا۔ اس کا اب تک طواف ہوتا ہے۔

اب سدھارتھ بھگتی حیثیت سے بنارس جاتا ہے۔ وہی پانچویں برہمن اُسے مل جاتے ہیں جس مقام پر وہاں لے تھے سارناٹھ میں واقع ہے جو شہر بنارس سے میل ہے اور جو کسی زمانہ میں کاشی جی (بنارس) کا حصہ تھا۔ اس مقام پر ایک قدیم ستوپا تھا۔ اس پر شہنشاہ ہمایوں تخت پر بیٹھا تھا اس آفتہ کی یادگار میں اکبر نے ایک گنبد بنایا اور اس پر ایک فارسی قطعہ کندہ کیا جس میں اس کے باپ کے ہمایاں آنے کا ذکر ہے۔ اس کندہ تحریر پر ہجری سنہ مطابق ۹۷۷ھ کے ہے۔ یہاں بڑھنے پہلا غظنا یا تھا جو بڑھ دھرم کی بنیاد ہے سارناٹھ بعد میں یعنی اٹھویں صدی کے زمانہ میں بارونق اور مقتدر ہو گیا کبھی سٹوپے، مندر، درگا ہیں یہاں نہیں اور تباہ ہوئیں پھر نہیں اور تباہ ہوئیں۔ صدیوں کے انقلابوں اور بربادیوں کے بعد اب پھر ایک رفیع اور عظیم الشان بُدھی مندر تیار ہو گیا ہے سارناٹھ کے پھر نصیب جاگے ہیں اُس کو سیات تازہ حاصل ہو گئی ہے۔

بُددھ کے وعظ اور قانون اخلاق۔ اگر ہم بُددھ کے غظوں اور مقالات کو بیان کریں تو کئی جلدیں درکار ہونگی۔ بعض پر اعتراضات بھی ہیں کہ وہ بعد کی اختراعات ہیں لیکن کم از کم پہلا غظ نکتہ عینی سے مُعرّض ہے قبل اس کے کہ ہم اس غظ کو نقل کریں یہ بتانا ضروری ہے کہ بُددھ نے ایک قانون اخلاق دنیا داروں کے لئے بھی وضع کیا جس کی اس نے تلقین کی اور ایک فرقہ تفرقا قائم کیا جس کے لئے اس نے سخت قواعد مقرر کئے۔ شروع میں یہ فرقہ جو بھکو کہلاتا تھا صرف دو گور پر محدود تھا۔ بعد میں اس نے اپنی ماسی کے اصرار پر اور اپنے شاگرد رشیید اندکی سفارش پر انات کو بھی اس میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ ابتدائی زمانہ میں یہی بھکو اور بھکشین تھیں جنہوں نے یہ دھرم دنیا میں پھیلایا۔ بعض محکمہ چینیوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ بُددھ مرت حزن و ملال اور یاس و حزن کا بھگم موند ہے۔ اس میں نشاط و مسرت، اطمینان، امید قطعی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں راگ اور ویراگ دونوں ہیں۔ یہ مت سب زنجیروں سے آزاد ہے کسی کا خوف و خطر نہیں۔ واقعیت اس کی کلید ہے۔ انسانوں کے آلام باعث ملال ہیں۔ اُس کے مدافعت میں کامل مسرت اور بوجہ ہے کہ محسوس یعنی دنیا داری کے زندگی کو بدھ دھرم نفرت یا بے اعتنائی سے نہیں دیکھتا بلکہ تفصیل سے بُددھ نے گھر گھر کے لئے ہدایات دی ہیں۔ بھکوؤں کے لئے تجر و ضروری ہے۔ ان کا فرض چنانوں بدھ ماکر چار کریں۔ ملکوں میں پھرنا اور تبلیغ کرنا ان کا کام ہے۔ بھکو تو مُنک (Munk) ہیں نہ ایسے تارک ہیں کہ پھر دنیا دار نہ ہو سکیں۔ ان کو اجازت ہے کہ اگر قواعد کو وہ برداشت نہ کریں تو سنیا سیوں وغیرہ کے برعکس دوبارہ دنیوی زندگی اختیار کر لیں۔ بجائے اس کے کہ حرکات ناشائستہ کریں۔

پہلا غظ۔ اب ہم غظ اولیں بیان کرتے ہیں۔ بُددھ دھرم سمجھنے کے لئے یہی کافی ہے۔ پالی زبان میں یہ

و عظم من وعن بلانک و کمارت انہیں الفاظ میں جو ذات مبارک کے دہن سے نکلے تھے محفوظ ہے۔ رب موزوں اور محققوں کا اس بارے میں اتفاق ہے:-

سنو بھکتو! یہ مسک دکھ نوارنے کے لئے مشاہرہ ہے۔ یہ مسک پہلے کسی نے نہ سنا تھا۔ مجھ میں روشنی علم، ادراک عقل پیدا ہو گئی ہے۔ اس مسک کو سمجھنا چاہئے۔

سنو بھکتو! ان عالی چابیوں کو مع ان کے بارہ بابوں کے میں پہلے نہ سمجھ سکا تھا۔ نہ اس دنیا کے دیوتا مارا یا رہا ہے۔ نہ تارکوں نہ برہمنوں سے مجھے کچھ حاصل ہوا تھا۔ اب مجھے نور باطن حاصل ہو گیا ہے۔ یہ زیت میری آخری زندگی ہے۔ اب میں دوسرا قالب اختیار نہیں کروں گا۔ مجھے اب رست نگاری حاصل ہو گئی ہے۔ رست نگاری کے خواستگار کو دو آتوں (Exaltation) سے احتراز کرنا چاہئے۔ ایک ات لذات و خواہشات نفسانی کا پورا کرنا ہے جو ذیل اور بیچ ہے۔ دوسری ات بچہ نفس کشی اور جسمانی تعزیر ہے جو دکھ و اہمک اور بے سود ہے۔

مسک درمیانہ جو تنہا گت لئے معلوم کیا ہے۔ ان دونوں غلط رستوں سے الگ ہے۔ جو آنکھیں کھول کر دیکھتا ہے جو بصیرت نبشتا ہے۔ خود مندی مخلصی، بیداری، دھیان کی راہ بتلاتا ہے۔ یہ ذیل کا ہر شے کا مسک گرامی ہے۔

رائے مسیح۔ تنہائے مسیح۔ کلام مسیح۔ اعمال مسیح۔ معاش مسیح۔ سہی مسیح۔ توجہ مسیح۔

اب دکھ کی حقیقت حرب ذیل ہے:-

پیدائش دکھ ہے۔ فارضہ دکھ ہے موت دکھ ہے۔ اندوہ غم و درد دکھ ہے۔ آہ و زاری دکھ ہے۔ ناگوار کے ساتھ ملاپ دکھ ہے۔ پیاری چیزوں سے لگاؤ دکھ ہے۔ ناکام خواہش دکھ ہے۔ القصد لگاؤ کے پانچوں زمرے دکھ ہیں۔ دکھ کے اسباب کی حقیقت حسب ذیل ہے۔

سچ جانویشکلی ہے یعنی زیت کی ہوس اور اس کے لطف اٹھانے کی تمنا جس سے پُر خیم ہوتا ہے تاکہ کسی کسی طرح خواہشات نفسانی پوری ہوں۔ ہوائے نفسانی کے بھونکنے کی ہوس۔ ہوس زیت خواہ زندگی، مال یا زندگی آئندہ کی ہو یا آرزوئے فنا۔ دکھ کے پیداکرنے والے ہیں۔ دکھ کے ذائل کرنے کی حقیقت یہ ہے:-

اس ہوس کو قطعی نیت و نابو کرنا۔ اس پر فتح پانا۔ اس کا فنا کرنا ہے۔ اب حقیقت گرامی اس مسک کی جس سے دکھ کا ناش ہوتا ہے یہ ہے:-

سچ جانویشکلی مسک گرامی ہے یعنی رائے مسیح۔ تنہائے مسیح۔ اعمال مسیح۔ معاش مسیح۔ سہی مسیح۔ توجہ مسیح۔

توضیح:- یہ الفاظ بدھ کے تھے۔ بظاہر یہ بالکل سادہ معلوم ہوتے ہیں بلکہ تقریباً اتنے سادہ کہ حیرت ہوتی ہے کہ کیسے وہ اتنے بڑے مذہب اور فلسفہ کی بنیاد ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کا پورا مفہوم سمجھنے کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہے اور یہ

اس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کو اکثر پڑھا جائے۔ اور ان پر لغت سے دھیان کیا جائے۔ ان کی مختصر تفسیر کی جاتی ہے (از مٹر سٹراس) حقیقت اول کی زیادہ توضیح کی ضرورت نہیں۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی دکھ سے پڑے اور اگر سببت بھی کسی موقع پر ہم کو جسمانی یا ذہنی دکھ نہیں پہنچتا تو یہ صرف دکھ کے وقفے ہیں۔ مثلاً اگر گذشتہ جنگ عظیم کے بے شمار یرد اور پڑشوب تلخ کج خیال میں نہ لائیں کیونکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا تو ذرا ہسپتالوں، سینما خانوں، پائل خانوں، غزبا کے سانس، ذبح خانوں اور اسی قسم کے مقامات کو دیکھنے تو حقیقت اول کی صداقت کا تین تین ہو جاتا ہے۔

وہ شخص بدھ کے مت کو کیا سمجھ سکتا ہے جس کی رائے میں ہی دنیا سب دنیاؤں سے بہتر ہے (مثلاً اینٹ) یا جو اتنا اندھا یا خود پرست ہے جسے ہر جگہ جہاں میں بے اندازہ دکھ نظر ہی نہیں آتا۔ لگاؤ کے پانچ زمرے جو اوپر بیان ہوئے محتاج صراحت ہیں۔

بدھ نے سائنفلک طرق پر شخصیت کا پانچ حصوں میں تجزیہ کیا ہے۔
جسم۔ احساس۔ تفہیم۔ سخت شعور۔

بدھ نے ثابت کیا ہے کہ مفرد اور مجموعی حالت میں یہ حالتیں عارضی ہیں اور ایسی عارضی حالتوں کی ہوس کا نام شخصیت ہے جو جلد یا دیر سے دکھ پیدا کرتی ہیں لیکن دوسری حقیقت کی توضیح زیادہ تفصیل کی محتاج ہے۔ اس سے مالگیر دکھ کا سبب دریافت ہوتا ہے یہ ہوس ہے جو مختلف شکلوں میں نمودار ہوتی ہے۔ اس ہوس کے لئے پالی کا لفظ تشنا استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی پیاس کے ہیں۔ غالباً یہ لفظ اس لئے استعمال کیا گیا جو کہ گرم ملکوں میں پیاس زیادہ متاثر ہے۔ (تشنا فارسی لفظ تشنگی کے مترادف ہے)

ہم اپنے طرزیان میں اس کو ارادہ زلیت کہہ سکتے ہیں۔ یہ جگت (دھمار) بے آغاز بے انجام ہے ہستی یا جو نایا میں مبتلا ہیں ارادہ زلیت میں گرفتار ہو کر ہمارو کو نئے جنم اور نئے دکھ پاتی ہیں۔ اس تشنگی کی جڑ ارادہ ہیں جو ہوس زلیت میں نمایاں ہوتی ہے اسی سے ہوس جاہ ہوس شہرت اور ہوس لذت پیدا ہوتی ہے۔ بعض اشخاص کو خود کشی کی تحریک ہو جاتی ہے۔ یہ بھی منسل اور ہوسوں کے ایک قسم کی انانیت ہے جو بشکل تفر دھارت نمودار ہوتی ہے تیسری حقیقت سادہ اور صاف ہے۔ جب بدب یعنی پیاس ختم ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ پس حتی الوسع سار و زور اس پیاس کے فنا کرنے میں صرف کرنا چاہئے۔ چوتھی حقیقت۔ وہ مسک یعنی راستہ جس سے ہوس ختم ہوتی ہے۔ لہذا جس سے دکھ دفع ہو جاتا ہے۔ وہ ہست شکار مسک گرامی ہے۔ اس کے ہر حصہ کے ساتھ لفظ صحیح آتا ہے۔ بدھ کے کلمات میں صحیح کے معنی وضاحت سے کئے گئے ہیں جو ہم فلاح ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

ہشنگانہ مسلک گرامی

- (۱) رائے صحیح یعنی چار گرامی تختیوں اور مدھ کے سائے مت کو بونی جاننا وہوں اور تعصبوں سے آزاد ہونا۔
- (۲) ہٹنکے صحیح۔ ہڈہ مت کو درست سمجھ کر مستحکم ارادہ سے اس کی پیروی کرنا ثابت قدمی سے کام کے جاننا جب تک مراد حاصل نہ ہو جائے۔ یہ ارادہ کر لینا ہے کہ کسی کی بدخواہی نہیں کرنی ہے۔ نہ کسی کو رنج پہنچانا ہے۔
- (۳) کلام صحیح۔ جھوٹ نہ بولنا کسی کی بدگوئی نہ کرنا۔ نہ سخت کلامی کرنا۔ نہ اعتقاد یا وہ گوئی کرنا (مدھ نے اپنے شاگردوں سے کہا تھا کہ جب تم مل کر بیٹھو تو دو چیزیں تمہارے لئے مناسب مال ہیں (سہن آگر گفتگو یا متبرک خاموشی)۔
- (۴) اعمال صحیح۔ ایسے کام کرنا جن میں انسان یا حیوان ہلاک نہ ہوں۔ نہ ایسی شے لینا جو تمہیں بخوشی نہیں دی گئی اور ناپاک افعال سے احتراز کرنا۔
- (۵) معاش صحیح۔ ایسا پیشہ یا کام اختیار نہ کرنا جس سے اوروں کو دکھ پہنچے۔ مثلاً ذبح کرنا۔ شکار کھیلنا۔ مسکرات کا چہنہ۔ بردہ فروشی وغیرہ۔
- (۶) مسلک کے اس حصہ سے پایا جاتا ہے کہ یہ دایت سنگھا یعنی بھکوں کی جماعت ہی کے لئے مخصوص نہ تھی جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے بلکہ سب انسانوں کے لئے ہے کیونکہ سنگھا خاص قواعد کے مطابق دنیوی کاموں اور پیشوں کے اختیار کرنے سے منع کئے گئے ہیں۔
- (۷) سہمی صحیح۔ اس سے مراد ہے کہ بڑے خیال اور بڑی خواہشیں دل میں نہ آنے دینا اور اگر بڑے خیال اور بڑی خواہشیں پیدا ہو گئی ہیں تو ان کو دور کرنا۔ نیک خیالوں اور نیک خواہشوں کو جو پیدا نہیں ہوتی ہیں بھگانا۔ موجودہ نیک خیالوں اور نیک خواہشوں کو قائم رکھنا اور ان کو ترقی دینا۔ انسان کو چاہئے صالح خیال اور خواہشیں پیدا کرے۔ خواہشوں کی دکھ دائمی ماہریت پر غور کرے یا ان کے اجزا کو الگ الگ کر کے تحلیل کرے۔ یعنی ان کی ترکیب ایسی توڑ دے کہ وہ اپنے غصروں میں واپس چلی جائیں یا اپنی قوت اور برکت سے ان کو مغلوب کرے۔ پھر ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح مضمر خیالات اور خواہشیں پر آئندہ ہو کر خود ہی معدوم ہو جاتی ہیں اور انسان کا دل سکون اور امان پاتا ہے۔
- (۸) فکر صحیح۔ جسم۔ حسیات۔ خیالات اور اشکی حقیقت پر غور و فکر کرنا۔ ان چیزوں پر کامل غور کرنے سے یہ ادراک ہو جاتا ہے کہ ان کا آغاز اور انجام سلسلۂ اسباب پر اور تو انہیں کے مطابق ہے۔ نیز یہ کہ وہ عارضی ہیں اور کوئی شے نہیں جس کی نسبت کہا جاسکے کہ یہ میری ہے۔ یہ میں ہوں۔ مدھوں کے ہاں دعاؤں کے بجائے سجدے ہیں۔ کیونکہ کسی بالائی ہستی کے وہ قائل نہیں ہو ادا کر سکے یا نقصان پہنچا سکے پس کسی ہستی سے وہ دعا نہیں کر سکتے۔
- ۸ توجہ صحیح۔ من کو استہرک کے اپنے باطن کا استھان کرنا ہے۔ اکثر اوقات اس طریق سے ایک حالت یہ پیدا ہو جاتی ہے اور ایسی حالت سے قبول بعض ادکلٹ (occult) یا ما فوقی افطرت طاقتیں حاصل ہوتی ہیں لیکن تہذیب اور

یعنی نبھان کے حصول کے لئے ان طاقتوں کی حاجت نہیں۔ وہ محض انجام تک پہنچنے کے ذریعے ہیں اور بدھ نے خود کہا ہے کہ منزل مراد کو پہنچنے کے لئے نہ ان کی ضرورت ہے نہ وہ کافی ہیں۔

پانچ پر ن۔ بدھ مت میں داخل ہونے کے واسطے پانچ اقرا کر کے پڑتے ہیں جنہیں پنج سیدہ کہتے ہیں وہ حرب ذیل ہیں۔ سر پر ن یعنی اقرار ہے۔

(۱) میں پر ن کرتا ہوں کہ میں کسی جاندار کو نہ ماروں گا (نہ انسان نہ حیوان کو)

(۲) میں پر ن کرتا ہوں کہ میں کوئی شے نہ لوں گا جو مجھے بخوشی نہ دی گئی ہو۔ (اس لئے سر قہر ہی منع نہیں بلکہ کسی حکمت سے کچھ حاصل کرنا مثلاً زیادہ سود لینا بافریب سے کچھ حاصل کرنا بھی منع ہے)

(۳) میں پر ن کرتا ہوں کہ نامائز خط نفس سے اجتناب کروں گا۔

(۴) میں پر ن کرتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں گا (جس میں کسی پر تہمت لگانا شامل ہے۔ تہمت سوا الفاظ ذیل میں منع کیا گیا ہے: تاکہ انسانوں میں نفاق پیدا نہ ہو۔ وہاں کا سنا یہاں دہرانا نہ چاہئے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ ایسے الفاظ مت نکالے جن سے نفاق بڑھے تاکہ وہ اس کا طغ اٹھائے۔)

(۵) میں پر ن کرتا ہوں کہ نشہ آور چیزوں سے احتراز کروں گا۔

بُدیہی کلمہ۔ بدھ مت میں ایک کلمہ پوجا کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ اس کو تین بنا ہیں کتے ہیں وہ یہ ہے۔

بدھم شرٹم گھمیا می = آتا ہوں میں بدھ کے قدم میں۔

دھرم شرٹم گھمیا می = آتا ہوں میں دھرم کے قدم میں۔

سنگھم شرٹم گھمیا می = آتا ہوں میں سنگت کے قدم میں۔

گویا اصول ایمان کا یہ خلاصہ ہے کہ بدھ دھرم والا عقل سلیم (بدھ) دھرم (فرائض) سنگھم (انسانی

برادری) کا قائل ہو۔

بدھ کے مجسمے۔ واقع ہو کہ بدھ نے اپنے مجسمے بت یا دیگر کسی قسم کے اشکال و تصاویر بنانا منع کر دیا تھا۔ تین سو سال تک اس کا کوئی بت نہ بنا۔ لیکن آخر قریب بات انسانی کو کون روک سکتا ہے۔ اس کی ذات بابرکات کی صفات نے دلوں کو اتنا تسخیر کر لیا تھا کہ لاکھوں بت بن گئے۔ شناختی اور مدح کی انتہا نہیں رہی اس میں شک نہیں کہ یہ محبوب انسان کروڑوں دلوں پر تسلط رکھتا ہے۔ یورپین اور امریکن بھی اس کے گرویدہ ہوتے جاتے ہیں۔ مگر لاڈلوں میں وہی مثل ہے۔ گھر کے جوگی جو گئے باہر کے جوگی سہ۔

شمس

صلاح

تجھے گماں ہو کہ ہے رات کی جبین تاریک
تجھے یہ وہم کہ ہے موتِ زندگی کا مال
ترمی نگاہ میں ہستی، رہیں کیفِ سکوں
تجھے بایں ہمہ دانش، غمِ زمانہ تلخ
تجھے خیال کہ قصرِ طرب ہے نقشِ بر آب
تجھے فسانہٴ باطلِ حدیثِ سوز و گداز
سکونِ قلبِ تری سعیِ ناتمام کی حد
چلا ہے تو کہ ہے دنیا مقامِ حزنِ ملال
ترا وہ قلب کہ آسودہ فریبِ جمال
وہ موجِ نلو کہ ہے جس پر گراں روانی کسیر
فسردگی سے ہے ظلمتِ فروشِ تیر خیال

مجھے یقین ہو کہ یہ بھی ہے موجِ گردشِ رنگ
مجھے یہ علم کہ باطل نہیں زمانہٴ تنگ
مرے خیال میں گیتی، مجھٹ شورشِ جنگ
مجھے بایں ہمہ کاوش، سرورِ بادِ رنگ
مجھے یقین کہ ضمِ افسریں ہو ریزہٴ سنگ
مجھے پیامِ حقیقتِ صدائے ربط و چنگ
نشاطِ روحِ مری بہت بلند کوننگ
بڑھا ہوں میں کہ تجھے دوں پیامِ ریش و رنگ
مری وہ روح کہ بیگانہٴ حجاب و درنگ
وہ صید میں کہ جسے خود ہوا آرزوئے خدنگ
شگفتگی سے ضیا آفریں۔ ہے میری اُمنگ

پھر اُس پہ دعویٰ نقد و نظرِ خدائی کی پناہ

کہاں جہاں حقیقت کہاں ضمیرِ گناہ

علی اختر
(جید آباد دکن)

عدنان

عدنان اُسی دن نیلوفر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جب وہ پہلے پہل خادمہ کی حیثیت سے کلب گھر میں داخل ہوئی تھی۔ نیلوفر نے اُس سے پچھا چڑھانے کی ہزار کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ وہ اُسے کام کے بہانے سے اپنی میز کے پاس بلا لیا کرتا تھا اور مشکل یہ تھی کہ نیلوفر ماہر داری کے متعلق بڑی خادمہ کی سخت ہدایات سے روگرداں ہونے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔ بڑی خادمہ جس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی ایک پاؤں سے ذرا سالنگڑاتی تھی۔ وہ نہایت ہوشیار اور جہاں دیدہ عورت تھی اور اگرچہ چھوٹی لوکیوں سے بہت شفقت کرتی تھی لیکن جب نیلوفر نے اُس سے عدنان کے طرز عمل کا ذکر کیا اور بتایا کہ میں اس وجہ اُس کی میزبانی کے فرائض انجام دینے سے قاصر ہوں تو اُس عورت نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ میری کچی تم بہت نادان ہو۔ اور اس کی شکایت رفع کرنے کا کچھ انتظام نہ کیا۔

پڑ بھگت کھانوں کی فرائشوں کے ساتھ ہی ساتھ عدنان نیلوفر پر اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا کرتا اور کتنا کمکش تم میری خادمہ ہونے کے بجائے ایک ہی میز پر بغیر کھانوں کی فرائشوں میں میری شریک بن جاؤ۔ نیلوفر زرب لب کستی زبان سنبھال کر بات کر رہا تھا اور پھر بلند آواز سے پوچھتی "ماہی پلاؤ یا مرغی آفندی؟" "مرگسی! اور نیلوفر مجھے تم سے محبت ہے۔ گاؤں میں میرا نصف سامکان تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" "میرا انتظار کر کے کرتے اُس کے کھنڈر زمین پر آ رہیں گے" (پھر آواز بلند) "سلم مرغ یا تیر آفندی؟" "تیر! اور مان بھی سی گڑیا کبھی کسی سے اتنی محبت نہیں ہوئی اور مجھے کبھی کسی سے اتنی محبت نہ ہوگی نیلوفر کیا تم میری بات نہیں سمجھ سکتیں...؟ بات ختم ہونے سے پہلے نیلوفر اُس کی فرائش کی تعمیل کے لئے جھاک کر سنی ان سنی ایک کر جاتی تھی۔

دومرتیہ نیلوفر طاعت سے کنارہ کش ہوئی لیکن دونوں مرتبہ وہ پھر ملتی گئی اور از بس کہ اُس کا باپ بیمار محتاج اور از کار رفتہ تھا وہ مجبوراً دوبارہ اپنی جگہ پر واپس چلی جاتی۔ کام کی اجرت سے وہ اپنے دو کمروں کا کرایہ ادا کرتے اور الغامات کی رقم سے اُن کے کھانے کا خرچ چلتا۔ انعام دینے میں عدنان سب سے زیادہ فراخ دل تھا۔ کبھی کبھی نیلوفر اپنے خیالات میں کھو جاتی اور سوچتی کہ اگر میں عدنان کی بات مان لوں تو اُس کی دولت سے میرے باپ کو کس قدر راحت ملے۔ اس خیال سے کئی دفعہ وہ اُس مکان کو بھی تصور میں دیکھتی جو عدنان نے

گھاؤں میں سیدب کے درختوں کے جھنڈکے درمیان بنا رکھا تھا پھر وہ تھا بھی ایک خوش مزاج اور پسندیدہ فصاحت آدمی اور ایک دن جب ناشانی کے پیرے رائے اور عتیٰ نقدر کی فرمائش کے دوران میں اُس نے کہا "نیلو فر اگر تم ایک ہی دفعہ اپنے محبوب قدموں سے میرے سیاہ خانے کی آبرو بٹھا سکو تو میں تمہیں ہزار رو الزمزدار دوں..." اُس دن وہ ایک لمحہ کے لئے ہچکچائی اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تامل کے اس دفعہ میں اس نے عدنان کی اگھول کے درمیان کی گہری ٹیکنیس اُس کی خمدار ٹھوڑی اُس کے ہموار دانت اور اس کی وہ نگاہیں جو فتح مندی کے خیال سے قبل از وقت چمک اٹھی تھیں دیکھیں۔ پھر عدنان نے اُس سے پوچھا تم یہاں سے کس وقت فارغ ہو جاتی ہو ٹیکنیس نیلو فر نے ترش روئی سے جواب دیا میں آپ کے فراغت پلنے سے پہلے فارغ ہو جاؤں گی۔ اس پر وہ انصرودہ و برغیدہ بٹھا ہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا نیلو فر اس وقت مینے کے سرے پر مالی برتنوں کے ایک نشست کو سہارا دے کھڑی تھی۔ دفعہ وہ یہ کہتے ہوئے الگ ہٹ گئی کہ اب کبھی کلب گھر دالے مجھے نہ بلائیں گے۔ ادیتون تمام۔ زمین پر گر کر پاش پاش ہو گئے۔

باپ کے مرنے پر نیلو فر نے ایک محرم سے شادی کر لی اور تیس سال سے زامدنت تنگی تشری میں کاٹی۔ اس کا شوہر کبھی بڑو بار ہو جانا کبھی چڑچڑا، وہ کبھی صابر ہو جاتی کبھی شاک، اور ان کے دو بچے کبھی فرشتے بن جاتے کبھی شیطان زندگی کے دن کسی ایسی بات کے لئے تیاری اور مصروفیت میں گزر رہے تھے جو ہمیشہ ان بوجھ کی ان بوجھ ہی نہ ہی نیلو فر جانتی تھی کہ اس کی چار دیواری کے باہر عظیم الشان اجتماعات ہیں، بڑے بڑے حادثات ہیں، سورج چاند اور ستارے ہیں لیکن وہ اپنے بچوں اور اپنے شوہر کی ضروریات کے خیالوں میں ایسی کھوئی سی رہتی تھی کہ ان چیزوں سے اُسے اپنا کوئی سروکار معلوم نہ ہوتا تھا۔ اُس کے لئے آئے دن ایک ہی جھگڑا، انت وہی مشتاقا۔

نیلو فر پچاس برس کی عمر میں بھی حسین تھی ان دنوں اسے اپنے ڈاکٹر سے معلوم ہوا کہ ہفتاد سالہ امیر عدنان قریب کے ایک بڑے شفاخانے میں مقیم ہے۔ وہ شریف اور رقیب الغلب تھی اس کے علاوہ اس کی زندگی کا ہلانہ بے لطفی میں بسر ہو رہی تھی۔ اس لئے تنہائی میں کئی دن کی سوچ بچار کے بعد ایک دن وہ چپکے سے ہسپتال میں چلی گئی جہاں پہنچتے ہی اُس نے عدنان سے ملاقات کی درخواست کی۔

وہ غسل کا بادامی لبادہ پہنے ہوئے، ایک دریچے کے قریب مطالعہ میں مصروف بیٹھا ہوا خوش روادریس معلوم ہو رہا تھا نیلو فر نے اُس کی آنکھوں کے درمیان گہری ٹیکنیس، اس کی خمدار ٹھوڑی اور اس کی گٹھائیں جن میں فتح مندی کی وہی غیر فانی چمک نظر آ رہی تھی، دیکھیں ٹیگفتہ روپری چہرہ عورت اس کے قریب بیٹھ گئی اور بولی آفندی میں آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں ہمیشہ آپ کو احسان مندی سے یاد کرتی رہی ہوں کیونکہ آپ

کے انعامات کے مدد سے میں میرے مرحوم باپ کو بہت آرام پہنچا تھا۔ میں وہی نیلوفر ہوں جو شہر کے کلب گھر میں آپ کی خدمت گار تھی۔ شاید آپ کو یاد نہ ہو۔

اُس کا چہرہ چمک اٹھا اور وہ نیلوفر کا ہاتھ عقلم کر بولا "ہاں مجھے خوب یاد ہے اور تم اب بھی حسین ہو۔" نیلوفر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر آپ کی یہ مدد شریک حال نہ ہوتی تو میرا مرحوم باپ کتنی ضروریات زندگی سے بھی محروم رہ جاتا۔"

وہ اپنا ہاتھ اٹھا کر بولا۔ لیکن مجھے سچ بتاؤ کیا تمہارے دل میں کبھی میرا خیال بھی آیا ہے؟
"ہاں اور ہمیشہ منت گزار رہی کے ساتھ"

پھر وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا کیا وہ دن بھی تھیں یاد ہے جب سہ پہر کے وقت ہم ایک پرانے باغ میں پھرتے رہے تھے اور پھر ایک سایہ دار درخت کے نیچے ہری ہری دھبے کے فرش پر بیٹھ کر میں نے تمہیں اپنے محل سوالوں سے گھبرا دیا تھا۔

نیلوفر نے حیران ہو کر اُس کے چہرے پر ستفیلہ دنگا پس ڈالیں۔ عدنان کی آنکھوں میں اُس وقت دلو انوں کی سی چمک نظر آتی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی دُور بہت دُور کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ پھر وہ آہ بھر کر کہنے لگا۔ میں کبھی وہ دن نہیں بھولا۔

نیلوفر گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی آفندی میں نیلوفر ہوں، شہر کے کلب گھر والی آپ کی پرانی خادمہ۔
عدنان نے ملاحظت سے کہا۔ ہاں تم نیلوفر ہی ہو۔ کیا تمہیں یہ شک ہے کہ مجھے یاد نہیں؟

(بہ تصرف اور ذکاوت)

حامد علی خاں

(۱)

سرخ گلاب میحانی کیفیات کا پتہ دیتا ہے، اور سفید پاک محبت کی نشانی ہے۔ گویا احمد بن گلاب بنزرد شاہ مبارک کے ہے اور بلوریں قمری کی مانند ہے۔

(۲)

اے دلو انز! میں تجھ کو ایک بلوریں کلی بھیجتا ہوں جس کی پتیوں کے سر پر گلابی تاج ہے کیونکہ پاک اور بے لوث محبت کے لبوں پر ہمیشہ بوسہ آرزو کا نشان ہوتا ہے۔
احمد الدین ادھر دی

صلح ادب

(۲)

بہ سلسلہ اشاعتِ ملیج

ہندوستان کے اصلی باشندے جنگلوں
میں رہتے ہیں۔

وجہ۔ اردو مصدر رہنا سے فارسی قاعدے
کے مطابق "رہائش" اصل مصدر بنالینا صحیح نہیں۔
فقہ۔ اس خاطر مدارات کے لئے مشکور ہو
اصلح۔ اس خاطر مدارات کے لئے ممنون
ہوں۔

وجہ۔ خاطر "تواضع کے معنی میں ہندی
ہے اور مدارات عربی لہذا او اعطف جائز نہیں۔
(۲) مشکور پسندیدہ کے معنی میں صحیح
لیکن ممنون کے معنی میں غلط ہے۔

فقہ۔ چُپ کر دیکھا چُپ دیکھا لگا رکھی ہے؟
اصلح۔ چُپ رہو کیا چُپ لگا رکھی ہے؟
وجہ۔ (۱) چُپ کرنا خاموش ہونا کے
معنی میں خیالی ہے۔ لیکن اردو میں خاموش کرانا
کے معنی میں مستعمل ہے۔ (۲) چُپ اور پکار دو دونوں
ہندی ہیں۔ اس لئے واؤ اعطف غلط ہے۔

فقہ۔ اُن آپ کی سی سنسی خیر خبر سنائی۔

شر

فقہ۔ احسن صاحب مع جناب انور کے شاعر
میں گئے تھے۔

اصلح۔ احسن صاحب مع جناب انور (بہ
سکون عین و کسرۃ باو) کے مشاعرے میں گئے تھے۔
یا

احسن صاحب مع جناب انور (بکسرۃ عین باو)
مشاعرے میں گئے تھے۔

وجہ۔ "مع" میں "ب" زائد ہے۔
فقہ۔ اغلبیہ ڈراما آپ کا شاہکار ہے۔
اصلح۔ غالباً یہ ڈراما آپ کا شاہکار ہے۔
وجہ۔ عربی میں افضل التفصیل "پر تومین
نہیں آتی۔ اسی طرح "اوسطا" بھی غلط ہے۔

فقہ۔ ہندوستان کے اصلی باشندے
جنگلوں میں رہائش رکھتے ہیں۔

اصلح۔ ہندوستان کے اصلی باشندے
جنگلوں میں بودو باش رکھتے ہیں۔

یا

اصلاح۔ اُف۔ آپ نے یہ کسی سنسنی پیدا کر دینے والی خبر سنائی۔

وجہ۔ سنسنی ہندی ہے اور تیز فارسی اس لئے ترکیب غلط ہے۔ اس کی جگہ کچکا دینے والی "الزہ" خیر بھی مناسب موقع لکھ سکتے ہیں۔

فقرہ۔ آپ کو اسے زرد کو ب کرنے کا مجاز نہیں۔
اصلاح۔ آپ اسے زرد کو ب کرنے کے مجاز نہیں۔
وجہ۔ مجاز اختیار کے معنی میں غلط ہے۔
فقرہ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتفاق دینا گناہ سے رہنا چاہئے۔

اصلاح۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتفاق دینا گناہ سے رہنا چاہئے۔

وجہ۔ "یگانہ" فارسی ہے۔ اس لئے عربی کے قاعدے سے اس کا حاصل مصدر بنانا غلط ہے۔

فقرہ۔ رفیق بیچارہ کئی سالوں سے بیمار ہے۔
اصلاح۔ رفیق بیچارہ کئی سال سے بیمار ہے۔
یا

رفیق بیچارہ برسوں سے بیمار ہے

وجہ۔ سال کی جمع تسالوں سے ذم کا پلو پیدا ہوتا ہے۔

فقرہ۔ میں جناب کے گرامی نامے کے مطالعے کے دوران میں کئی بار ہنسنا۔

اصلاح۔ میں جناب کا گرامی نامہ پڑھتے پڑھتے کئی بار ہنسنا

وجہ۔ تو ابی اضافات دے دے کہے کہے ہنر بان

میں کمزور ہے۔

فقرہ۔ آپ کی غزل کے دو اشعار مجھے بہت پسند آئے۔

اصلاح۔ آپ کی غزل کے دو شعر مجھے بہت پسند آئے۔

وجہ۔ اشعار دو سے زیادہ کے لئے لکھنا چاہئے۔ اسی طرح "دو احباب" دو آراء "دو شعرا" دو وزراء وغیرہ بھی صحیح نہیں۔

فقرہ۔ نہ تو آپ جلسے میں خود تشریف لائے اور نہ ہی اپنی نظم ارسال فرمائی۔

اصلاح۔ نہ تو آپ جلسے میں خود تشریف لائے اور نہ ہی اپنی نظم ارسال فرمائی۔

وجہ۔ "نہی" لکھنا صحیح نہیں۔
فقرہ۔ وہ سمندر پر دو تیرتی ہوئی لاشیں دیکھ کر ڈر گیا۔

اصلاح۔ وہ سمندر کی سطح پر دو تیرتی ہوئی لاشیں دیکھ کر ڈر گیا۔

یا

وہ سطح بحر پر دو تیرتی ہوئی لاشیں دیکھ کر ڈر گیا۔

وجہ۔ سطح عربی ہے اور سمندر ہندی۔ اس لئے اضافت غلط ہے۔ اسی طرح "عمرہ دراز عالم انسان" آغوشِ محشر "مینا ربلن" وغیرہ ترکیبیں غلط ہیں۔

فقرہ۔ اس تناہی ٹھانی کے تین بد سے جد سے حصے کر دو۔

اصلاح۔ اس تازہ ٹھانی کے تین جدا جدا حصے کر دو۔

وجہ۔ تازہ کی "ا" اور جدا کا الف کسی صوت میں بدلے نہیں جاسکتے۔

فقرہ۔ آپ تانہوز ہیں؟

اصلاح۔ آپ منہوز ہیں؟

آپ ابھی یہیں ہیں؟

وجہ۔ تانہوز "میں" تا "نہ" ہے۔

فقرہ۔ دہلی میں متعدد عالی شان عمارتوں کے کھنڈرات زبان حال سے جلیل القدر مسلمان بادشاہوں کی عظمت رفتہ کے افسانے سن رہے ہیں اصلاح۔ دہلی میں متعدد عالی شان عمارتوں کے کھنڈرات زبان حال سے جلیل القدر مسلمان بادشاہوں کی عظمت رفتہ کے افسانے سن رہے ہیں۔

وجہ۔ کھنڈر ہندی ہے۔ اس لئے عربی قاعدے سے اس کی جمع بنا غلط ہے۔

نظم

شعر۔ لاش پر میری پیانی کامیاب آیا تو کیا
بعد یہ میرے نامے کا جواب آیا تو کیا
اصلاح۔ میری بہت پر حوصلہ کامیاب آیا تو کیا
بیکہے، آہ اگر خط کا جواب آیا تو کیا

وجہ۔ لاش نہایت کمرہ لفظ ہے۔ پیانی بھی اچانک نہیں برصرع دوم میں دوسرا برسرے مستحسن ہے

شعر۔ پھر یہ فوج فہر موج اک حشر برپا کر گئی
برق طوفان تھی۔ جدھر جگہ صفا پا کر گئی
اصلاح۔ پھر یہ فوج فہر موج اک حشر برپا کر گئی
برق خافت تھی۔ گری جس جگہ صفا پا کر گئی
وجہ۔ برق چمک کر نہیں بلکہ گر صفا یا کر تھی

ہے۔

شعر۔ دکھان دل میں رہ کر دل کو شانِ لہو بازی
کہ گھر دل میں مے لے در عشق یا کر لینا
اصلاح۔ دکھان دل میں رہ کر دل کو شانِ لہو بازی بھی
ہم سے دل میں گھر لے در عشق یا کر لینا
وجہ۔ دوسرے مصرع میں کہ خوش ہے۔

شعر۔ خدا کچھ کو تجھ سے ہی محروم کر دے
جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں۔

اصلاح۔ تجھی سے خدا کچھ کو محروم کر دے
جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں

وجہ۔ آہ، تجھ سے ہی غلط اور تجھی سے صحیح
ہے (۳) تجھی سے کو شروع میں لائے سے اس پر زور

آگیا۔ جو شاعر کا اصل مقصد ہے۔

شعر۔ بیخون گشتہ تنہا مال کی اک روز چمکے گی
بسانِ غارِ زہرہ تنہا مال کی اک روز چمکے گی
اصلاح۔ بیخون گشتہ تنہا مال کی اک روز چمکے گی
برنگِ غارِ زہرہ تنہا مال کی اک روز چمکے گی
وجہ۔ بسان غار غار سے رنگ غار ہگمیں بہتر

ہے جس سے سا شعر چمک اٹھا۔
شعر۔ پھر گھر دش افلاک سے آزاد ہے گی۔

دنیا ترے کوچے میں گزرا باد رہے گی
اصلاح پھر گردش افلاک سے آزاد رہے گی
دنیا ترے کوچے میں جو آباد رہے گی
وجہ گرجائے اگر بلا اتفاق متروک اور آباد
کالف تقطیع میں گرتا ہے۔

شعر کیا کریں جا کے مدینے کی مکیں اب...
کون اب دھند سلطان عرب کے اٹھے
اصلاح کیا کریں جا کے مدینے کی مکیں...
کون اب دھند سلطان عرب کے اٹھے
وجہ پہلے مصرع میں اب حشو ہے۔

شعر کس طرح ہم کو ہوتہ کس طرف آپکا ہے رخ
ایک ہی ذرخسن ہے حلقہ شش جہاں میں
اصلاح ہم کو ہوتہ کس طرح کس طرف آپکا ہے رخ
ایک ہی ذرخسن ہے حلقہ شش جہاں میں
وجہ طرح کی رخ "تقطیع میں گرتی ہے۔

شعر کھل گئے عیب ہنر سب کاتب تقدیر کے
رنگ میں آمادہ پرواز ہر تصویر کے
اصلاح کھل گئے عیب ہنر صورت گزرتقدیر کے
رنگ میں آمادہ پرواز ہر تصویر کے

وجہ پہلے مصرع میں سب حشو ہے
(۲) کاتب مصور نہیں ہوتا۔

شعر تم ماہ نیم ماہ اگر ہو تو کیا ہوا
میں بھی تو آفتاب لب بام ہو گیا
اصلاح تم بڑھ کے حسن میں جو بھٹے نہ نیم روز
میں گھٹ کے آفتاب لب بام ہو گیا
وجہ بڑھنے اور گھٹنے سے معشوق کے خورشید

حسن اور عاشق کے آفتاب لب بام ہونے کا پورا
پورا ثبوت مل جانے کے علاوہ تقابل کے حسن نے
شعر کو چار چاند لگا دئے

شعر اس رنگ سے ہو کفر پرستی تو خوب ہے
زنا رڈا لے ترے پھولوں کے ہار کا
اصلاح اس رنگ سے ہو کفر پرستی تو گل کھلیں
زنا رڈا لے آئے کسی گل کے ہار کا

وجہ (۱) شاعر کو جو معنوں سو بھانپنا وہ خوبی
سے بندھ نہ سکا (۲) ترستے میں تخصیص ہے اور
کسی میں تعمیم اور ایسے موقع پر تعمیم "تخصیص" سے
کیں پر لطف ہوتی ہے۔

شعر ہو رہا ہے نئے انداز سے زنداں تعمیر
چُن کے دیوانے چنے جاتے ہیں دیواروں میں
غلطی چُن کے صحیح نہیں چُن چُن
کے محاورہ ہے۔

غزل

جب تک نہ پھر آؤ گے یہی یاد رہے گی نالی ہی ہو گا یہی فریاد رہے گی
بنلاؤ کبھی ہوگی عنایت کی نظر بھی یا ہم ہمیشہ یہی بیدار رہے گی
دل دینے میں مجبور ہی کچھ ہو گئے ورنہ معلوم تو تھا زندگی برباد رہے گی

جب بیٹھ گئے آن کے غم بھول گئے ہم

سیفی یہ تری زندہ دلی یاد رہے گی

سیفی ننگاوی

غزل

پھر آنکھیں ہے دیدہ حیرت پناہ کا پھر قصد کر رہا ہوں تری جلوہ گاہ کا
پیغام مرگ تھا دل حراماں نصیب کو ملنا وہ اور مل کے پلٹنا نگاہ کا
کتنی ہیں صاف اُن کی لپٹیاں نگاہیں احساس ہو گیا مے حال تنہا کا
طغیانیاں ہیں اشکِ ندامت میں دیکھنا اُچھلے گا ڈوب کر نہ سفینہ گنہا کا
صدقہ نگاہِ مست کا ساقی وہ مے پلا احساس بھی ہے نہ ثواب و گناہ کا

پھر جانوں تم کو دعوتی تمکین دہوش ہو

کیفی جو حسن دیکھو تم اُس رشکِ ماہ کا
محمد علی کیفی

خانم

اللہ جمیل و عجب الجمال

مندرجہ بالا عنوان کے معنی ہوئے کہ خداوند تعالیٰ خود خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ یہ تو ہوئے اس کے معنی اور اب گلے ہاتھوں میں تفسیر بھی کئے دیتا ہوں سے

(۱)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اتوار کے دن صبح نڑ کے ٹہلنے کی نیت سے گھر سے نکلا۔ پھر سوچا کہ کون دیکھتا ہے ذرا خاں صاحب کے ہاں ہوائیں۔ میں نے احمد کو پکارا "ادبے" میں نے کچھ دھمکائے ہوئے کہا "دیکھتا ہے بے" ہم ذرا ... وہ ہم ذرا ... ذرا خاں صاحب کے یہاں جا رہے ہیں یاد رکھنا پھر مری ادھیڑ دس گاہ جو کہیں

احمد نے معنی خیز طور پر سر ہلا کر کہا "ہست اچھا سر کار" اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ خانم پوچھے گی تو یہی کہہ دے گا کہ کھیتوں کھیت ٹہلنے گئے ہیں۔ خاں صاحب کے یہاں نہیں گئے ہیں۔ والد اعلم یہ بیویاں مردوں کے عزیز دوستوں کے کیوں اس قدر خلاف ہوتی ہیں کہ معلوم بھی ہو جائے کہ ملنے گئے ہیں تو نہ سہی تھوڑی بہت تھنوں کے ذریعہ سے گرم گرم سانسیں ہی چھوڑیں گی۔

قصہ مختصر کہ میں خاں صاحب کے یہاں پہنچا چوکی پر بیٹھے خضاب دھونے کے لئے ڈھانٹا کھول رہے تھے مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گئے کس محبت سے انہوں نے کہا ہے "آؤ یا مرزا" میں بیٹھ گیا۔ جلدی جلدی انہوں نے منہ دھویا تو نے سے منہ خشک کیا۔ لڑکے کو اپنے گالی دے کر شطرنج لانے کو کہا اور پھر تیل لگا کر اپنی ڈاڑھی کو چڑھانے بیٹھ گئے۔ ڈاڑھی کے بال دراصل کان تک پہنچ سکتے تھے اور وہ ارادہ کر رہے تھے کہ سر سے ہاتھ بھر ادبے پہنچا دوں۔

ڈاڑھی چڑھانے میں انہوں نے میرے سامنے تجویز پیش کی کہ لگے کہ پانچ پانچ روپیہ چندہ ہو دریا کنارے چل کر مچھیاں پکڑیں اور صوبی پوری رہے۔

میری باچیس اس تجویز پر کھل گئیں۔ میں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ ان کی ہدایت کی وادہی اور اس پر لطف نہ کر کہ بے حد پسند کیا۔ ذرا غور کیجئے گا کہ پسند کیسے نہ کرنا۔ دریا کنارے فرش بچھا ہوا ہے۔ حقہ لگا ہوا ہے۔

بنیادیں پڑی ہوئی ہیں اور شطرنج چور ہی ہے۔ قصہ مختصر میں نے ان کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے لفظ ”مگر“ کا استعمال کر کے وعدہ کیا کہ کل تک ہم اس کا جواب دے سکیں گے کہ ہم شرکت کر سکیں گے یا نہیں۔

خاں صاحب تجربہ کار آدمی کیوں ”ادھر کیا سے دو تین جرح کے جو انہوں نے سوال کئے تو ٹاٹا گئے۔ پھر آخر رازدار میرے ٹھہرے سب جانتے تھے کہ گئے کہ تمہاری ”گھر میں“ یوں ٹھیک نہ ہوں گی۔ ہم بتائیں ترکیب؟

میں خوش ہو گیا کہ یہ باہر نہایت اب مجھے کوئی نسخہ بتاتا ہے چنانچہ میں نے خوش ہو کر کہا: ”وہ کیا؟“
خاں صاحب نے اپنی انگلی دبھی کر کے اُس کا ہلکے بنا یا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ مرزا صاحب۔ میں تو کہہ چکا کہ یہ گئی سیدی انگلی نہیں بکھلے گا یہ تو اب ایسے بکھلے گا۔ یہ کہہ کر انگلی کا ہلکے سیدی آنکھوں کے سامنے نہچایا۔

”لا حول ولاقوہ“ میں نے کہا۔ کوئی ترکیب تو آپ بتاتے نہیں ہیں یہ تو سپاس دفعہ سن چکے۔
ایک دم سے سنجیدہ ہو کر خاں صاحب نے کہا: ”سن لو میں کان کھول کر۔ یہ پی پی ہے پی پی۔ یوں ٹھیک نہ ہوگی۔ اگر تاہم میں کرنا چاہتے ہو تو میری بتائی ترکیب پر کل ہی سے چلنا شروع۔۔۔۔۔ بلکہ آج ہی سے عمل کرنا شروع کر دو۔ اگر نہ ٹھیک ہو جائیں تو میرا ذمہ۔“

میں نے گردن کو جنبش دیتے ہوئے مایوسانہ لہجہ میں جواب دیا ”ہو چکیں“
خاں صاحب نے شرط کے لئے ہتھیلی پھیلا کر کہا ”اور وہ جیتو نہ مارو“
میں نے مسکرا کر کہا ”والہ مذاق کیا چلے میں قسم کھاتا ہوں آج ہی سے عمل کر دوں گا۔ آپ بتائیے ترکیب“
خاں صاحب نے جوش میں اگر بیک وقت کئی طرح سے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”سن لو کان کھول کر تمہیں اُن سے لڑنا پڑے گا اور ان کی ہر بات کا کاٹ بکرن پڑے گا۔“

میں نے دل میں گذشتہ جنگوں کو معرکہ خیز حالات پر غور کیا۔ دیسے تو میں ٹکروالی سے اکثر لڑ چکا ہوں مگر ان تمام لڑائیوں کا نتیجہ کچھ امید افزا نہیں رہا کبھی وہ نہ دبی تو میں بگیا اور کبھی میں نہ دبا تو وہ بھی نہ دبی چنانچہ میں بجائے خاں صاحب کو جواب دینے کے یہی سوچنے لگا۔

خاں صاحب نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو عینک کے اوپر سے جھپکا کر گردن ہلا کر کہا۔ ع
سب کار دیدہ بخود بینک ۛ زرد پر ریشیر نا دیدہ جنگ

میں نے کچھ شرمندہ ہو کر خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ بھلا کیا جواب دیتا اور کیا کہتا۔ خاں صاحب نے مجھے شرمندہ اور قائل پا کر اپنے دانے ہاتھ کا گھونسا بنایا اور اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیلا کر میرے سامنے کر کے یکے بڑت اپنے مصنوعی دانت کمال و سنے کچھ منہ چڑا کر سخت طنز کے لہجہ میں کہا تم بڑے بُزدل ہو۔ ارے میاں کچھ

کیا ہو۔ لڑ پڑ..... ہر بات کا اُن کی کاٹ کر دادر لڑ پڑ۔ لفظ لڑ پڑ پر زور سے دہانے ہاتھ کاٹھوند دوسرے ہاتھ کی پتیلی پر مارا اور پھر جھوم کر جنگی جوش و خروش سے کہا یہ کہہ دو ع
بجز کام سن کر بیاہر جواب ہمیں گرز و میدان و افرات
یہ کہتے ہوئے لفظ گرز پر پھر پتیلی پر زور سے ٹھونسا مارا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگے۔

میرے دل میں دفعۃً کچھ جنگی جوش آیا۔ دل میں کچھ امنگ اور بہادری کا سا احساس ہوا۔ ہوں نا آخر جنگی نیا کی اولاد میر۔ ایک دم سے خون تانا ناسنے میری رگوں میں جوش مارا..... میں شیر خا..... بلکہ ہوں..... مگر کیسا؟..... شیر نادیہ جنگ! ادبی وجہ ہے جو میں خواہ خواہ خانم سے دیتا ہوں۔ مگر شیر پھر شیر ہے..... آگے جا کر پھر شیر مٹھا..... اک ذرا سی جنگی تعلیم کی ضرورت ہے اور بس خاں صاحب سے دو چار باتیں پوچھ لوں اس فن کی کد گھر دانی سے کس طرح کامیابی سے لڑتے ہیں میں نے پوچھا:-
کیا جاتے ہی یکدم لڑنا شروع کر دوں۔ آخر کس بات پر شروع کر دوں

خاں صاحب چپن بچپن ہو کر بولے۔ تم بھی عجیب آدمی ہو میاں ذرا تیر پر بل ڈالے رکھا کرو۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ خونا اُن کی تمام باتوں کا بات پر کاٹ کر دنا شروع کر دو اور جو زادہ چین چکر کریں تو بس..... وہیں ساپ کا پھین کپل دو۔ مگر ہاں ایک بات ہے بے بات ہر گز نہ لڑنا۔ پہلے بات پیدا کر لو اور پھر لڑو اور خوب لڑو میں دانتوں تلے فصد سے ہونٹ دبا کر جنگ کے مختلف ہمنوؤں اور امکانات پر غور کرنے لگا۔

خاں صاحب میرے دلو کو تار گئے اور انہوں نے اپنا پر زور کچھ شروع کر دیا
لکچر..... بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ گھر دالی نہ ہوئی وہ ہو گئی۔ تم ہی تو گھر کے کماؤ ہو اور تم ہی کو خرچ کرنے کو نہیں ملتا۔ اس کا یہ کاٹ کر دو خود اپنے پاس علیحدہ رقم جمع کرو۔ گھر دالی کو بس خرچ کے مطابق رقم کہتے ہو اخبار والا کوئی روزانہ اخبار نہیں دیتا بلکہ اسے انہوں نے کچھ ایسا سکھا دیا ہے کہ وہ تصویروں والا نامہ ہفتہ کے ہفتہ لاتا ہے اور وہ خود تصویریں دیکھا کرتی ہیں۔ یہ سب دہیات ہے تصویریں دیسے ہی عورتوں کو دیکھنا منع ہیں اس کا یہ کاٹ کر دو کہ بند کر دو ایسے اخبار دیکھو کہ جس میں تصویریں ہوں اور ڈانٹ کر اخبار دالے سے روزانہ اخبار منگائے ورنہ دی۔ پی سے منگالو۔ عابن دانی کہتے ہو غسل خانہ سے انگنائی میں لانے کا حکم نہیں۔ اس کا یہ کاٹ ہو کہ صابن دانی تو ڈوڈا اور صابن پھینک دو۔ یہ بھی دہیات ہے کہ گھر لسی کی طرح ایک وقت پر تمہیں کھانا کھانا پڑتا ہے۔ وہ کوئی حق ڈاکٹر ہے جو یہ ان سے کہہ گیا۔ وہی ہو گئی میم..... ڈاکٹر پی..... اول نمبر کی خرافہ ہے..... مت آئے دو! سے اپنے یہاں اور مت کھا دکھانا وقت پر مینہ پر چھوڑا سمان پر لگ جائے کھانا مت کھا دو کوئی وجہ نہیں کہ اب تو مینہ پر کھانا لگ گیا۔ سب دہیات۔ ہر وقت منہ چلتا رہنا چاہئے۔ مین کے سب۔ ریوڑیاں۔ مونگ پھلیاں۔ بس ایسی چیزیں حبیب

میں رکھا کر دیا رکھاتے رہا کرو۔ عمدہ موٹ نہیں ملنے پہننے کو تو اس کا یہ علاج ہے کہ انہیں رز پر ہنو اور
 یہ کیا کیا تم نے کہ جن دکانوں سے تمہارا حساب ہے وہاں تمہیں کوئی قرض نہیں دیتا غضب خدا کا اٹھا معاملہ ہے
 اٹھا تمہاری گھر میں نے دکانداروں سے کہ رکھا ہے اگر تم قرض مانگو تو نہ دیں! اماں ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ یہ کیا دہشتا
 تم اپنا الگ روپیہ رکھو اپنے پاس۔ بیٹے کے جینے گھر والی کو خرچ کے لئے دو پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ بیٹے ہونے سگروں
 کے کھڑے گن گن کر تم سے الجھتی ہیں۔ ڈیرہ اپنے قبضہ میں رکھتی ہیں۔ اس کا یہ کاٹ کر دو کہ گئے سگرٹ پیو۔ در نہ میں حقہ
 بھیج دوں گا۔ غرض ہر بات کا ان کی کاٹ کر دیا کر ڈرو۔“

(۲)

خاں صاحب نے اپنا لکچر پڑے زوروں میں ختم کیا۔ میری رگ رگ میں غصہ کی بجھن تھی۔ ایسی سرکش
 بیوی بغیر لڑے زیر نہ ہوگی۔ خاں صاحب کا مشورہ درست ہے لاجل دلاق میری بھی حالت قابل رحم ہے کہتے
 ہیں لوگ کہ تمہاری بیوی بڑی اچھی ہے۔ ادھر کچھ ہی سے واپس آنے کا وقت ہوا اور دیکھ لو اسے کمرہ کے دروازہ
 پر کس بے چینی سے انتظار کرتی ہوتی ہے۔ دوسرے ساتھی سنتے ہیں اور رشک کرتے ہیں کہتے ہیں کس طرح
 بھول کی طرح کھل کر وہ تمہارا استقبال کرتی ہوگی۔ تمام گفتیں دور ہو جاتی ہوں گی کام کا بار بک ہو جاتا ہوگا۔
 دوستوں کا کہنا بالکل درست ہے بیویوں کا بار بھی بٹکا ہو جاتا ہے۔ ادھر پہنچے اور آنکھ سے آنکھ ملے ہی پہچان جاتی
 ہے کہ ہے کچھ حبیب میں۔ بس پھر کچھ تھا: مسکرا کر کہہ دے پر ناتھ رکھا اور اندر باہر کی سب چیزیں ٹٹول لیں۔ تمام سحر
 آفرینیاں یہی ختم ہو جاتی ہیں۔ کچھری سے نیت کر کے چلو کہ کچھ رقم نہ دیں گے گردنوں تو سحر آفرینیوں کے پھندے اور
 تبسم کے حال مارے جاتے ہیں اور پوری جانتہ تلاشی ہو جاتی ہے۔ بھلا جمال ہے کڑی رہ جائے۔ ناممکن غرض
 میں آپسے کیا عرض کروں جب سے خاں صاحب سے ملاقات ہوئی ہے دراصل میری آنکھوں کا پردہ اٹھ گیا ہے۔
 مجھے علم ہی نہ تھا کہ ایک شہر کے کیا حقوق ہیں اور یہ کہ میرے کون کون سے حقوق میری شریک زندگی نے ضبط کر لکھے
 ہیں بقول خاں صاحب کے مجھے چوڑیاں پس لینا چاہئیں اس ذلت سے ڈوب مرنے سے چلو
 بھر پانی میں بے حیا ہوں۔ بزدل ہوں۔ دن رات بیوی کی جوتیاں کھاتا ہوں اور زندہ ہوں! شرم نہیں آتی
 اصل معنی میں زن مرید ہوں! یہ سب سچ ہے اور بقول خاں صاحب کے مجھے لطف زندگی بھی نہیں چل موت
 بہتر ہے گھر میں آؤں تو بقول خاں صاحب کے بیوی کو کانپ جانا چاہئے۔ اُسے سانپ کو بگھ جانا چاہئے غصہ ہے
 کہ وہ میرے پہنچتے ہی مجسم زندگی ہو جاتی ہے۔ ذرا نہیں ڈرتی۔ جمال نہیں جو شطرنج کھیلتا رہ جاؤ قصہ مختصر میری زندگی اصل
 تلخ ہے بقول خاں صاحب کے میرا طبقہ بند ہے مجھے احساس کرنا چاہئے کہ میری حالت اب وہ ہے کہ تنگ آؤ بچو آگ
 قصہ مختصر ان تمام امور پر غور کرتا ہوں گھر بچا۔ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ اب میں بھی خام کو ذرا مزہ کچاؤں

گاہنستی سے کام لوں گا۔ اب کی لڑائی ہوگی تو انہیں پتہ چلے گا۔ بغیر ہنستی کے یہ شورہ پشت پیوسی قابو میں نہیں آئے گی جب دروازے میں کمرے کے قدم رکھا ہے تو خیال آگیا کہ خال صاحب نے کچھ تیر پڑھانے اور غصیل صورت بنانے کا بھی مشورہ دیا تھا ایک دم سے میں نے دانت میں کتر پور پڑھائے اور کچھ بار عجب اور غصیل صورت بنانے کی دو زمین دفعہ جلدی جلدی مشق کر کے کہنا نصرت سن الدد فتح قریب گھر میں داخل ہوا۔ مگر کمرے سے اٹھے پیر لوٹ پڑا۔ غسل خانہ میں آئینہ دیکھا۔ گال بے حد چپکے ہوئے ہیں میرے ہیں نے دل میں سوچا کہ بس۔ یہی گال باعث نصیبت ہیں ہی تمام خرابی ہے کسیر تیرا عجب شکل بناؤ کچھ نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ سوکھی ہوئی کھٹائی کی شکل ہو جاتی ہے شاید گال پھلنے سے کام چل جائے۔ گال پھلا کر دیکھئے مگر یہ خیال غلط نکلا۔ ویسے ہی غصتہ در چہرہ میں نے بنایا۔ گھونسا تن کر خود کو آئینہ میں دکھا کر اور لڑنے کا سولہ آنہ ارادہ کر کے میں گھر میں آیا۔

(۳)

مگر میرے گھر میں پہنچنا تھا کہ اور ہی معاملہ در پیش آیا۔ ادھر میں داخل ہوا ہوں اور ادھر وہ مجسم گلاب کا پھول بن کر میرے سامنے تھی۔ اُس کی چمک دار آنکھوں میں محبت کا نور جگمگا رہا تھا۔ باوجودیکہ میں سخت کبیدہ خاطر تھا مگر ایک نظر ہی کافی تھی اور جگر کے پار ہو گئی کس طرح جھپٹ کر اس نے مجھے لیا ہے کہ بیان سے باہر امارتی اُس کے منہ سے نکلا۔ آواز میں ایک عجیب و غریب نغمہ تھا۔ لبوں پر ایک غصب کی سحر آفریں لرزش تھی اور تمام چہرہ پر مسرت اور شگفتگی اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کا دکھتا ہوا شاداب چہرہ عشق و محبت کے جذبات کا آئینہ دار ہو رہا تھا۔ وہ محبت اور عشق جس نے مجھے فنا کر دیا ہے۔ وہی جو میری تمام ذلتوں کا راز ہے!

جیسے ایک جادو تھا کہ تمام خیالات میرے دل سے آنکھوں آنکھوں میں محو ہو گئے۔ وہ بگی جوش جس کا میں منظر ہونے کو تھا کا نور ہو چکا تھا۔ میں نے اُس کا احساس بھی نہ کیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کس محبت سے وہ اپنی نئی الماری مجھے دکھانے کے لئے جاری تھی جوابی ابھی آئی تھی۔ وہ جس کا اسے بڑی بے صبری سے انتظار تھا۔

کمرہ میں پہنچتے پہنچتے اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ میری داہنی طرف تھی اور میں اس کے بائیں طرف اور ہم دونوں سیاں پیوسی الماری کے بڑے آئینہ کے سامنے کھڑے بجائے الماری دیکھنے کے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے! میں اُس کو..... دنیا کی حسین و خوبصورت ترین چیز یعنی اُس کے پرشوں چہرہ کو اور وہ مجھے! یعنی واقعی میرے بد صورت اور کھٹائی نما اور چرخ چہرہ کو۔ آئینہ کیا تھا۔ یوں کیسے کہ جمع صہ ترین کی میتی جاگتی تصویر تھا۔

غور سے میں نے آئینہ کو دیکھا۔ آئینہ ایک طلسم سا معلوم ہوا..... ایک لرزش کے ساتھ زیادہ دلچسپ

اور پھر ایک دم سے ہوشہار ہوا۔ کیونکہ میں نے اپنے کندھے پر ہاتھ کا ایک ہلکا سا دباؤ محسوس کیا اور دفعتاً مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہاتھ نہیں بلکہ میرے کندھے پر کسی نے چنگاری رکھ دی!! آئینہ سے نظر ہٹا کر میں نے اپنے داہنی طرف دیکھا..... عشق و محبت کی بجلیاں لپکتی رہی تھیں۔ آنکھیں نہیں بلکہ ایک جھپکتا ہوا نور تھا..... سانس نہیں بلکہ بوئے محبت سے مسمکتی ہوئی عشق حقیقی کی طوفاں خیز رُوح تھی۔ چہرہ تھا کہ ”اللہ جمیل و حبيب الجمال کی جتنی جاگتی تفسیر!..... لازماً عشق و محبت کا ایک متلاطم و طوفان خیز بحر سیکرانا تھا جس نے اپنی موجوں میں مجھے گم کر دیا..... میں نے اپنے کوچ کوچ ڈوبتے ہوئے محسوس کیا..... تینکے کا سہارا..... ایک بچے کو جس طرح کان میں گھڑی لگا کر اُس کی ٹمک ٹمک سنا تے ہیں بس بالکل اسی طرح میں بھی اپنی پیاری مگر سرکش بیوی کو اپنے دل کی دھڑکن سنارہا تھا!! اس کا سر میرے سینے پر تھا اور وہ غور سے میرے دل کی دھڑکن یا ٹمک ٹمک کان لگا گئے سن رہی تھی اور ساتھ ہی اپنا تمام غرور و سرکشی چھوڑ کر کس طرح نہایت ہی بھولے پن سے اپنی نشیلی اور جھپکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی..... یا شاید خود میری آنکھوں میں ہو کر میرے دل کی گھڑی کی نازک بالکمانی کو چھو رہی تھی! اور وہ بھی اس طرح کہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ یہ دل کی گھڑی کہیں چلتے چلتے ایک دم ٹرک نہ جائے!!

دراغور کیجئے کہاں ایک مجھ سا گندہ گار و احمق بندہ اور کہاں حضرت موسے! مگر خدا کی دین تو خدا کی دین ہے خود حضرت موسے ہی اس کے شاہد ہیں..... کہ آگ لینے کو باتیں پیغمبری مل جائے اُن سے تو خدا نے کہا ”لن تواری.....“ اور مجھ سے!..... یہ ایک سوال تھا۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے.....“

میں پیرسائل علوی طے کر رہا تھا کہ دفعتاً باہر ملازم لڑکے کسی کو پکارا کہ میں گویا چونک پڑا

عظیم بیگ جتنا

نوائے مضطر

آج تنگ یاد ہے وہ عیشِ طرب کی بارش
 مائے مجبور کوئی آہ وہ شب کی بارش
 یا تو افراطِ محبت کی ہے یا قلتِ مہر
 کشتِ اُمید پہ ہوتی نہیں ڈھب کی بارش
 بندہ پروریہ نہ آنے کے بہانے سارے
 مجھ کو معلوم نہیں بندہ کب کی بارش
 جو روکھیں گے ترالطف و کرم جو چاہا
 آگ برے گی اگر ہم نے طلب کی بارش
 کیا کہوں ابر بہاری کا برس ناکیا ہے
 تیرے رنجور پہ ہے رنج و تعب کی بارش
 نہ میسر ہے شراب اور نہ ممکن ہو دصال
 خون رلواتی ہے مضطر ہمیں اب کی بارش
 بزمِ نشاط و محفلِ عشرت نہیں ہے اب
 غمہائے روزگار سے فرصت نہیں ہے اب
 یہ تو نہیں کہ تجھ کو محبت نہیں رہی
 لیکن وہ اضطرابِ محبت نہیں ہے اب
 یا لطف پر بھی شکوہ بے جا تھے بے شمار
 یا جو پر بھی کوئی شکایت نہیں ہے اب
 غضب کی ٹونیاں ہیں اس نگاہِ فتنہ ساں میں
 نہیں ہو صبر کی طاقت مئے لیں میں می طاقیں
 تلاطم مائے دیاسے ہر اساں ہو نہیں سکتے
 کہ ہم پائے ہوئے ہیں پرورشِ آغوشِ طوفان میں
 وہی کِشتہ ہے زنا راودِ تسبیح میں مضطر
 یہ کیا مہل ہے جھکڑے پگٹے ہیں کفر و ایمان میں

رام رتن مضطر

اسلامی فن تعمیر پر ایک نظر

بہترین فن تعمیر وہ ہے جو ساخت کی شکلات حل کرے اور تخلیقِ حسن میں بھی کامیاب ہو۔ یونانیوں کی بہترین عمارات اس معیار پر پوری اترتی ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ انہیں بہت کم مشکلات پیش آتی تھیں یہ وہ ارجحیتوں کی ایک منزلہ عمارتیں بنانے کے لئے صرف یہ ضروری ہے کہ چند ستون مناسب جگہ پر کھڑے کر دئے جائیں۔ اس خیال کے پیش نظر ہم یونانی فن تعمیر کو بہترین قرار نہیں دے سکتے۔ رومانی صنایع اپنے یونانی پیشروؤں سے دو چار قدم آگے بڑھے۔ انہوں نے دو منزلہ، سمنزلہ عمارتیں اور عمارتیں بنائیں لیکن ان کے حقیقی اصول وہی تھے جو یونانیوں نے دنیا کے سامنے پیش کئے تھے۔ ان کے بعد یورپ کی باقی اقوام نے بھی وہی اصول کم و بیش تغیر و تبدل کے ساتھ پیش نظر رکھے۔ لیکن فن تعمیر کو معراجِ کمال پہنچانے کی سعادت مسلمانوں کی قسمت میں لکھی تھی۔

وہ ازلی چنگاری جو قدرت نے عرب کے ایک گوشے میں چھپا رکھی تھی ملدہی شعلہ جو آل بن لہمی اور سرحد چین سے سپانیہ تک تمام دنیا اس کی لپیٹ میں آگئی۔ مشرق و مغرب عرب جہانداروں کی تہذیب سے آشنا ہوئے جو دنیا کے لئے آئینہ حرمت ثابت ہوئی جو ساسانیوں، یونانیوں اور رومانیوں کے تخریبی حربوں سے منتفہ تھی۔ اور جو محکوم قوموں کے ادب اور فنون لطیفہ کو تباہ کرنے نہیں آئی تھی بلکہ انہیں فروغ و فیض اور ان کے مردہ اجسام میں نئی روح پھونکنے کے لئے ظاہر ہوئی تھی بخت نصر نے میکہ کو برباد کیا لیکن عمر فاروق نے مفتوح بیت المقدس میں تاریخی عمارتوں کو برقرار رکھا بلکہ ان میں ایک سجدہ کا اضافہ کیا جو سادگی اور خوبصورتی کے لئے تعریف کی مستحق ہے۔

مغربی نقادین فیصلہ کرتے ہیں کہ اسلامی فن تعمیر میں نقل کا عنصر غالب ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دینی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے رعایا کے فنون کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کے بجائے انہیں پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ وہ جہاں جہاں اپنی فتح کے شاندار نشانات چھوڑتے گئے۔ جو رہتی دنیا تک ان کی عظمت کی داستانِ اہل نظر کو سناتے رہیں گے۔ انہوں نے صنعتی کے ایسے لاجواب نمونے اہل عالم کو پیش کئے ہیں جن میں یونانیوں کی سادگی و رمانیوں کی شان اور مصریوں کی تخیل انگیزی ایک قوت موجود ہے۔ اس کے علاوہ دل آویز بولے بنائے اور رنگ آمیزی کا کمال جیسا مسلمانوں کی عمارتوں میں ہے، اور کمیں نہیں۔ رنگ و وارہتر

استعمال کرنے کا خیال بھی پہلے پہل انہی کو آیا تھا۔ ہسپانیہ کے اسلامی بادشاہوں کا محل الحمد للہ جو سرخ چتھرہ دل کا بنا ہوا ہے اس خیال سے قابل ذکر ہے۔ یہ شاندار محل جو آج تک دنیا کے عظیم ترین عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے چودھویں صدی مسیوی میں بننا شروع ہوا اور نصف صدی تک بائیس کمیل کو پہنچا۔ اس کی تعمیر میں صرف خوبصورتی ہی کا خیال نہیں رکھا گیا بلکہ اس کے ہر نقش میں معمار کی جدت طبع کا ثبوت ملتا ہے۔ محل کا جو حصہ بیت الاساد کہلاتا ہے مسلمانوں کی احتراک کی شہادت دیتا ہے۔ یہ ایک معن ہے جو چاروں طرف نظر در متفحش محرابوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے وسط میں ایک فوارہ ہے جس سے پانی ایک طشت میں گرتا ہے جو سنگین شیروں نے اٹھا رکھا ہے۔ اور جس سے پانی شیروں کے منہ سے نکلتا ہے۔

شہزادیوں کے غسل خانے، محبلیوں کا تالاب اور بادشاہ کی خواب گاہ بیت الاساد سے کچھ کم حیرت انگیز نہیں اگرچہ مورخ الذکر کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی محرابیں بلا ضرورت بنائی گئی ہیں کیونکہ چھت کا بوجھ ستونوں نے اٹھا رکھا ہے۔ اس لئے محرابوں کو بنانا تفسیع اوقات کے مترادف ہے۔ مگر اسی تفسیع اوقات کے طفیل انسان کی نظر پر ایسا جادو ہو جاتا ہے کہ وہ ان محرابوں کو دیکھ کر زندگی کی کلفت سے رہا ہو جاتا ہے۔ اور چند لمحوں کے لئے ہماری غبار آلود فضا اس کی نظروں سے اچھل ہو جاتی ہے۔ جن کا کمال یہی ہے کہ وہ دیکھنے والے کو پیکار حیات سے غوری ویر کے لئے بے نیاز کر دے۔ یہی آرت کا مقصد تھا۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی تفسیع اوقات کے عادی مسلمانوں نے اس مقصد کو نظر انداز نہ کیا۔

زمانہ کے انقلابات سے الحمد لمخوفہ نہیں رہا۔ اور جابجا شکست و ریخت کے آثار اس میں نظر آتے ہیں۔ اس لئے مغربی نقاد اس کی طرف انگلیاں اٹھا کر کہہ رہے ہیں کہ مسلمان صرف وقتی مصلحت کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے شوخ اور جلد مٹ جانے والے رنگ استعمال کئے۔ انہوں نے خوبصورتی کے لئے استحکام کو نظر انداز کیا۔ عمارت زبنا دی۔ لیکن اس کی حفاظت خدا پر چھوڑ دی۔ مگر الحمر کی قدامت خود اس اعتراض کا جواب دے رہی ہے۔ اور شوخ رنگوں کے استعمال کے استحکام کے محرم صرف مسلمان ہی نہ تھے۔ یوناروڈو اونچی بھی تھا۔ اور یٹین بھی ہے وہ آسمان پر چڑھا رہے ہیں اس لحاظ سے کچھ کم قصور وار نہ تھا۔

الحمر کے بعد ہماری نظر قرطبہ کی مسجد جامع پر پڑتی ہے۔ عینی شاہد دل کا زلی ہے۔ کہ ایسی مسجد کی نظیر دنیا میں مشکل ہے۔ محرابوں کا حجم ایسا ہے کہ دیکھنے والے پر رعب طاری ہو جاتا ہے۔ نقادوں فن کا فیصلہ ہے کہ مصر کے سو اکیڑہ ملک اس جیسی مسجد پیش نہیں کر سکتا۔ اس میں عربی رنگینی اور رومانی شان یکجا نظر آتی ہے۔

ہسپانیہ میں اس کے علاوہ کئی اسلامی عمارت ہیں جو اس ملک کی گرد و نی کا مکرر رہی ہیں۔ غناطیں شاہان اسلام کا گرما کی محل اور اشبیلیہ میں انصر اور منارہ فتح ہسپانیوں کی دستبرد سے نالاں ہیں۔ انہوں نے

موزا لکڑ کو گھنٹہ گھرنانے میں جو ظلم آرٹ پر کیا ہے۔ وہ اپنا جواب آپ ہے۔

ہسپانیہ کے بعد ترکی کی عمارات ہماری توجہ منطقت کرتی ہیں۔ ان میں بازنطینی رنگ نمایاں ہے۔ اور وہ عموماً مسجد اقصیٰ کے طرز کی ہیں۔ ان میں سلطان احمد سلیمان اور بازنید کی مسجدیں قابل ذکر ہیں۔

مصر فلسطین اور ایران بھی خوبصورت عمارتوں پر کم ناز نہیں کر سکتے۔ مصر میں قادیہ کی مسجد فلسطین میں مسجد عمر اور ایران میں مسجد اصفہان قابل دید ہیں۔ لیکن ان تمام عمارات سے بھی زیادہ قابل ذکر مدینہ کی مسجد نبوی ہے جو آرٹ کے شائقین کو سنبھال دیتی ہے۔ کہ سجادہ سے ساوگی زیادہ جاذبِ نظر ہے۔ جو نشان ہمیں دینس (حسن کی دیوی) کے یونانی مجسمہ میں نظر آتی ہے اس میں بھی ہے۔

یونانی، رومانی اور بازنطینی عیون کا جو اثر اسلامی فنِ تعمیر پر ہوا اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مصری اصولِ تعمیر اثر دکھائے بغیر نہ رہے۔ اہرام مصر کو دیکھ کر بعض مسلمان بادشہوں کو بھی شاندار مقبرے بنانے کا شوق پیدا ہوا۔ ان مقبروں میں سے بہترین وہ ہے جس میں خلیفہ ہارون الرشید کی چار بنی یکجہ زبیدہ داہکی نیند میں محو ہے یہ مقبرہ جس کی ساخت ہشت پہلو ہے۔ اور جس کی چھت عجیب اہرام نما ہے۔ الفیل سے بھی زیادہ ہارون کی شہرت کی غماز ہے۔ ہمارے ہندوستان کا دامن بھی اسلامی تعمیر کے بیش بہا نمونوں سے بھرا پڑا ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے رابطہ باہم سے ایک ایسے فنِ تعمیر کا ارتقا ہوا۔ جو اپنی پاکیزگی، موزونیت اور خوبصورتی کے لحاظ سے متاثر ہے۔ دہلی کا قطب مینار اور حیدرآباد کے چارمینار فرقوں وسطی کے ہندوستان کی عظمت کے پرتگوشہ شاہد ہیں۔ ان کے علاوہ نکلون کے تعمیری آرٹ کے شاہکار ایسے ہیں جن کا شمار ممکن ہے۔ لیکن ان کے اوصاف کا اداجی اور مکمل تذکرہ ممکن نہیں۔ کم و بیش ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں نکلون کی کوئی نہ کوئی یادگار باقی ہے۔ مثلاً جیان آباد کا درہ درہ ان کوثریوں ہے۔ اگر ہ میں روضۂ تاج محل اور اورنگ آباد سکندرہ پنجور سیکری اور ویکری شہروں میں ان کے آثار باقی ہیں۔ ان کا بیان کرنا تحصیل حاصل ہے۔ ان کی صفات پہلے ہی عالم آشنا کریں۔

اسلامی عمارتوں پر ایک جھجھکتی ہوئی نظروں سے گزرنے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ مسلمانوں کا فنِ تعمیر کیسے متاثر ہوا۔ سنائش ہے۔ اور کس حد تک اس کے اصول کا مبادیہ ہوئے ہیں۔ آرٹ سب سے پہلے خوبصورتی کا مظاہرہ کرتا ہے اسلامی معمار بھی اسی مطیعِ نظر ہے نہ تفسیر۔ لیکن وہ انتظام کو بھی خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں موزونیت درکار تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو میرا سٹی کے ڈیجر میں دبا ہوا ہم نہیں دینا۔ دی گناہ شہری میں لگا کر اپنی تمام آب و تاب سے چکے لگاتے اس لئے ہندی معماروں کے یکساں وہ مناسبت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ہندو جہاں تل بھر کی جگہ دیکھتے تھے اسے آراستہ کر دیتے تھے۔ ان کی ہر عمارت میں نقش و نگار کی افراط و تفریط کو شیرہ کرتی تھی۔ مگر مسلمان معمار کاغذ کا لحاظ رکھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کروڑوں خوبصورت گھونگوں سے بڑا سادہ سمنار کی سادہ دہلی چار و شنبہ جاذبِ نظر نہیں۔

اسلامی معماروں نے فطرت کو اپنا حلیف بنایا۔ وہ اپنی عمارتوں کے سر میں ہیکل کی خوبصورتی یا غایت سے دو بالا کرنے لگے۔ یہ خصوصیت مغلوں کی اکثر عمارتوں میں نظر آتی ہے۔

اسلامی فن تعمیر اسلامی تہذیب کا اکتیس ہے۔ ہمیں سر عمارت میں مسلمانوں کے اخلاق کا کوئی تذکرہ ہی پہل نظر آتا ہے۔ ان کا کوہ شگاف عزم ان کی جدت طراز فطرت ان کی سادگی اور ان کی ذہانت پر نقش و دیوار میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کی عمارات میں بھرک اور محض نمود کا نشان تک نہیں۔ انہوں نے مزینیت کو سجاوٹ اور اعتدال کو افراط پر پیش ترجیح دی۔ ان کا سطح نگاہ نظر کو فریب دینا ہی نہ تھا بلکہ وہ عقل۔ روح اور ذوق نگاہ فیوں سے اپنے کمال کی داد لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے نزاکت کی جگہ شکرت اور وقتی اقتضا کے احترام کی جگہ کمال فن کو اپنا علامہ بنایا۔ ان بدوہ کی بنیاد ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بونائی، باندھنی، رومانی اور مصری معماروں کے لائق وارث ثابت ہوئے۔

ہر انسان کی آرزو ہے کہ وہ دنیا میں ایک جیت نیلے، جو اس کو لہجے اور جس کا روح پر ایک طبعی اثر ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان معماروں سے زیادہ کسی کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

عطا اللہ کلیم

غزل

کیوں عرض مدعا کے لئے جارہا ہوں میں . گویا کسی کی بات میں پھرا رہا ہوں میں
اے دئے اعتبار کہ مایوس بھی نہیں . اک عمر سے فریب کرم کھارہا ہوں میں
کچھ بات تھی کہ مجھ سے نکالیں چراگئے . جی کو اسی خیال سے بہلا رہا ہوں میں
جب جانتا ہوں عشق کا انجام جاگداز . کیوں قلب نامراد کو بہکا رہا ہوں میں
میری جبین میں ایک بھی سجدہ نہیں رہا . کس آستان پہ ناصیہ فرسارہا ہوں میں
بے سود کیوں ہو میری فغاں بے اثر تھی . تجھ تک پیام شوق تو پہنچا رہا ہوں میں

یہ خوب عاشقی ہے کہ جینا حرام ہے

انور! خدا گواہ کہ چھتارہا ہوں میں

لطیف انور
گورداس پوری

اردو ادب اور میانہ روی

رسول عربی کا قول ہے کہ سب کاموں میں وہی کام اچھا ہوتا ہے جو درمیانہ ہو خدا کا شکر ہے کہ اردو ادب کی چال بھی انیسویں صدی عیسوی کے انجام تک اسی قاعدے پر رہی ہے لیکن اب دس بیس برس سے ایک طرف تو یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ اردو زبان سے فارسی عربی الفاظ کو دور کر دیا جائے اور دوسری طرف سے اس میں عربی اصطلاحات اور محاورات کی ایسی بوجھاڑ ہو رہی ہے کہ اگر سرسید احمد مغفور اور پرنسپس آزاد مرحوم جیسے صاحب علم بھی جی اٹھیں تو اس معرب اردو کو نہ پہچان سکیں۔ اردو زبان کی بناوٹ ہی عربی فارسی اور سنسکرت کے ملاپ سے ہوئی ہے۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی اس نے نکالی نہیں جاسکتی۔ اگر پہلی دوزبانوں کو اس سے خارج کر دیا جائے تو حساب الجبرہ، اقلیدس، صرف و نحو، طب، قانون اور تمام علمی کتابوں کے خزانے جو در سو سال کی محنت سے جمع ہوئے ہیں سب ضائع ہو جائیں گے شمالی ہند سے جنوب تک ان دوزبانوں کے ہزار ہا الفاظ اور ترکیبیں زبان و خلائق ہو چکی ہیں۔ جن کو ہر رنگ کے آدمی بلا امتیاز قوم و مذہب روزمرہ استعمال کرتے ہیں اور جن کا بدلہ مشکل ہے لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم ایسی اردو ایجاد کریں جس میں جملوں کے جملے استعارات و تشبیہات، تلمیحات و کنایات، تلمیحات و کنایات، تصورات و توابعات، اشارات و صمیمیات سے پر ہوں۔ یا پر اسرار حقائق، لطیف دروں، حقیقت الہام، الفا، اعجاز، مناجزات و ذراکت کے توج و تلاطم سے مدہوش ہوں یا جذبات عالیہ، حسیات لطیفہ، لزوم، مالا یلزم، لامحالہ، رند لا ابالی، سو فیانہ، سیف، اساطیر، الاولین، مناظر، مرایا، مستحضرات و ماضیات، عارضی و سرمدی، امتداد و زمانہ، پرشکوہ و جزیل، سو فیانہ فلسفیانہ حکیمانہ نکات اعلیٰ و ارفع خیالات، نیم شعوری اور جنیم تخیل کے صنائع بدلے سے ہم جبران ہوں۔ یا تنقید و تنقید، نشر و تحریک، تشکیل و تخریب و تنقیح، تنقید و تلمیح کے جارحانہ و مدافحانہ بحر طلمات میں اردو کی کشتی کو چھوڑ دیں جس کے طوفان سے وہ کبھی نکل نہ سکے۔ ایسے معرا۔ عامتہ اور وہ کیف اور مطلق العنان۔ اسنیدادی۔ غلو آمیز انفرادی الفاظ سے خدا اہل ہند کو محفوظ رکھے۔ آمین

بہت پہچانی ہے کہ اردو ادب کے درمیں اُس میانہ روی کو جاری رکھیں جس سے اس کی ترقی ہوئی ہے اور جس نے اس کو ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ والسلام

محفل ادب

علامہ شبلی مرحوم کا تغزل

اے خوش آں دُورِ کرازمِ قنداز پرده برون / از دوسو غنّے و سن سے زودہ رسوا باشم (شبلی)
 قبل اس کے کہ علامہ مرحوم کی غزلوں پر تنقید کروں مناسب بلکہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس ماحول کو بیان کر دوں جس نے شاعر کے جذبات میں بھجوان پیدا کر دیا۔ اور اس فضا کی تشریح کر دوں جس میں شاعر کے تخیلات شاعرانہ کی نشوونما ہوئی۔ ممکن ہے کہ مخصوص طبقہ میر سے اس اظہار خیالات سے پرہیز ہو لیکن اب یہ کوئی راز سرسیت نہیں رہا ہے بلکہ خط و شبلی کے مقدمہ میں مروی عبدالحق بی۔ اے نے اس حقیقت کے لیے نقاب کر دیا جو ادب اب یہ راز عالم خلوت سے نکل کر منصفہ ہو چکا ہے۔ آشکار ہو چکا ہے کہ شہر و محترم خواتین نے ہر ایک فیضیہ اور عطیہ کی تحفہ کے اسمائے گرامی سے کون واقف نہیں۔ ان خواتین اور خصوصاً عطیہ کیگم سے مولانا کو جو فرط محبت اور ذوقی ارتقاء تھا وہ ان خطوط سے نمایاں ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً بیگمات مذکورہ کو لکھے تھے۔ علی الخصوص عطیہ کیگم کے نام جو خطوط مولانا نے لکھے ہیں ان سے مولانا کے ایسے پوشیدہ خیالات ظاہر ہوتے ہیں جن کا اظہار انہوں نے سبک میں کبھی نہیں کیا تھا۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ مولانا کی سیرت کے دو پہلو تھے چلک اور پرائیویٹ۔ جلوت و خلوت مولانا کو ہرگز یہ امید نہ تھی کہ یہ خطوط کبھی شائع بھی ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے ان خطوط میں اپنا کچھ نکال کر دکھایا یہ مجموعہ جو ادب میں شامی ہونے کے لائق ہے شائع ہو گیا ہے۔ علامہ شبلی نے خود فرمایا تھا کہ

حکایت من واد گر چہ رازِ نہپساں بود / بے نہماند کہ اس حرف و داستانِ گرو د

اس مجموعہ کی ایک جلد میر سے پاس بھی ہے اور میں نے ذوق و شوق سے ایک ایک لکڑی محبت کا مطالعہ کیا ہے۔ مگر افسوس کہ چند روز پہلے میر سے ایک دوست اس کتاب کو بید روی سے چھین کر گیلے بھاگے و مذاقتنا سات درج کے کہ مولانا کے خیالات و جذبات کے نمونے دکھاتا تاہم جو کچھ دماغ میں محفوظ ہیں پیش کرتا ہوں۔ عطیہ کیگم کا ایک خط مولانا کے پاس آیا ہے وہ اس خط کو دیکھ کر اس قدر دافنہ و خجہ ہو جاتے ہیں کہ سر پر رکھ لیتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ شبلی جاننے کے تہیہ میں ہیں اور عطیہ کیگم کو لکھتے ہیں عجز و زودی آئم و ای ہم و بیارت۔ اس مختصر مصرع میں جذبات کی ایک وسیع دنیا مضمر ہے جس کی تشریح نہیں ہو سکتی عطیہ کیگم ولایت جاہی ہیں۔ مولانا عالم تصور ہیں

فرماتے ہیں سہ می روی دگر یہ می آید مرا
ساعتے بغضیں کہ باراں بگزدو
ایک خط میں فرماتے ہیں "اپنی تصویر بھیج دو" ایک نامزد شوق میں اپنے منتخب فارسی اشعار بیکم کو سناتے ہیں اور ان کی تشریح بھی کرتے ہیں مختصر یہ ہے کہ یہ خطوط جن جذبات و کیفیات کے حامل ہیں۔ غالباً کسی اور ادیب کے خطوط کو وہ بات نصیب نہ ہوئی۔ ان خطوط سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم طبقہ نسواں کے متعلق کیا کیا خیالات رکھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ یہ جنس لطیفہ یہ گدہ سنہ جمال یہ میکہ ناز و داد یہ نصف نازک یہ جوہر نادر، پیسٹی زیبا، مجسمہ شرف و افتخار وادی کامل کی متخی ہے۔

بلبل ہندو سرودھنی نیڈو کے چند نغمے

(۱) ہندوستانی جلابے

طلوع صبح کے وقت اسے عزیز جلابو! تم کین بن رہے ہو۔ نفیس درخو بصورت کپڑا صبر تک نیکل نکھ کے پکڑی طرح آسانی ہے، کیسے؟

یہ ایک نوزائیدہ بچہ کا جامہ ہے!

غروب آفتاب کے وقت اسے عزیز جلابو! رستم یہ کون کپڑا بن رہے ہو؟ یہ چمکیلا کپڑا جو نرم اور پڑاؤں کی طرح سرخ و قمری رنگ کا ہے، تم کس لئے بن رہے ہو۔

ہم ایک عروس نو ملکہ جن کے رومے روشن کے لئے نقاب تیار کر رہے ہیں

اے عزیز جلابو!۔ چاند کی خاموش سرور غم آگیز کروں کی پھیکی روشنی میں غم منوم و متفکر و سرنگوں بیٹھے ہوئے اس قدر تجھ کی کے ساتھ یہ کون کپڑا بن رہے ہو؟۔ یہ مرغ کے پکڑی طرح نرم اور مادل کی طرح سفید رنگ کا کپڑا کس لئے بنا رہے ہو؟

ہم ایک نئے کافن تیار کر رہے ہیں!

(۲) کسٹرن

مست، تیز اور زرد و اثر خوشبودار، لطیف و نازک و چمکیلے پھولا۔ تمہاری لہجی ہوئی کپڑا عطر و آرائش کے گہوارے میں

میرسوئی کا غم نہیں ہے

ان پیکھڑوں میں:-

سیتا کی آرزوئیں چھپی ہیں

کے ارمان پوشیدہ ہیں

درویدی

کا خوف وراس موج رہے اور

ویننتی

کے انگلیاں غمیں ہیں

شکستہ

فہرست مضامین ہمایلوں

بابت ماہ جون ۱۹۳۲ء



تصاویر: (۱) نوموئی در ۲۲ مین آرٹ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۸۴	ہمایلوں کا سالگرہ نمبر	۱	ہمایلوں کا سالگرہ نمبر
۴۸۵	جہاں منا	۲	جہاں منا
۴۸۸	جناب سید مقبول حسین صاحب احمد پوری	۳	جین آرٹ
۴۹۲	جناب میر سعادت حسین صاحب نجیب	۴	ماہ دسے (نظم)
۴۹۳	جناب محترمہ ح. ب. صاحبہ	۵	بہار (۲)
۴۹۴	فلک پیما	۶	یاد
۴۹۵	جناب مجاز مارونی رودلوی	۷	غزل
۴۹۶	حضرت عاشق بلالوی	۸	اک خط
۴۹۹	جناب منصور احمد صاحب	۹	لوتوسی فتح (افسانہ)
۵۱۵	حضرت صدق جاسی	۱۰	یاد وطن (غزل)
۵۱۶	حامد علی خاں	۱۱	غزل
۵۱۷	حضرت حفیظ ہوشیار پوری	۱۲	"
۵۱۸	حضرت منظور سرور شہجو پالی	۱۳	شعاعیں
۵۲۵	جناب نواب جہد السہیح صاحب پال اثر صہبائی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔	۱۴	راحت کہہ (قطعات)
۵۲۶	" ڈوم۔ ڈوم"	۱۵	فخ تنقید (افسانہ)
۵۲۹	حامد علی خاں	۱۶	چیمیاں (نظم)
۵۳۰	ایم عبدالقادر صاحب	۱۷	اسلام اور اشتراکیت
۵۳۳	جناب مددی علی خاں صاحب	۱۸	ڈاکو (افسانہ)
۵۳۱	حضرت ریاض عباسی امر دہی	۱۹	خیالات پریشان (نظم)
۵۳۲	بک	۲۰	بادام کہ دلیا؟
۵۳۳		۲۱	مفضل ادب
۵۳۶		۲۲	مطبوعات موصولہ

ہمایوں کا سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء

رسالہ اردو آوازنگ آباد دکن کی رائے

یہ رسالہ میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (اگسٹ) پریزنٹ لاکے زیر ادارت ایک خاص اصول اور نیت کے ساتھ شائع ہوتا ہے جنوری ۱۹۳۲ء میں اس کا سالگرہ منبر شائع ہوا جس میں تنوع مضامین کے ساتھ ہر قسم کی لمپیسی اور حسن و خوبی کا خیال رکھا گیا ہے۔ متین تحریروں کے ساتھ تفریحی مضامین بھی ہیں یکساںہ نظموں کے ساتھ غزلیں بھی ہیں چھوٹے افسانے ہیں تو ڈرامے بھی ہیں خود داخل ایڈیٹر اور شریک ایڈیٹر کی اچھی اچھی نظمیں درج ہیں تصویروں کا معاملہ بہت بے ڈھب ہے تاہم ہمایوں کی تصویریں معقول ہیں اور تعاقب بہتر ہیں۔

جدید سیاست (لاہور) کی رائے

ہمایوں ادبی علمی اخلاقی لحاظ سے اس درجہ بلند ہے کہ شاید ہی کوئی رسالہ اس کی ٹھکر کا ہو۔ ادارہ تحریر میں میاں بشیر احمد بی۔ اے اگسٹ پریزنٹ غفلت الصدق میاں شاہ دین صاحب مرحوم و جناب حامد علی خاں صاحب ایسی ممتاز و مایہ ناز شخصیتیں ہیں حال ہی میں ہمایوں کا سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء شائع ہوا ہے دوسرے رسالوں میں تصاویر کا معیار نہایت پست اور گھٹیا ہوتا ہے لیکن آپ اگر اس سالگرہ نمبر کی تصاویر دیکھیں گے تو انتخاب کنندہ کے حسن مذاق کی دلائل بغیر نہ دیکھیں گے مضامین منظوم و نثر کا بشیر احمد ادارہ کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر مضامین ملک کان ممتاز حضرات کے لکھے ہوئے ہیں جن کے نام یہی سے آپ حضرات پر واضح ہو جائے گا کہ ان میں تیز نگاہوں سے کھلے ہوئے مضامین کس نہ ہر بلند و شاندار ہو گئے مثلاً حضرت جوش ملیح آبادی خواجہ حسن نظامی مزار فاضل اللہ بیگ ششی بریچندریہ سیاح جید پیرم انصاری حضرت آئن ہاروی مولانا جمال الدین اکبر سید ضاعلی وحشت بیگم شائہ انصاریہ کن گول بریچاندریہ علامہ تاج الدین بیگم سید اس مسعود بہادر وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی محترمہ بشیر احمد بیگم صاحبہ نورانی محمد عمر صاحبان مختصر ج۔ ب صاحبہ محترمہ اصغر بیگم اصغر گونڈوی خواجہ حیدر حسن دہلوی پروفیسر احمد علی صاحب دہلوی عرض کیے کہ کس کا نام لکھا جائے۔ سالگرہ نمبر حقیقتاً نا در در زگار ہے۔ کتابت طبعات اور کاغذ نہایت نفیس ہے۔ سرورق رنگین ضخامت سواد و سوسمفناات۔

جہاں نما

مشرقی مصوری

مشرقی مصوری نے جو ان چار نو جوان صناعتوں میں سب سے کم عمر ہیں، جن کو حکومت نے انڈیا ہاؤس (نیشن) کی آرائش کے لئے متعین کیا ہے، ایک ملاقات کے موقع پر مشرقی مصوری کے متعلق حسبِ ذیل خیالات کا اظہار کیا:۔

بیسویں صدی اپنے ماضی کا احترام کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی حال کی بھی عزت کرتی ہے اور مستقبل سے بھی اپنے آپ کو وابستہ سمجھتی ہے۔ اُن دنوں کے مقابلہ میں جب ڈاکٹر ہندرناتھ ٹیگور ڈاکٹر ہادل کی سرپرستی میں نو جوان صناعتوں کی ایک جماعت کے ساتھ فنونِ مشرقیہ کے احیاء کا کام کر رہے تھے حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں، مگر مشرقی مصوری اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی یہ اسی دیومالائی شان سے اب بھی اپنے ماضی کی بھونٹھو تصویر ہے بیسویں صدی کی روزمرہ زندگی اور ہندوستانی معاشرت کا جو اپنے ماضی سے بالکل مختلف ہے اس میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ہمیں اپنی دلچسپیوں، اپنی خوشیوں، اپنی حسیات اور اپنے دکھ درد کا اس میں کوئی سراغ نہیں ملتا حقیقت یہ ہے کہ مشرقی فنون کی ترقی میں ہماری قدامت پرستی بہت کچھ حائل رہی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو ماضی سے وابستہ کر لیا ہے اور حال کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ عہدِ حاضر کے جذبات سے بے اعتنائی کر کے ہم نے اُس پر کسی طرح کی گزرت حاصل نہیں کی اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی فن اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے قومی جذبات کا مظہر نہ ہو سچ تو یہ ہے کہ ہم صرف اپنے قدیم استادوں کی بنائی ہوئی محدود چیزوں ہی کو دوبارہ دہلاتے اور بناتے رہے ہیں اور پھر ڈھالتے اور بناتے رہے ہیں۔

درزی کا خط خدا کے نام

پولینڈ کے کسی قصبہ میں ایک غریب درزی رہتا تھا۔ حکومت کے افسیسوں سے اس کی مالی مشکلات انتہا کو پہنچ گئیں تو اس نے یالوسی کے عالم میں نہایت خلوص اور سچے اعتقاد کے ساتھ خدا کے نام ایک خط لکھا۔
دارسا کے ڈاک خانے میں جب یہ خط سارٹروں کے ہاتھوں میں پڑا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ لفافے پر

یہ الفاظ تھے:۔

بخدومت خدا کے ذوالجلال

فغانے پر ٹکٹ بھی لگے ہوئے تھے، دوک خانے واسے بہت پریشان ہوئے کہ کیا کریں آخر انہوں نے خط پوسٹ مارٹر جنرل کے پاس بھیجا اور اُس نے یہ خط مارشل پلسٹوڈ کی کو دکھایا۔ مارشل نے خط کھولا تو اسے حسب ذیل تقریر نظر آئی:-

پیارے خدا میرزا نام دی کارکنکی ہے اور میں درزی کا کام کرتا ہوں جیسا کہ تجھے علم ہے میں سخت مقرر ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ پر بہت سے ٹیکس لگ گئے ہیں اب میں ٹیکس ادا کرنے سے قاصر ہوں اس لئے میری چیزیں بھی تفرق ہونے والی ہیں۔

سو پیارے خدا میں سخت مشکل میں گرفتار ہوں، اور تجھ سے رحم کی التجا کرتا ہوں، کیونکہ تیرے سوا مجھے اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی اگر تو نے مدد نہ کی تو میں اور میرے گھر کے لوگ فاقوں سے مر جائیں گے۔ تجھے فوراً ایک ہزار لائی بھیج دے اس رقم سے میرا گھر پھر سرت اور راحت کا گوارہ بن جائے گا (ایک ہزار لائی = ۲۰ پانڈل) اس خط کے نیچے درزی کے دستخط تھے۔ مارشل پلسٹوڈ کی نے کچھ دیر غور کیا اور پھر اپنے سیکریٹری کو بلا کر حسب ذیل جواب لکھوایا:-

خدا کا جواب

”یہ خط ایک نوٹ پیپر پر لکھا گیا جس پر قصہ بیلویدر (مارشل کا محل) کی مہربانی مضمون یہ تھا:-
”مسٹر دی کارکنکی! تجھے تمہارا خط ملا۔ اس خط میں تم پانچ سو لائی کا ایک چک پاؤ گے۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے وطن کے ایک نیک اور وفادار شہری ثابت ہو گے۔“

چند دن کے بعد شکر گزار درزی کی حسب ذیل تقریر قصہ بیلویدر میں پہنچی:-

پیارے خدا! میں اس رحم اور کرم کے لئے جو تو نے ایک غریب درزی کے حال پر کیا تیرا ہزار ہا شکر ادا کرتا ہوں۔ واقعی تو نیکی اور محبت کا خدا ہے، ہاں ایک عرض ہے کہ اب دوبارہ جس وقت تو مجھے روپیہ بھیجے تو قصہ بیلویدر کی راہ سے بھیجیو کیونکہ ان لوگوں ہر رقم کا نصف حصہ فوجی مصارف کے لئے وضع کر دیتے ہیں۔

پودوں کے ہلاکت خیز کیڑے

پودوں کو تباہ کرنے والے کیڑے مختلف رنگوں اور مختلف قسموں کے ہوتے ہیں۔ یہ سبز بیلوں وغیرہ کے پتے کھا جاتے ہیں، پودوں کے تنوں میں سوراخ کر دیتے ہیں۔ اگر اس قسم کے کیڑے بہت زیادہ بڑھ جائیں تو بیڈ آرسینیٹ چھڑکنے سے ہلاک کئے جاسکتے ہیں۔ جو کیڑے درختوں کی گڑھی میں سوراخ کرتے ہیں انہیں فوراً ہلاک کر دینا چاہئے۔ سوراخوں کے اندر ان کے بچے ہوتے ہیں ان کو ہلاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دو حصے کلوروفارم اور ایک حصہ کریزڈٹ ملا کر اس محلول میں روئی تر کر کے سوراخوں میں ٹھونس دی جائے اور پھر سوراخوں کے منہ موم سے

بند کر دیئے جائیں۔

سیب کی غذائیت

مال کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ کھانے سے پہلے سیب کو چھیلنے سے اس کا سب سے زیادہ مقوی اور صحت افزا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ یہ ثابت ہوا ہے کہ چھلکے میں گودے سے چھ گنا زیادہ قوت حیات ہوتی ہے۔

اخلاقیات کا ایک دستور

نٹن کے ایک جج نے زندگی کی چودہ بڑی غلطیاں یوں گنائی ہیں (۱) نیک و بد کا اپنا انفرادی معیار مقرر کر کے یہ توقع رکھنا کہ ہر شخص اس کی تصدیق کرے (۲) اپنے حظ و نشاط سے دوسروں کی نشاط کا اندازہ لگانا (۳) اس دنیا میں ہم آہنگی ڈالنے کی توقع رکھنا (۴) جوانی سے عقل اور تجربے کی توقع رکھنا (۵) یہ کوشش کرنا کہ سب لوگوں کی طبیعتیں یکساں ہو جائیں (۶) غیر اہم اور فضول باتوں میں طرح نہ بے جانا (۷) اپنے اعمال میں اکہلیت کی توقع رکھنا (۸) جن باتوں کا کچھ علاج نہ ہو ان کے لئے اپنے آپ کو اور دوسروں کو پریشان کرنا (۹) اُس بار کو کم نہ کرنا جس کا کم کرنا ضروری ہو اور ہبا سے اختیار میں ہو (۱۰) دوسروں کی کمزوریوں کو دوست نگاہ سے نہ دیکھنا (۱۱) کسی ایسی بات کو ناممکن سمجھنا جو ہم خود نہیں کر سکتے (۱۲) صرف ان باتوں کو ماننا جنہیں ہی عمدہ و دماغ سمجھ سکتا ہے (۱۳) اس طرح زندگی گزارنا کہ کوئی خاص لمحہ کوئی خاص وقت کوئی خاص دن لشنا اہم ہے کہ کبھی نہ گزرے گا (۱۴) انسان کے متعلق کسی بیرونی معیار سے اندازہ لگانا حالانکہ وہ معیار جو انسان کو انسان بناتا ہو انسان کے اندر ہی ہے۔

اردو اکادمی

جامعہ ملیہ دہلی نے علمی تحقیق اور اشاعتِ علوم کی غرض سے یہ شعبہ قائم کیا ہے۔ ہم نے اکادمی کے قواعد دیکھے ہیں جو بہت امید افزا ہیں۔ اکادمی کے زیرِ اہتمام ایک مفید علمی رسالہ جامعۃً اور ایک تعلیمی رسالہ پیامِ تعلیم بھی شائع ہوتا ہے۔ ہم بھی خوانانِ اردو سے متوقع ہے کہ وہ اکادمی کے قواعد منگو کر ان کا مطالعہ کریں گے اور اکادمی کے رکن بن کر اپنی زبان کی خدمت میں اس کا ماتہ ثباتیں گے۔

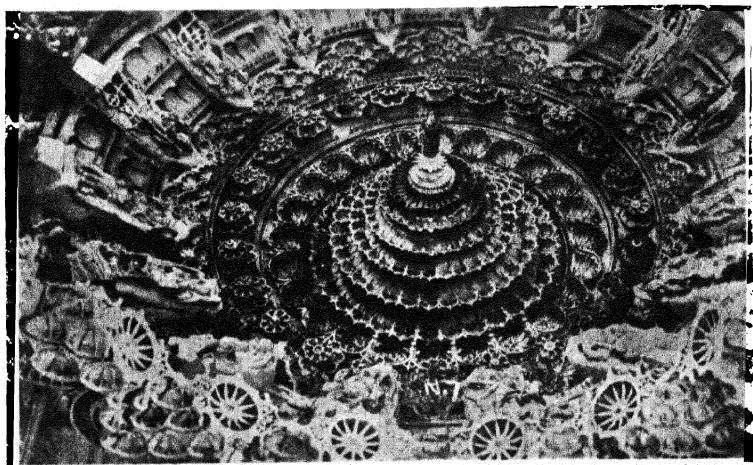
نصاویر

(۱) حسین آرٹ کا یہ نفیس نموز ہمیں سید قبول حسین صاحب نے اپنے مضمون میں آرٹ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین ہمایوں اسے دلچسپی سے دیکھیں گے (۲) نومولود یہ تصویر ایک سن آرٹسٹ ایچ کالباخ کے فن کا نمونہ ہے۔ یہ کی پیدائش کے متعلق یہ ایک نہایت دل خوش کن تصویر ہے کہ فرشتہ نومولود کو اٹھائے ہوئے منظر گھر میں لئے آ رہا ہے۔

جین آرٹ

کسی قسم کی تجدید کیوں نہ ہو ہمیشہ عام پسند ہو کر تھی ہے، عام پسند اس لئے کہ ہر تجدید سے ایک نئے حسن کا وجود ہوتا ہے۔ گویا تجدید بھی ایک قسم کی ترسیم ہے یعنی اس سے اصلاحی فرائض بھی ادا ہوتے ہیں۔ اس کی تاریخی مثال مغرب میں مارٹن لوتھر کی تحریک ہے جس نے مغربی فنِ بُت تراشی سے مذہبی عنصر کو خارج کرنے میں مدد دی۔ شاید اسی طرح بدھ مذہب کے بعد چوتھوں کے اقتدار نے ہندوستان کے آرٹ پر اثر ڈالا کیونکہ جین لوگ جن کو بدھ مت کے بعد فروغ حاصل ہوا اور جواہر عموماً جنوبی مغربی ہندوستان میں زیادہ آباد ہیں اور جن کے بڑے بڑے مند رگرنار پر بُت "اور ماؤنٹ آلو" وغیرہ پر اب بھی شان و شوکت سے قائم ہیں۔ قدیم بدھ آرٹ کی طرح تیگ اور پیراگ کی خشک اور ضیالی مصوری کا نمونہ پیش نہیں کرنے ان کا آرٹ اصلیت پر مبنی ہے۔ البتہ اُن میں فنِ تعمیر کے چند ایسے نمونے بھی دیکھے گئے ہیں جن پر رسمیات کاہت کچھ اثر ڈر گیا تھا۔ علاوہ رسمیات کے جین آرٹ میں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ مذہبی تخیل کو پیکرِ تصویر میں لانے کے بجائے جین کاریگروں نے اپنی آرائشی تخیل کو بہت کچھ ظاہر کیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ مسلمانوں کے ساتھ موافقت رکھتے ہیں۔ مگر مسلم آرٹ میں رسوم کو دخل نہیں جین لوگوں میں یہ بہت ہے۔ آرائشی عنصر جین آرٹ میں بالکل اسی طرح نمایاں ہے جس طرح کہ یونانی آرٹ میں پہلوئی اُن بان۔ اب تک آرائش صرف مسلمانوں ہی کا حصہ مانی گئی تھی لیکن جنوبی مغربی ہندوستان میں چند جین عبادت خانے ان کی آرائش کے ایسے نمونے پیش کرتے ہیں جن کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ جین لوگ اگر مسلمانوں کے مقابل نہیں تو بہت پیچھے بھی نہیں۔ البتہ چند باتیں اُن کے آرٹ میں قابلِ اعتراض ہیں جن پر شاید ابھی تک کسی نے غور نہیں کیا۔ مثلاً عبادت خانوں کو ایک قسم کی روحانی میوسلٹی ثابت کر دکھانا۔ آؤ شرب یا سوشل آرگن تو دنیا کا ہر مذہب ہو گیا ہے جین عبادت خانوں پر میوسلٹی کا اطلاق یوں ہو سکتا ہے کہ ان کی تعمیر میں شایندہ رائے اور چٹھاوے وصول کرنے کی غرض بھی پنہاں تھی۔ مثلاً کوہ آلو کے پاس جو جین لوگوں کے بڑے مند رہیں ان

THE HUMAYUN.



جین آڈٹ

THE HUMAYUN.



نومولود

SALCUTTA
ART & WORKS
LAHORE

سے ہمارے قول کی بخوبی تصدیق ہو سکتی ہے۔ یہ مندر آبادی سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر جانب شمال ایک دادی نانشیب میں واقع ہیں۔ سنگ مرمر سے تعمیر ہوئے ہیں۔ باہر سے کچھ ایسے زیادہ دیدہ زیب نہیں معلوم ہوتے مگر اندر سے دیکھا جائے تو بہت تراشی اور نقاشی کے نو نے اپنی نوعیت سے نگاہ میں چکا چونکی کیفیت پیدا کرتے ہیں یہاں ان مندروں کا مفصل حال لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان میں جو بڑا مندر ہے اس کو دواڑہ کہتے ہیں۔ اس کے اندر ایک متعلیٰ صحن ہے جو چھوٹے چھوٹے جردوں سے گھرا ہوا ہے۔ ہر حجرے میں ایک مریں گدی پر ایک مریں بت بحالت نشست دکھلایا گیا ہے۔ بہت اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ گویا کوئی نذرانہ قبول کر رہا ہو۔ بجاریوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ چڑھاوا ان کے ہاتھ ہی پر رکھا جاتا ہے اور چاندی سے گھنیا چیر مثلاً پیسے وغیرہ کو بچائے ہاتھ پر رکھنے کے پیر کے پاس رکھ دیتے ہیں غرض مندر کے چاروں طرف کم از کم پندرہ بیس بت تو ایسے ہونگے جو اس صورت میں ظاہر کئے گئے ہیں صحن کے بیچ میں بڑی دیوئی کا حجرہ ہے جس کو مندر کا قید کنا چاہتے۔ حجرے کے اندر دیوئی کا بت سنگ سیاہ ہو بنایا گیا ہے وہاں ہر قسم کا نذرانہ دیوئی کے پیروں کے پاس رکھا جاتا ہے۔ ان باتوں پر غور کرنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ عبادت خانے روحانی انکم ٹیکس آفس کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ان کے ادرت سے رسمی اثرات ان مندروں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اکثر ایسی باتیں ہیں جو نیم مذہبی اور نیم رسمی ہیں مثلاً ہاتھیوں کے مجسمے پر ذمیر سنگولی نے لکھا ہے کہ ہاتھی زمانہ قدیم سے ہندوستان میں مقدس سمجھا جاتا ہے ہاتھی کو خواب میں دیکھنا شگون نیک ہے۔ آپ نے اریسہ کے عبادت خانوں سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں مگر شاید کہ وہ بڑے بڑھ کر نمایاں مثالیں ہندوستان بھر میں کہیں نہیں۔ غار ہائے ایورا وغیرہ میں مجھے بکثرت ہیں مگر دواڑہ کے ہاتھیوں کی طرح یکجائی کی حالت میں کہیں نہیں کیونکہ دواڑہ مندر کے ایک بڑے کمرے میں ہاتھیوں کی ایک قطار بنائی گئی ہے۔ ہر مجسمہ سخت سنگ مرمر سے تراشا گیا ہے اور مربع مساوت و ہودج دکھلایا گیا ہے، ہاتھیوں کی یہ قطار سیاحوں کو حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ ان مجسموں کے ذیل ڈول کا تناسب قابلِ تعریف ہے اور لطف یہ ہے کہ ہر مجسمہ زیوروں سے معلق و مزین دکھلایا گیا ہے۔

شاید ہندو مذہب کے بعد جدید ہندو مذہب کے تمام مصوروں نے کانگڑے کی پہاڑیوں ہی کو اپنا مسکن بنایا تھا کیونکہ ہندوستان میں جدید آرٹ کی مستند شکل صرف کانگڑا اسکول ہے۔ جین آرٹ

۱۵۔ اس کی بابت یہ بھی مشہور ہے کہ اندھرا دیوئی نے ایک بڑے پٹو کو خواب دکھلایا کہ فلاں جگہ میرا عبادت خانہ بنوایا جائے اور یہ کہ اسی جگہ سنگ مرمر کی کان بھی موجود ہے،

کا بچھا اسکول سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اور اس بات پر شاہد ہے کہ جب مذہبی جذبات کا رنگ فنون لطیفہ میں ہلکا ہونے لگا تو رسمیات کا رنگ خود بخود گہرا ہونا لگیا۔ چنانچہ جس قسم کے پھول جس صورت میں بتوں پر چڑھائے جاتے تھے اسی صورت میں انہی قسم کے پھول پتھروں میں بھی تراش کر دکھائے گئے ہیں۔ قدیم زمانے سے دیوتاؤں پر عموماً گنیز کے پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ دلوڑھ مندر کی دیواروں پر وہی جا بجا تراشے گئے ہیں۔ جاوڑوں مثلاً گھوڑے اور ہاتھیوں کے لئے عموماً گیندے کے پھول وقف ہیں چنانچہ گیندے کے پھول چوپایوں کے عیسیتوں پر ظاہر کئے گئے ہیں۔ ہاروں اور بدھتوں کا رواج ہندوستان میں زمانہ قدیم سے ہی اس لئے مندروں کی محرابوں کا کام محراب نما ہار ہی دیتے ہیں جو مستطیل منادیوں کے بالائی سرے پر اردو سنگ "ہ" سے مشابہت نہایت خوبصورتی سے تراش کر دکھائے گئے ہیں۔ دلوڑھ مندر میں اس قسم کی نئی محراب بھی دیکھی گئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ والی ریاست سر دہنی نے جن کی عملداری میں وہ مندر واقع ہے بصر فہرہ کثیر مرت کر کے لگوایا ہے۔

اس مندر میں جڑوں کے سامنے جو برآمدہ ہے اس کی دیواروں کے نقش و نگار پانٹالی نہیں دیکھتے لیکن شاید اس کی چھت کا مقابلہ تو عہد قدیم کی کوئی عمارت نہ کر سکے گی بلکہ اس معنوں سے متعلق تصویر جو اسی نمبر میں شائع ہوئی ہے اسی چھت کی تصویر ہے۔ اس کو دیکھ کر عین لوگوں کے آرائشی جذبے کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پتھر کی کانٹ چھاٹ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آیا پتھر نگار کے سامنے میں ڈھالا گیا تھا یا یہ موم کی طرح نرم کر کے تراش گیا تھا کہ یہ نزاکت پیدا ہو گئی۔ قدیم ہندوستان کی دستکاری کا غالباً یہ پہلا نمونہ ہے جو شاید روضۂ تاج کی دستکاری کا مقابلہ کر سکے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ قدیم عمارتوں کی دستکاری میں پھول پیل کے ساتھ ہیبت ناک تصویروں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً انڈون کی شکلیں، سانپ بچھو کی تصویریں، جنوبی ہندوستان میں ہاتھیوں کی شکلیں شمالی ہند میں مچھلی اور طاؤس کی تصویریں وغیرہ بہت عام نہیں۔

شاید یہ تمام شکلیں کسی جذبہ تقدیس پر مبنی ہیں اور چونکہ پھول پیل کے ساتھ یہ شکلیں بنائی گئی ہیں اس لئے ان کو کارکنروں کے دفاعی اجتماع اعداد پر محمول کرنا چاہئے۔ ان سے ان کے معاشرتی جذبات اور خیالی احساس کا بھی پتہ چلتا ہے اور ہمیں یہ کہنے میں بالکل پس و پیش نہیں ہوتا کہ اگر مغربی آرٹ میں ترتیب

لے شاید انہی خوبیوں کی وجہ سے راجہ صاحب سر دہنی کی طرف سے ۶ لاکھ ٹکٹ مقرر ہے کہ جو مندر کو دکھانا چاہے ٹکٹ لے کر جائے اور مندر کھٹنے کے خاص اوقات بھی مقرر ہیں۔

و مناسب کا خیال نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور اسلامی آرٹ فطری آرائش کا شہید ہے تو مشرقی آرٹ میں بقول پروفیسر گنگولی ضرورت سے زیادہ فراخ دلی بلکہ اسراف ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہندوستانی آرٹ کسی خاص قومی جذبے پر مبنی نہیں ہے۔ اس کا انحصار تو صرف انفرادی کوششوں پر ہے۔ لہذا انفرادی جذبہ اس پر غالب ہے بقول پروفیسر پرسی براؤن (Percy Brown) تبعد اور راجپوت نقاشی و سنگ تراشی نے ہندوستان کی روحانی زندگی کو نمایاں کیا۔ دونوں کا مقصد یہ ہے اور خصوصیت تصوف یا تیگ۔ برخلاف اس کے مغل نقاشی اور کانگوا اسکول کے آرٹ کو نو نیایت سے تکلفی کے ساتھ فطری آرٹ کہنا چاہئے۔ یہی تقریبی عنصر جوین آرٹ میں نہیں معلوم کیونکہ شامل ہو گیا۔ اسی تقریبی عنصر کی وجہ سے چین آرٹ پر لفظ فن لطیف کے مفہوم کا صحیح اطلاق ہو سکتا ہے۔

بُدھ لوگوں کی طرح چین آرٹ فلسفی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ وہ تو زے نقاش ہیں اور ان کے نقوش ہر قسم کے رنگ و تخیل سے بالکل ستر ہیں۔ نقش روحانیت کو ظاہر کرنے کی کوشش وہ ضرور کرتے ہیں مگر اس کوشش میں وہ ایک حقیقت واقعی کو ظاہر کر دیتے ہیں گویا ان کا مصوٰرہ ضمیر جذبہ تخیل پر غالب آکر ان کو فنون لطیفہ کی اصطلاحی خاصیتوں پر قائم رکھتا ہے اور آرٹ کے اصولوں سے تجاوز نہیں ہونے دیتا۔ یہی آرٹ کی غرض و غایت بھی ہے بقول آسکر وائلڈ "آرٹ کو دیاں اور آرٹ کو نہاں کرنا آرٹ کا مقصد ہے۔" اس اعتبار سے چین نقاش کو حقیقی آرٹ کہنا بے جا نہیں۔ واقعی حقیقی حسن تو اُسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ وہ حسن ہے اگر اس میں تخلیقی عنصر شامل ہو گیا تو وہ حسن کیوں رہا وہ تو ایک قسم کی تشریح و تفسیر ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ مبالغہ جس کو اہل نظر ہمیشہ سے توازن و تناسب کی بربادی کا باعث سمجھتے رہے ہیں مشرقی آرٹ مشرقی ادبیات مشرقی معاشیات وغیرہ وغیرہ میں اُس کو بہت کچھ دخل رہا ہے مگر جس طرح آج کل مغرب نے مشرق کو واقعیت اور اصلیت کا گردیدہ بنالیا ہے شاید اسی طرح چین آرٹ نے بُدھ آرٹ میں نجدید کی۔

سے مقبول حسین

(احمد پوری)

لے اریہ اور اس کی یادگاریں

Indian Painting

لے نادل The Picture of Dorian Gray

ماہِ دے

لطف رونقِ بازگی پاکیزگی ہر شے میں ہے
 دُھوپ کیا خوش نگاہ ہے سردی ہو کتنی خوشگوار
 شام کیا رنگین ہے کیسی ہے نورانی سحر
 کیا نشاطِ افزا ہو وقتِ صبح کُھرے کا سماں
 گھاسِ پُشپم کے قطروں کی چمک تو دیکھئے
 ساگردوں کا ہو گیا ہر صاف پانی کس قد
 نیلوفر کیا کھل ہے ہیں نہیں رہے ہیں کیا کنول
 کینکی، چمپا، چنبیلی، ناگیسرا دو پہریا
 بہر سیرِ لالہ و گل کیوں نہ جساؤں بار بار
 مائے کیا ترپاتی ہو شب کو ٹیڑھی کی صدا
 صُبح کو طائوسِ شام، رات کو سارسِ چکور
 مائے کیا تاثیر کیا فرحت ہوئے دے میں ہے
 کس قدر لطفِ بخشگی ہر شجر کے فے میں ہے
 کیا ہی فرحت ناکِ نظر چاندنی کا دے میں ہے
 ایسے جوش و جد کی حالت بھلا کس شے میں ہے
 ایک بھی ایسا دُش خوش آبِ تاج کے میں ہے
 اس کی سی پاکیزگی کب انگبین دے میں ہے
 منحصر ہے کیا انہیں پر دولہ ہر شے میں ہے
 کتنے پھولوں کی مہک سوجھ، تھلے دے میں ہے
 دوڑتی اک لہری ہر وقتِ ست و پے میں ہے
 سوز و درد ایسا کہاں آواز ساز دے میں ہے
 مرت ہر مرغِ خوش الحان اپنی اپنی لے میں ہے

واہ کیا رُت ہے کہ دُنیا شاد ہو ساری نجیب

کوئی مجھ چنگ و نغمے کوئی شغلِ نئے میں ہے میرِ سعادتِ حسینِ نجیب

بہار

قاصد بہار کا ابھی پہنچا ہے باغ میں جوشِ نمونے حشر اٹھایا ہے باغ میں
اُترے ہیں آسمان سے ملائک زمین پر رحمت نے اپنا قافلہ بھیجا ہے باغ میں
سوئے پڑے تھے ننھے سگونے بلا کی نیند یہ کس نے اُن کو آن جگایا ہے باغ میں
کیوں غنچے کُبلہ کے نکل آئے شاخ پر پھولوں نے کس امید پہ جھانکا ہے باغ میں
شمشاد اور سرو نے پہنی قبائے سبز جامہ نیا مانا نے بدلا ہے باغ میں
ہیں سُرخ سُرخ پھول کہ پریاں ہیں سُرخ پوش یاخوریوں کا قافلہ اُترا ہے باغ میں
ہر گل کو گدگدائے صبا نے ہنس دیا ان قمقموں سے گونج سی پیدا ہے باغ میں
نکمت میں اوز نکھار میں جھگڑے غضب کے ہیں دونوں میں اک مہکار بہرپا ہے باغ میں
بٹھی ہیں شاخ شاخ پہ سر توڑ تیرتلیاں بھوزوں نے چھول پھول کو گھیرا ہے باغ میں
کیا قمریوں نے شور مچایا ہے سرور پر کیا بلبلوں نے پھول پہ گایا ہے باغ میں

یاد

اے پری تو آجا۔ سہانا دن ہے، دل آرزو مند ہے اور تو باد فغا ہے۔ آجا، جلدی آجا۔ کیا تیرا نام لے کر تجھے پکاروں؟ کیا میں بھی اہل نظر ہوں کہ دن میں پانچ دفعہ چنچ چنچ کر اس خدا کو پکاروں جو نہرگ سے بھی قریب تر ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور سب کچھ کروں گا تیرا نام نہ لوں گا۔ میرا مذہب یاد ہے پکار نہیں۔

پر اسے یونان میں ایک نوجوان محبت کی دیوی زہرہ (Venus) کے وعدے پر کئی دن ایک جنگل میں جاتا رہا۔ زہرہ اُسے نظر نہ آئی۔ آخر وہ نوجوان اپنے آپ سے یوں ہمکلام ہوا۔

”دیویاں تو ہم انسانوں کی طرح عمدتاً نہیں ہوتیں۔ زہرہ کیوں نہیں آتی؟ کیا میں جنگل میں چڑیوں کے چھپے سنے کے لئے آتا ہوں؟ یا اس لئے کہ سیلاب رنگ جھیل میں لٹخوں کی اٹھکھیلیاں دیکھوں؟ ہرگز نہیں۔ مایوسی انسان کی قسمت سی مگر زہرہ کو آنا چاہئے۔“ اپنے آپ سے یہ باتیں کرتے ہوئے نوجوان جنگل سے چل نکلنے کو تھا کہ جھیل کے طوفان میں سے دو پیراک نمودار ہوئے۔ نوجوان کلیجہ قدام کر رہ گیا۔ ہمہ تن حیرت تھا کہ کیا محض بیخبری سے ایک فانی انسان عنقریب دو غیر فانی ہستیوں کا ہم چلیں ہوئے کو ہے۔ لہروں کو چیرتی ہوئی مارتھ میں مارتھ دئے دو نوجوان لڑکیاں نکلیں۔

نوجوان کا دھڑکتا دل اس خیال سے کہ نہیں یہ تو انسان ہیں قابو میں آگیا۔ پہلے جو ڈر کے ماسے اکھٹیں نیچ کر کے ٹھٹھک کر رہ گیا تھا وہ حالت نہ رہی۔ ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دونوں لڑکیاں لہروں سے نکل کر درخت کے نیچے ایک دوسری سے گویا قد و قامت کا سوا زنہ کر رہی تھیں ایک دوسری کو ناپنے لگیں اور جھکیں کر زمین سے کوئی لمبا سا تنکا اٹھالیں اور اسی سے اپنے آپ کو ناپیں۔

اتنے میں اس نوجوان کے پاؤں تلے ایک خشک پتہ لپسا اور اس آہٹ پر ان لڑکیوں میں سے وہ جو اپنے آپ کو نپوڑ رہی تھی کہنے لگی ”تم سے کام ہے۔ یہاں آؤ“ اور پھر یوں بولیں۔

ہم دونوں یوٹا سے تیر کر آئی ہیں اور ہمارا معاہدہ تھا کہ جو مرد پہلے اُسی سے فیصلہ کرائیں کہ کس کا اُبھار زیادہ حسین ہے مگر کوئی ادھر ادھر نظر نہ آیا تو ہم خود ایک دوسرے کو ناپنے لگ گئیں۔

یونان کا یہ پرانا قصہ لمبا ہے۔ محبت کی دیوی نے اپنی شکل ایک لڑکی کو دے دی۔ گویا ایک کار آمد

روپ میں اُسی منظر نوجوان سے آئی۔ یہ نوجوان وہی سنگ تراش تھا جس کا بنایا ہوا Venus (دزہرہ) کا مجسمہ دنیا بھر کی حُسن پرست لگا ہوں کا کعبہ ہے۔

اے میری پری۔ میں سنگ تراش نہیں ہوں۔ میرے پاس صرف ہلکا سا لفظوں کا جادو ہے اتنا ہلکا کہ تجھ پر نہیں چلتا۔ اتنا بھاری کہ میں اس کے بوجھ سے ہل نہیں سکتا۔

اے تمہیں آنکھوں والی پری! وہ شعاعیں جن سے دماغ روشن ہوں تیرے بسے سیاہ بالوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ خوشبو جو خوشبو بھی ہے اور شوخ قوس تیرے بھی تیرے جسم سے افشاں ہے۔

یونان کے قصے کو کیا کروں۔ میں چوہانے معبود کو نہیں ماننا پرانے حسن و عشق پر کیسے ایمان لے آؤں تو اپنی طرح کی پہلی ہے۔ نرالی ہے اور حسین ہے تو محسن پرور ہے اور چنبیلی ہے تو گلاب ہے۔ پیاری! دنیا کے زرد پھول میری ارغوانی پرستش کی کیا تاب لائیں گے؟

آکھیں تجھے یاد کرتا ہوں۔

فلک پیم

غزل

ہم اپنے دل کو طور بناتے ہوئے تو ہیں
تیرے کرم کی آس لگاتے ہوئے تو ہیں
خود گم ہوئے تو کیا اُسے پائے ہوئے تو ہیں
دیکھو نہ وہ نقاب اٹھاتے ہوئے تو ہیں
میرے نفس نفس میں سماتے ہوئے تو ہیں
دستِ دعا ہم آج اٹھاتے ہوئے تو ہیں
ہاں ہاں وہ آسمان چھائے ہوئے تو ہیں

سینے میں اُن کا نور چھپائے ہوئے تو ہیں
تیرے گناہ گناہ گناہ گناہ ہی سہی
اللہ رسی کا میسا بنی آواز گناہ عشق
ہاں! کیا ہوا وہ حوصلہ دیدارِ اہلِ دل
ذرا اُن کا گزرباں پہ نہیں ہے تو کیا ہوا
یوں تجھ کو اغنیار ہے تاثیر دے نہ دے
رونا یہ ہے کہ ناغہ غم میں اثر نہیں

ٹپتے ہوؤں کو دیکھ کے کیوں رونہ دیں مجاز
آخر کسی کے ہم بھی مٹائے ہوئے تو ہیں

مجاز بارونی رودلوی

ایک خط

پیارے سلامت، کئی ہفتوں کی پیوستہ تنہائی مسلسل عزت اور متعلق گوشہ نشینی کے بعد میں کل شام پہنچ کر کلبہ احزان سے، جو شعلہ سمرت و شعلہ آفتاب ہوں سے محروم ہے، نکلا میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے پیش نظر کوئی خاص مقام تھا یا نہیں؛ بہر حال گذشتہ سو سال سے چونکہ اسی خطہ کی خاک چھان باموں اس نے قدم خود بخود ایک اوپر چلنے کے عادی ہو ہو گئے ہیں۔ میں اس طرح پر جا رہا تھا جس کو ہم بیڈن روڈ کہا کرتے تھے اور جسے اب میونسپل کمیٹی کے تصفیہ نے دل نمد روڈ کا نام دے رکھا ہے۔ دماغ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی شگفتگی سے متعلق تھا۔ میں نے دیکھا کہ مزدوروں کا ایک جم غفیر کدالوں، بیلچوں اور چھاؤڑوں سے مسلح ایک جھان کو گرا رہا ہے۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ جو مکان گرا یا جا رہا ہے وہ یادش بخیر النجد ہے

سلام علی النجد و من جن النجد

آہ کچھ نہ پوچھو کہ اس منظر کو دیکھ کر دل حزیں کی کیا کیفیت ہوئی۔ دل جو حوادث روزگار سے پہلے ہی چھلنی ہو چکا تھا اس نظارہ کی تاب نہ لاسکا اور میں قدموں میں سرعت پیدا کر کے آگے نکل گیا لیکن تمام راہ یاس و حرماں، کرب و اضطراب اور رنج و الم کے سیاہ بادل قلب و دماغ پر چھائے رہے۔ اگرچہ عرصہ دراز سے النجد بیکانیری مزدوروں، چماروں اور دھوبیوں کا مسکن بن رہا تھا لیکن اس کس میری ہی کے عالم میں بھی وہ ان روایات کا حامل، ان داستانوں کا مرکز اور ان ہنگاموں کا خزینہ تھا جن کی یاد لاہور کی اہل دل آبادی کے ایک قابل قدر حصہ کا سرمایہ نشاط و متاع حیات ہے۔ میرے دل کی بھی ہوئی چنگا پلا پھر چمک اٹھی تھیں، ماضی کے بھولے بسرے خواب مجسم صورت اختیار کر کے پھر میرے سامنے آگئے تھے اور روح کے خوابیدہ نغے پھر بیدار ہو گئے تھے میں نے سوچا کہ سرمایہ داری اس مکان کو گرا کر اس کی بنیادوں پر ایک عظیم الشان و سرفراہ عمارت تعمیر کرے گی جس کے طفیل اُسے ہر ماہیم و زور کا ایک ڈھیر ملا کرے گا۔ لاہور کی آنے والی نسلیں، نہیں، نہیں، موجودہ نسلیں بھی، کہ آج کون الیسا دیوانہ ہے جو تاج محل کو دیکھ کر ایک غریب کے جھونپڑے کو تصور میں لانا پسند کرے گا، بھول جائیں گی کہ یہاں ایک ایسی چار دیواری بھی تھی جہاں اس زمانہ میں جب کہ تمدن جدید کی برکات پانی کی طرح عام ہو رہی

ہیں کجی کی روشنی نہ تھی۔ جہاں چند دیوانے علی الرغم مصائب حیات اسٹھ ہو کر زندگی کی الجھنوں کو مسرت و شادمانی کے قفقوں میں فنا کر ڈالتے تھے جس کی کشش کا یہ عالم تھا کہ بلال، گوجرانوالہ، پسرور، شاہ جہانپور اور مذابانے کہاں کہاں کے افراد کھینچے چلے آتے تھے۔ جس کی مٹی کو یہ تاثیر میر تقی کے خاک کو سونا بنا دیتی تھی۔

الہٰند چشم ظاہر نہیں کے لئے مٹ گیا لیکن اب بھی ایک جماعت ایسی ہے جس کے لئے زمین کا یہ ہکڑا ہمیشہ مقدس و مغزز رہے گا۔ یہ مقام مذہب عشق کے پیروں کا کعبہ بنے گا ہمسال سال کے کسی خاص حصہ میں ہندوستان کے دور و دراز خطوں سے یارانِ طریقت زیارت کے لئے ہسپا کریں گے۔ یہ زیارت گاہ عاشقان و جدہ گاہ دلفروشاں ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کی فضا اب بھی یارانِ طریقت کے قفقوں سے معمور ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ میں عشق کا سوز اور محبت کی بے کسی رچی ہوئی ہے۔ یہ وہ عمارت ہے جس کے درو دیوار میں یارانِ طریقت کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ وہ خطہ ہے جس نے سوز و سازِ حیات کے ایسے عظیم النظیر منظر دیکھے ہیں کہ مادرِ گیتی ہزاروں کروٹیں بدنے پر بھی ان کی مثال پیدا نہیں کر سکتی۔ آہ یہ وہ مکان ہے جس کے ایک محقر سے کمرے میں عاشق مجسمِ مجرور فتادگی بن کر رئیسِ المتغلبین حسرتِ مومانی کے نغمہ مانے محبت گایا کرتا تھا جس میں سلامت کبھی بند لالہ بالی بن کر غالب کی غزلیات پڑھتا اور کبھی صوفی پاکباز بن کر فرزانِ حمید کی مقدس آیات کی تلاوت کرتا تھا آہ یہ وہ مقام ہے جہاں رشید نے نفس کو اور اس کے ساتھ دنیا کو بھی فریب دینے کے لئے ٹکٹ لگا کر قفقے لگائے ہیں جہاں آغا عبدالرحیم نے سلسلہ کی بے معنی رٹ لگا کر یارانِ طریقت کے تسخیر کا سامان ہم پہنچایا ہے جہاں رتوف نے فلسفہ حیات سے ناواقف ہونے کے باوجود حقائقِ حیات پر بصیرت افروز تقریریں کی ہیں جہاں عظیم جیسے محروم جذباتِ لطیفہ انسان نے بھی تیس دفرا د کی پیروسی کے عہد باندھے ہیں اور جہاں اُس طرف نہ تاشا شخص اقبال نے اپنی عبوسرت و فرسودگی کے باوجود یارانِ طریقت کی یورش سے مجبور ہو کر ہنگامہ آرائی کی ہے۔ آہ یہ وہ مکان ہے جہاں ہر شست میں مصائبِ حیات کا روزنارو یا جاتا تھا جہاں ہر مجلس میں داوِ عشرت دینے کے باوجود زندگی کی تکالیف پر نوحہ خوانی کی جاتی تھی حقیقت یہ ہے کہ

واں سے بھل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب

اسودگی کی جانِ سدری انجمن میں تھی

سعدی شیرازی نے اندامِ بغداد پر مرثیہ لکھا، دولتِ غرناطہ کی تباہی پر ابنِ مقلدون نے تو

خوانی کی۔ دہلی کے اڑبھانے پر داغ لکھوانا سنبھائے۔ اقبال نے دوران سفر میں سسلی کو دیکھ کر
چٹخیں ماریں لیکن اتھو آہ اتھو کی بربادی پر میرے درمندانہ قلم کو خوشحکامی کرنی پڑی ہے

مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا

یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا

گذری ہوئی صحبتوں کی یاد نازہ کرنے کے لئے گوالمنڈی کا نمبر ۲۵ ابھی موجود ہے یونٹنگ ہال کا کمرہ
نمبر ابھی باقی ہے، ریوے روڈ پر فیروز پور لاج بھی کھڑی ہے گویا ع

عالم میں ٹکڑے ٹکڑے میری داستاں کے ہیں

مگر اتھو کہ جو خصوصیت حاصل تھی وہ جی کا حصہ بھی کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ یاران طریقت کا انتشار
اقرار ختم ہو گیا ابھی آسمان کے ترکش میں کوئی تیراقتی ہے جس کی پذیرائی کئے گئے ہیں دل و مگر پیش کرنے
پڑیں کیا اتھو کا اندام ایسا واقعہ نہیں کہ یاران طریقت، ایک مرتبہ ہی سہی، باہم مل کر دل کے پھپھو لے
پھوڑ لیں؟ اگر اس حادثہ ناجعہ سے بھی ہمارے سکوت بے جا میں کوئی تحریک پیدا نہ ہوا تو ہمیں آج ہی اپنی
نامنہ ٹرہ لینے چاہئے کیونکہ دانا وہی ہے جو ہوا کا رخ پچانے۔

نیا زائین عاشق

محبت

محبت ایک پاک جذبہ ہے جو ہر تنفس کے دل میں خدا کی خاص ودیعت ہے۔

محبت کو محیب اور محبوب سے ایسا تعلق ہے جیسے تلگے کو موتیوں سے۔

محبت ایک انہی سلطنت کے قلم سے زیادہ طاقتور ہے جس کی ایک جنبش کسی دیرینہ کو آباد اور کسی آبادی کو برباد کر دینے کیلئے کافی

محبت دودلوں کے دھیان ایک واسطہ ہے شیشہ سے زیادہ نازک اور لوہے کی کڑیوں سے زیادہ مضبوط۔

محبت کا امتحان ہر وقت، ہر گھڑی، ہر آن ہوتا ہے۔

محبت ہوتی ہے کی نہیں جاتی۔

محبت ایک شیش بجاوہر ہے جو باوجود دپاس رہنے کے ہر وقت دستیاب نہیں ہوتا۔

محبت کی مستحق وہی ذات لازوال ہے جس نے محبت کو پیدا کیا اور جس نے سب سے پہلے انسان سے محبت کی۔

محبت تکمیل انسانیت ہے۔

عبدالاحد شرف الدین پوری

(ترجمہ)

لُلو کی فتح

سوفیا نے نگاہیں اپنے کام سے نہ اٹھائیں اور اُس کی نازک انگلیاں باریک میس پر بدستور اڑتی چلی گئیں۔ لیکن لولو کمرے میں گھوم رہی تھی۔ کبھی وہ طاقتوں میں پڑی ہوئی چیزوں کو ادھر ادھر سرکاتی، اور کبھی کوئی دراز کھول کر بلا ضرورت اس میں جھانکنے لگتی۔ یہ ظاہر تھا کہ وہ یا تو کچھ کرنا چاہتی ہے یا کچھ کہنا، لیکن اپنی ہن کے سنجیدہ انداز کو دیکھ کر ہچکچاتی ہے۔ اُس نے ایک گیت گنگنا نا شروع کیا ایک شعر بلند آواز سے پڑھا لیکن سوفیا تو گویا سن ہی نہیں رہی تھی۔ اب لولو نے جسے فطرت سے صبر کا کچھ زیادہ حصہ نہیں ملا تھا بے باکانہ سوال کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی ہن کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اُس نے کہا:-

”سوفیا، تمہیں معلوم ہے مادامیزل ژانٹ نے مجھ سے کیا کہا ہے؟“

”یقیناً کوئی بڑی دلچسپ بات نہیں ہوگی۔“

”اب یہ ایک ایسا خشک اور سرد جواب ہے کہ انسان کو گرمی کے موسم میں بھی شل کر دینے کے لئے کافی ہے! برفانی آپا، تم یہ سرد مہری کہاں سے لاتی ہو؟“

”لولو تم سچ سچ ایک بچی ہو!“

”میرے دل کی ملکہ، اسی معاملہ میں تم غلطی پر ہو۔ میں بچی نہیں ہوں، کیونکہ اب میری شادی ہونے والی ہے۔“

”کیسی؟“

”اور یہی بات تھی جو ژانٹ نے مجھ سے کہی۔“

”کیسی عمل باتیں کرتی ہو! میں تو خاک بھی نہیں سمجھی کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“

”بہت اچھا، اب میں تمہیں ایک ڈرامے کی شکل میں ساری بات سناتی ہوں۔ یہ ایک تیاری ہے۔“

لیکن کیا تمہاری سنجیدہ مائی اپنی پوری توجہ منعطف فرمائے گی؟

”ہاں، ہاں، مگر جلد ہی کرو۔“

”وقت گھوڑ دوڑ کا دن۔ جگہ: زحل کا میدان۔ تم وہاں نہیں تھیں۔ تم اپنی جاودانی، کتا بوں میں منہمک تھیں۔“

”اگر تم موضوع سے اس قدر دُور جانے لگیں تو بس، میں نہیں سنوں گی۔“
 ”سو فی خدا کے لئے سنو۔ یہ راز مجھے ہکان کئے دیتا ہے، مجھے مارے ڈالتا ہے۔“
 ”کیا تم پھر شروع کر رہی ہو؟“

”ہاں، اب میں ٹھیک سناؤں گی۔ اچھا، نو گھوڑ دوڑ کے دن ہم سب سے اگلی قطار میں بیٹھے، مجھے تھے۔ پاؤ لوو ڈیو آیا اور اُس نے رابرٹو مانٹی فرینکو نامی ایک وجیہ نوجوان سے ہمارا تعارف کرایا۔ رسمی تسلیم و تعظیم کے بعد وہ دونوں ہمارے بالکل پیچھے بیٹھ گئے۔ دوڑ شروع ہونے سے پہلے ہم نے آپس میں مختصر سی گفتگو کی تمہیں معلوم ہے میں گارگن کے حق میں تھی، حالانکہ میں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ دو بڑی حق ناشناس ہے اور سچ تو یہ ہے کہ انسان کو حق ناشناس حیوانوں سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔ گرد و غبار کے ایک بادل نے گھوڑوں کو بالکل چھپا دیا۔ میں نے کہا، ”گارگن جیت گئی۔“ مانٹی فرینکو مسکراتے ہوئے بولا، ”نہیں، لاڈلو دیو! اُس کی تردید پر مجھے بڑا غصہ آیا، لیکن وہ مسکرتا رہا اور تردید کرتا گیا؛ یہاں تک کہ ہم نے شرط لگائی۔ کوئی آدھ گھنٹے کی پریشانی اور دھڑکنے کے بعد آخر مجھے معلوم ہوا کہ گارگن دھوکا دے گئی۔ کہ میں ہار گئی اور مانٹی فرینکو جیت گیا۔ میں کس دہم میں تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں شرط کار دیہ ابھی ادا کرتی ہوں، لیکن اُس نے کہا ”آپ کی نوازش ہے ابھی اس کے لئے بہت وقت پڑا ہے۔ جب دوسری مرتبہ وہ مجھ سے ملا تو میں نے اُس پر ایک مستفسرانہ نگاہ ڈالی اور وہ ایک عجیب پُراسرار انداز میں جھکتے اور مسکراتے ہوئے خاموش رہا۔ غرض کہ نتیجہ یہ ہوا کوئی اور جگہ اس کا یہی طرز عمل تھا۔ مجھے بڑی حیرانی لاحق ہوئی۔ رابرٹو خوبصورت ہے۔ اُس کی عمر چھبیس سال ہے اور آج صبح اُس کا باب جو میرا خسر ہونے والا ہے تقریباً دو گھنٹے تک تنہائی میں اماں سے باتیں کرتا رہا۔“

”اچھا!“

”ادھو، حاضرین توجہ فرما رہے ہیں؟ ہاں، تو مجھے اُس کے آنے کی خبر ثنات سے معلوم ہوئی۔ چنانچہ شادی کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ صرف ایک ذرا سی بات کا فیصلہ باقی ہے کہ مجھے میری بلد کے دفتر میں کب جانا ہے، اور میرے گون کارنگ آسمانی ہو یا سفید؟ اور میں طرہ دار ٹوپی پنزن یاد دوسری؟“
 ”تم تو بھاگی جاتی ہو!“

”بھاگی؟ کیوں، تم ہی بناؤ رکھنے کی کونسی بات ہے؟ رابرٹو اور میں ایک دوسرے سے بے حد محبت

کریں گے۔ ہمارے والدین مطمئن ہیں کہ ———

”اور یوں تم ایک شخص سے شادی کر لو گی؟“

”یوں کے کیا معنی؟ یہ تو ذرا وسیع المعنی سالفظ ہے“

”یعنی اُس کو جانے بغیر، اُس سے محبت کئے بغیر؟“

”لیکن میں تو اُس کو جانتی ہوں میں اُسے گھوڑ دوڑ کے موقع پر اور اس کے بھگرنی بار سیر میں ملی ہوں میں اُس سے محبت کرتی ہوں اسوں اسی لئے مجھ سے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا گیا کہ میں اس کے دیدار سے محروم رہی اور خود کشی کی کوشش میں کھانے کے بجائے کافی کی تین پیالیاں پی گئی“

”اور وہ؟“

”وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس لئے ظاہر ہے کہ مجھ سے محبت کرتا ہے!“ لولو نے یہ بات ایک فاسقانہ انداز میں کہی لیکن اُس نے دیکھا کہ سوفیا کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ اُسے اپنی اس بے باکانہ طرز گفتگو پر سخت مذمت ہوئی اور بہن پر جھپکتے ہوئے اس نے پیار کے لہجے میں کہا :

”کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے؟“

”نہیں بہن، نہیں، تم ٹھیک کہتی ہو جب کوئی محبت کرتا ہے تو وہ شادی ہی کرتا ہے۔ محبت کو بیدار کرنا مشکل ہے۔ یہ کہہ کر سوفیا نے زیر لب ایک آہ کی۔

لولو نے ذرا برا فر دختہ ہو کر کہا ”محبت کو بیدار کرنا، محبت کو بیدار کرنا! سوفیا، بہت آسان ہے۔ لیکن تمہاری طرح جب کسی کے ماتھے پر شکن ہوں، آنکھیں اُداس ہوں، ہونٹ بے بسم ہوں، جب کوئی ایک کونے میں دبک کر سوچنا شروع کر دے حالانکہ ساری دنیا تفریح و تفرغ میں مشغول ہو، جب کوئی ہنسنے کیلئے اور مسرتوں کے خواب دیکھنے کی بجائے کتابوں میں سرماتا پھرے! اور جب کوئی جوانی ہی میں بوڑھا بن بیٹھے اور اپنے دل میں تفکرات کی پرورش شروع کر دے تو اُس سے محبت کرنا واقعی مشکل ہو جاتا ہے۔“

سوفیا نے اپنا سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کے ہونٹوں میں ایک نحیف سی لرزش پیدا ہوئی جیسے وہ ایک سبکی کو ضبط کر رہی تھی۔

لولو نے پوچھا کیا میں نے سہرتیں رنج پہنچایا ہے؟ یہ میں نے اس لئے کہا تاکہ دیکھوں کہ تم سے بھی کسی کو پیار ہے، دیکھوں کہ ہر طرف سے تمہیں محبت گھیرے ہوئے ہے۔ دیکھوں کہ تم دلن بنی ہوئی ہو ———

آہ، کیا ہی اچھا ہو کہ ہم دونوں کی شادی ایک ہی دن ہو جائے!“

”لولو تم بھولے پن کی باتیں کرتی ہو، میں ہمیشہ تمہارا ہوں گی۔“

میری جان نہیں، ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ تمہارا یہ خیال نہایت ظالمانہ ہے۔ اگر رابرٹو ایک محبوب انسان ہے تو ممکن ہے اُس کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہو کم از کم میری یہ آرزو ہے!“

اُسی وقت اُن کی ماں سیرکلباس پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔ لوہو نے پوچھا: ”اماں تم کہیں باہر جا رہی ہو؟“

”ماں بیٹی میں وکیل کے ہاں جا رہی ہوں۔“

”اوہ او وکیل کے ہاں۔ اماں تمہیں تو ہر وقت کاروبار کی چُسی رہتی ہے۔“

”بیٹی تمہیں اس کاروبار کے متعلق جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ سو فیاض تمھوڑی دیر کے لئے یہ سہرا ساتھ آؤ۔“

”اور کیا سو فیاض کو بھی وکیل کے ساتھ کوئی بڑا ضروری کام ہے؟“

”لو، تم متانت کب سیکھو گی؟“

”بہت جلد، اماں، تم دیکھ لو گی۔“

اس نے اپنی ماں اور بہن کے گزرنے کے لئے دروازہ کھول دیا، اور جھک کر نہایت ادب سے کہا: ”دام اباد! منیر!“ جب وہ کمرے سے نکل گئیں تو دہلیز میں کھڑے ہو کر اس نے ایک تھقہ لگایا اور کہا: ”تم پمپ چمپ کر باتیں کر دو۔ میں یہ سمجھوں گی کہ مجھے کچھ علم نہیں۔“

رابرٹو مانتی فرینکو کو غور و فکر کی عادت نہ تھی، غور و فکر کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ اُس کے دن دعوتوں، ملاقاتوں اور تفریحی اشغال میں صرف ہو جانے اور شاہیں لوگو کی خوشگوار رعیت میں گزر جاتیں۔ اسی کے ساتھ بعض غیر دلچسپ فرائض کی طرف بھی اسے توجہ نہ دینی پڑتی۔ مثلاً وکیل سے گفتگو، معاہدوں کی تکمیل، بعض پرانے قرضوں کا تصفیہ، پھر ان کے علاوہ گھر باری ترتیب اور شادی کے سفر کی تیاریاں۔ اُسے مشکل آدھ گھنٹہ مطالعہ کے لئے اور پندرہ منٹ اپنے کافے کے دروازے پر بیٹھنے کے لئے شتے سوراہو کو کبھی کسی نے گھری سوچ میں پڑے ہوئے نہیں دیکھا، نہ اُسے کسی نے کسی معاشرتی مسئلہ کو حل کرنے میں مصروف پایا۔ اُس کی فطرت نہ غم سے مایوس تھی نہ شہرت کی آرزو مند، بلکہ ایسی چیزوں سے بہت بالاتر تھی اور بہت سوں کے لئے قابلِ شگ۔ لیکن آج وہ ماٹھ میں لیک کتاب لئے آرام کر رہی ہیں کچھ اس انداز سے لیٹا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اس نے پڑھنے کا چمٹہ ارادہ کر رکھا ہے۔ مکتاب بھی دلچسپ تھی لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ بالکل کھویا کھویا سا نظر آتا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی حالت کچھ اس سے بھی بُری تھی۔ اُس پر ایک کیفیتِ اضطراب اور اضطرابِ طاری تھی۔ کتنی ہی دیر گزرتی مگر اس نے کوئی ورق نہ الٹا، کیونکہ وہ وہی سطر میں پڑھنے کے بعد اُسے الفاظ اپنی

جھک چھوڑتے، رخص کرتے، درہم برہم ہوتے اور غائب ہو جاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ایسی بے افتیاری کے عالم میں رابرٹ نے خیالات کی ایک نامعلوم سرزمین کا سفر کر لیا۔

’آبا سٹین‘ ہیں، اخلاؤں نے مجھے دعا لکھ بھیجی ہے، میری عمر نادہینیں ناراض ہیں، میرے کانے کے دوست مجھے طعنے پیرائے میں مبارک باد دیتے ہیں، میرے بچے دوست خوش ہو کر میرے ہاتھ کو دباتے ہیں۔ اس نے معلوم ہوتا ہے کہ میرے لئے یہ شادی اچھی ہے۔ میں انکار نہیں کر سکتا۔ لولہ نہایت خوبصورت ہے۔ جب وہ اپنی شہرہ سمجھیں مجھ پر گڑبگڑ دیتی ہے اور جب وہ ہنستی ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے سفید دانت نظر آنے لگتے ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے ٹخنے سے خوبصورت سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لوں اور پے در پے چومتا ہی جاؤں اور اس کی طبیعت بھی کتنی اچھی ہے کیسی زیریں سیرت کی وہ مالک ہے! ہر وقت مسرور، ہر وقت خوش ہنسی مذاق کے لئے تیار، زندہ دل، شوخی اور شرارت سے بھری ہوئی، کبھی اداس نہ ہونے والی۔ ہم دونوں کی خوب گزرے گی۔ زیادہ متانت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی، خصوصاً اُن لوگوں میں جن سے مجھے محبت ہو مجھے ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو کوئی معلوم روگ ہے۔ روگ جس سر میں نادانف ہوں، جس کا مداد ا مجھ سے نہیں ہو سکتا، یا جس کا باؤٹ نادانستہ طور پر میں خود ہوں۔ لولہ کی بہن سو فیواہی کو لے بیٹھے، میری طبیعت اُس کی شانیت اور بے حسی کو دیکھ کر گھبرانے لگتی ہے۔ جب کبھی وہ سننے آتی ہے میری ساری تنگننگی مفقود ہو جاتی ہے اور کسکراہٹ کا نشان تک میرے ہنٹوں پر باقی نہیں رہتا۔ اور خواہ ہمار کی شہانی دھوپ ہی کیوں نہ نکل رہی ہو میرے لئے خزاں کا برزخانی منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ اُس وقت مجھ میں اتنی جرات بھی باقی نہیں رہتی کہ لولہ سے مذاق کے طور پر ہی کہوں کہ سو فیواہی شانیت نے ہماری ساری مسرت کو ٹوٹ لیا۔ میرے چہرے سے وہ اپنے ناخوش گوارا اثرات مطالعہ کر چکی ہوگی، کیونکہ جب وہ مجھ سے باتیں کرتی ہے تو میری طرف دیکھتی نہیں۔ مجھ سے مصافحہ نہیں کرتی اور میرے سوالات کا جواب کم از کم الفاظ میں دیتی ہے۔ وہ سمجھ گھٹی ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا۔ شاید وہ میری موجودگی میں بیزار رہتی ہے۔

لولہ ہمیشہ ہنستی رہتی ہے۔ وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اُس نے کبھی کوئی سنجیدہ بات مجھ سے نہیں کی اور اگر کبھی وہ کرنا بھی چاہتی ہے تو ہمیشہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ تکلف برطرف مجھے اُس سے کوئی اندھی محبت نہیں ہے، اور یہ بہتر ہے۔ ادھر میرا یہ حال ہے کہ میں نے دو نظریے اپنے دل میں مستقل طور پر قائم کر لئے ہیں۔ اول تو یہ کہ میاں بیوی کی طبیعتیں آپس میں ملنی چاہئیں، دوسرے یہ کہ محبت کو از خود رنگی کے ساتھ شروع نہ کیا جائے۔ ہم دونوں کی یہی حالت ہے، اس لئے لولہ کی اور میری شادی نہایت خوشگوار ثابت ہوگی۔ شادی کے بعد ہم اُلی کے چپے چپے کی سیر کریں گے، ہمیں کسی قسم کی جلدی نہ ہوگی، جہاں جی چاہے گا ٹھہر

جائیں گے، ہر مقام کو دیکھیں گے، ہر چیز سے لطف اٹھائیں گے۔ بہم بین مینے اسی طرح سیر و تفریح میں گزار دیں گے، نہیں، مگر تین مینے کافی نہ ہوں گے بلکہ چار مینے، میں لو کوکوسنیا کی غم انگیز صحبت سے ایک خاموشی تک دور رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں، اس لڑکی کو اس عمر میں اتنی متانت بجتی ہے وہ تیس برس کی ہوگی۔ وہ کچھ بد صورت بھی نہیں۔ اُس کی آنکھیں نہایت خوبصورت ہیں، اور وضع قطع سے وہ ایک ملکہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ ذرا خوش اخلاق بھی ہوتی تو اُس سے مل کر طبیعت کتنی خوش ہوتی۔ میں دعوے سے کہتا ہوں وہ تمام عمر ہی تنہا رہے گی۔ شاید اسے کوئی پوشیدہ غم ہے، شاید کوئی بھرت کا معاملہ ہے، ناکام محبت کا۔ میں کہہ کی اس سنجیدگی کی وجہ ضرور معلوم کروں گا۔ کبھی تنہائی میں لولو سے اس کے متعلق ضرور پوچھوں گا۔

"لو کوکنا نڈک کھلونوں کی بہت شائق ہے، اس نے یہ بات مجھے اُسی دن بتادی تھی جب میں دوسری دفعہ اُن کے گھر گیا تھا۔ وہ ان کو کس مسرت سے کھاتی ہے، اس طرح وہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں کے درمیان غائب ہوتے چلے جاتے ہیں، اور کچھ دیر کے بعد جب وہ ختم ہو جاتے ہیں تو وہ کس طرح جھوٹا موٹ منہ بسورنے لگتی ہے۔ وہ وہ کتنی پیاری لڑکی ہے، پیاری، پیاری، پیاری! ایک دن کس طرح دبی ہوئی سی آوازیں وہ مجھے بتا رہی تھی کہ جب بادل گر جاتے تو میں اُڑ جاتی ہوں اور اپنا منہ نیکیوں کے نیچے چھپا لیتی ہوں، پھر کتنی تہی بڑی دیر سے میری خواہش ہے کہ میرے پاس ایک بہت لمبا سیاہ مٹل گاؤن ہو جس کے گریبان اور آستینوں پر سفید جھار لگی ہوئی ہو۔ ایک دفعہ کہنے لگی کہ میں اپنے دل میں نہایت شدید رشک رقابت پیدا کر دیں گی۔ اور میں ایک جھوٹا منہ خنجر خریدوں گی جس کے دتے میں سونا لگا ہوا ہو گا۔ اور اُس کے ساتھ میں انتقام لوں گی جب بچوں کی طرح ایک فیصد کنڈ انداز میں وہ ایسی بے نیکی باتیں کرتی ہے تو کیسی جلی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر بعض اوقات سو فیذا بھی ہنسنے پر مجبور ہو جاتی ہے، اور اُس کا چہرہ بھی روشن ہو جاتا ہے۔ سو فیذا وہ سو فیذا جس کو لولو کی اصیلت کبھی معلوم نہ ہو سکے گی۔"

کتاب اُس کے ہاتھ سے فرش پر گر پڑی، مگر نے کی آواز سن کر وہ چونک پڑا اور جان ہو کر اس طرح اُدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے وہ اپنے آپ کو پہچاننے کے ناقابل ہو۔ یہ حقیقت میں وہی تھا، رابرٹو مانٹی فرینکو، جو تصورات میں کھو گیا تھا۔

شام ایک تیرہ فام بادل کی طرح چھائے جا رہی تھی، سو فیذا بالانائے کی کھڑکی میں کھڑی پُر شور بازار میں ہجوم کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ یہ ایسا ذقت حجاب وایا ٹو لہڈ و گزرنے والوں کے لئے ذرا دشوار ہو جاتا ہے، کیونکہ چھوٹی بڑی گاٹیاں اُس وقت اس طرح چلنے لگتی ہیں جیسے ایک دریا بہہ رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہو، یکایک اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا، اس نے اپنے سر کو ذرا سا جھکایا، پھر اس کے منہ پر زردی

چھاگئی اور وہ پلٹ کر کمرے میں آگئی۔ ایک مڑٹ کے بعد لولو دروازہ لڑکوں کو بجائی، کرسیوں کو الٹ پلٹ کرتی جلد جلد اندر داخل ہوئی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو، ڈانا سوفیا سیزٹ انجیلو؟ پڑھ رہی ہو؟“

”ہاں میں پڑھ رہی تھی۔“

”اور کھر کی تک آنے کی تم نے تکلیف گوارا نہیں فرمائی؟“

”اور اگر میں فرماتی؟“

”چلو چھوڑو! البسینا میرا نیا گون لے کر آئی ہوئی تھی۔ اس لئے مجھے اوپر پہننے کی مجبوری تھی، درندہ میں

سچ کہتی ہوں اس تمام عرصے میں بے صبری سے میں کانپتی رہی کیونکہ میں یہاں موجود رہنا چاہتی تھی کھل شام میں نے رابرٹو سے کہا تھا کہ اپنا سیاہ اور کوٹ پہننا، اور سیلام کو گاڑی کے آگے جوت کر سارے

چھ بجے یہاں سے گزرنا اب کیا معلوم ہے کہ اس نے میری بات مانی بھی یا نہیں!“

”رابرٹو اپنی گاڑی میں یہاں سے گزرا تھا اور وہ سیاہ اور کوٹ پہنے ہوئے تھا،

شاباش! تم نے یہ کیسے معلوم کیا؟ میرا تو خیال ہے تم پڑھ رہی تھیں؟“

”میں کھر کی میں تھی۔“

”اور تم نے اُس کو پہچان لیا۔ حالانکہ تم کبھی اس کی طرف دیکھتی تک نہیں؟ تعجب ہے! — اُس

نے تم کو سلام کیا تھا؟“

”ہاں۔“

”اُس نے کس طرح اپنی ہیٹ اٹھائی تھی؟“

”جس طرح عام طور پر اٹھایا کرتا ہے۔“

”اور تم بھی جواب میں ضرور جھکی ہوگی؟“

”کیا تم مجھے اتنا ہی بد اخلاق سمجھتی ہو کہ میں نے سلام کا جواب نہ دیا ہوگا؟“

”کم از کم تم نے مسکرا کر تو ضرور جواب دیا ہوگا؟“

”نہیں، مسکرا نا میں نہیں جانتی۔“

”سوفیا تم بڑی ظالم ہو۔ اور کل رابرٹو بھی تمہارے متعلق باتیں کرتا رہا۔“

”کیا کتنا تھا کہ میں بڑی ظالم ہوں۔“

”نہیں، بلکہ وہ تمہاری اس متانت کی وجہ مجھ سے پوچھتا تھا، اور کہتا تھا کہ دونوں بہنوں کے مزاج

میں امتنا فرم کیوں ہے۔ اس پر میں بہت دیر تک تمہاری مدح سرائی کرتی رہی۔ میں نے کہا کہ سو فیہ مجھ سے زیادہ نیک، زیادہ شریف اور زیادہ محبت کرنے والی ہے، اور اُس میں نقص صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی ان صفات کو چھپاتی ہے۔ رابرٹو نہایت دلچسپی سے میری باتیں سنتا رہا، پھر کہنے لگا سو فیہ کو مجھ سے نفرت کیوں ہے؟

”نفرت!“

”ہاں، اُس نے یہی کہا تھا، اور سچ پوچھو تو اُس نے بالکل غلط بھی نہیں کہا، تم اُس کی طرف توجہ ہی بہت کم کرتی ہو لیکن اس معاملے میں بھی میں نے تمہاری حمایت کی۔ میں نے کہا کہ حقیقت میں سو فیہ تمہیں بہت پسند کرتی ہے، اور تمہاری بہت ہی عزت کرتی ہے۔“

”لو!“

”میں جانتی تھی کہ یہ صحیح نہیں۔ لیکن یہ میں نے اس لئے کہا کہ رابرٹو تمہیں بہت ہی اچھا سمجھتا ہے سو فیہ کیا یہ بات انصاف سے بعید نہیں کہ تم اُس سے ایک اجنبی کا سا سلوک کر دو؟“

سو فیہ نے اپنی باہیں اپنی ہن کے گلے میں ڈال دیں اور اس کا منہ چوم لیا۔ لو نے ایک لمحے کے بعد شفت آئینہ مجھے میں کہا:

”کیا تم رابرٹو سے تھوڑی سی محبت نہیں کر سکتیں؟“

سو فیہ کوئی لفظ منہ سے نکالے بغیر یک بیک پیچھے ہٹ گئی۔

لو نے اپنے کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے گفتگو کا موضوع بدل کر کہا ”اچھا یہ تو بتاؤ، آج شام

کو تم ہمارے ساتھ چلو گی یا نہیں؟“

”نہیں، مجھے تو سب سے درہم تم آؤں کے ساتھ چلی جانا۔“

”حرب معمول ہے میں بھی حرب معمول چلی جاؤں گی، کیونکہ وقت خوب گزرے گا۔“

”کیا رابرٹو تمہارے ساتھ جا رہا ہے؟“

”نہیں، وہ کلب جا رہا ہے جہاں آج ڈانکر ٹرول کا جلسہ ہونے والا ہے۔ میں اُس کی غیر حاضری سے

نافذہ اٹھا کر ڈبلیون کی رقص نگاہ میں جا رہی ہوں، اور صبح تک دیں رہوں گی۔“

”اور اگر اُسے معلوم ہو گیا؟“

”تو بہت اچھی بات ہے۔ وہ ابھی سے مجھے آزادی دینا کیجئے گا، میں اُسے کوئی بُری عادت ڈالتا نہیں

چاہتی۔“

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اُس سے بہت تھوڑی محبت ہے۔“

بہت زیادہ مگر اپنے طریق پر۔ اچھا اب مجھے کپڑے پہننے کے لئے جلدی کرنی چاہئے۔ اس میں مجھے کم از کم دو گھنٹے لگ جائیں گے۔“

سوفیا کھڑی اُس گاڑی کے پیوں کی گڑگڑاہٹ سن رہی تھی جو اُس کی ماں اور بہن کو راتھ گاہ کی طرف لے جا رہی تھی۔ وہ اکیلی رہ گئی، بالکل اکیلی، جیسا کہ وہ ہمیشہ رہا کرتی تھی۔ بچپن میں جب اُس سے کوئی سختی یا انصافی کا سلوک کیا جاتا تھا تو وہ اپنے بستر میں چھپ کر آہستہ آہستہ رویا کرتی تھی۔ اُس کی یہ عادت اب تک نہ گئی تھی۔ اپنے وسیع ڈرائنگ روم میں جو بجلی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا اب وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ بے حس و حرکت تھے۔ اس کا سر کرسی کی پشت پر گرنا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر سخت غم چھا رہا تھا جس کے کسی زبردست اندرونی کشمکش کا اظہار ہوتا تھا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس کا بل تنہائی کے وقت میں ایک غم عظیم کا احساس اُس پر چھا گیا تھا۔ وہ حقیقت جس کا اُس نے مدتوں انکار کیا تھا صاف، صریح اور غریباں ہو کر اس کی نظروں کے سامنے آ رہی تھی۔

کسی کے ہاتھوں کی آہٹ سن کر وہ چونک پڑی۔ یہ رابرٹو تھا۔ سوفیا کو اکیلا پاکر وہ ذرا ہچکچایا اور رک گیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ گھر کے دوسرے لوگ کسی اور کمرے میں ہونگے وہ آگے بڑھا۔ سوفیا غمبہرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”شام بخیر، سوفیا“

”شام بخیر“

دونوں پر اضطراب طاری تھا۔

”رابرٹو نے اپنے دل میں کہا ”یا آہی، یہ سوفیا کیسی عجیب لڑکی ہے!“

اس اثنا میں سوفیا نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اس کے چہرے پر اب اضطراب کے آثار نمایاں نہ تھے۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔

”تمہاری اماں اچھی ہیں؟“

”ہاں، اچھی ہیں۔“

”اور لولو؟“

”وہ بھی بہت اچھی ہے۔“

اس کے بعد دونوں پر خاموشی چھا گئی۔ رابرٹو نے مسرت کی ایک عجیب کیفیت محسوس کی جس میں کچھ تلخی بھی ملی ہوئی تھی۔

اُس نے پوچھا کیا لوبو معروف ہے؟

سوفیا کے جسم میں بے چینی سے ایک ہلکی سی جنبش ہوئی۔

اس نے جلدی سے گویا مزید سوالات کو مد نظر رکھتے ہوئے جواب دیا "وہ اماں کے ساتھ ڈیلیوکی

رقص نگاہ میں گھٹی ہے۔"

اب چونکہ سوفیا اکیلی تھی اس لئے رابرٹ نے ازراہ اخلاق کچھ دیر اُس کے پاس ٹھہرنے اور باتیں کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن اس خیال کے آتے ہی اُس کے دل میں وہاں سے بھاگ جانے کی ایک ناقابلِ ضبط خواہش پیدا ہو گئی۔ لیکن وہ بیٹھا رہا۔ آخر اُس نے اپنی اس بے وقوف آمد کی معذرت کے طور پر کہا "میں اس لئے آگیا کہ کلب میں ڈانسر گروں کی تعداد ضرورت سے کم تھی۔"

"لوگو کو تنہا رہنے کی امید نہ تھی، اس لئے وہ چلی گئی، ورنہ ———"

رابرٹ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "کوئی مذاقہ نہیں؟"

لیکن یہ وہ اتنی جلدی کہہ گیا کہ محض ایک رسمی سی بات معلوم ہوئی، اور لوبو کی غیر حاضری کو اس سے کوئی تقویت نہ پہنچ سکی۔

"اور تم نہیں گئیں؟"

"نہیں، میں نہیں گئی۔ مجھے رقص وغیرہ سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔"

"تم کتابیں پڑھتے رہنے، ترجیح دیتی ہو؟"

"ہاں بہت زیادہ۔"

"لیکن اس سے تمہاری صحت پر تو اثر نہ پڑے گا؟"

"صحت پر کیا اثر پڑے گا، میری آنکھیں بہت اچھی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے سوفیا نے اپنی آنکھیں

اٹھا کر رابرٹ کی طرف دیکھا۔

رابرٹ کو کے دل میں خیال آیا "کتنی خوبصورت آنکھیں ہیں، لیکن کیفیت سے خالی ہیں۔" پھر اُس نے

کہا "میرا مطلب ہے ———"

"غالباً اخلاقی نقصان۔ میرا یہ خیال نہیں جو کتابیں ہیں پڑھتی ہوں، اُن سے مجھے سکون قلب

حاصل ہوتا ہے؟"

"کیا تمہیں سکون قلب کی ضرورت ہے؟"

"ہر شخص کو سکون قلب کی ضرورت ہے۔"

سوفیا کی آواز میں متانت اور سنجیدگی تھی۔ رابرٹ کو اس میں طغ آرہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس آواز کو پہلی مرتبہ سن رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی عورت کے ٹوہرہ دپاتا تھا جس سے وہ اب تک ناواقف تھا، اور جو اب اپنی ہر حرکت اور ہر لفظ سے اُس پر شکست ہو رہی تھی۔ سوفیا کی بے پردائی اور سر درمزا جی بھی رخصت ہو چکی تھی۔ وہ اب اُس کی طرف دیکھ کر اُدھر اُدھر ہنسنے لگی تھی۔ دوست کی طرح باتیں کرتی تھی۔ اب تک اُن کے درمیان کوئی ناہارہہ معاملہ تھا؟ اور اب کیا ہونے والا تھا؟

رابرٹ نے کہا جب مجھے کوئی کتاب پسند آتی ہے تو پھر ضرور مجھے اُس کے مصنف یا مصنفہ سے واقفیت حاصل کرنے کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے، کہ آیا وہ اچھے لوگ تھے اور آیا انہوں نے خود بھی تکلیفیں اٹھائی ہیں اور محبت کی ہے۔

لیکن یہ معلوم کرنا شاید سخت مشکل ہے۔ مصنفین اپنی محبت کبھی بیان نہیں کرتے، ہمیشہ دوسروں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔

”غالباً غرت کے خیال سے؟“

”نہیں، رشک کے خیال سے۔ کیونکہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ محبت کرنے والوں نے محبت کو پتہ درج میں ایک گنج مخفی کی طرح چھپائے رکھا ہے۔“

ان الفاظ کو ادا کرنے وقت سوفیا کی آواز میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ اُس کے ہمرے پر ایک آزادانہ کیفیت تھی، اور اُس کا لہجہ اس قدر سادہ، اس قدر پاکیزہ اور اس قدر دلنشین تھا کہ رابرٹ نے اسے محبت پر اس یقین کے ساتھ بحث کرتے ہوئے دیکھ کر کوئی تعجب محسوس نہ کیا۔ اب اُسے کسی بات پر تعجب نہ ہوتا تھا۔ اُسے ہر بات قدرتی اور متوقع معلوم ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ آج کی شام بھی جو تنہا اس عجیب لڑکی کے ساتھ گزری تھی آج ایک معتدل اور منتظر سے معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ جدا ہونے لگے تو انہوں نے کچھ اس طرح ایک دوسرے کی طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا جیسے وہ یقین کر لینا چاہتے ہیں کہ جب وہ پھر ملیں گے تو ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ سوفیا نے اپنا ہاتھ بڑھایا، رابرٹ نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس پر ہنسا گیا۔ وہ چلا گیا اور دروازے کا پردہ آنکھ جھپکتے ہیں ان دونوں کے درمیان حائل ہو گیا۔

جب سوفیا کی موجودگی اور گفتگو کا سرٹوٹ گیا تو رابرٹ نے اپنے دماغ میں ایک عجیب سیجان سامسوس کیا۔ وہ مسرور بھی تھا اور مغموم بھی، اُسے موت کی خواہش بھی تھی اور زندگی بھی اُس کے جسم میں رواں دواں تھی وہ نہ جانتا تھا کہ لوگوں کے متعلق اور اپنے متعلق اور اپنے مستقبل کے متعلق کیا خیال کرے۔

سوفیا خوش تھی، نہایت خوش۔ فطرت سے وہ اپنے سر ہانے کے نیچے منہ کو چھپا کر روتی رہی، ابکیاں

لے لے کر زار قطار روتی رہی۔

تین بیٹے گر چکے تھے، لیکن لولو کی شادی اب بھی ملتوی ہوتی چلی جاتی تھی۔ اس کی ماں جس کی سمجھ میں یہ تاخیر کسی طرح بھی نہ آتی تھی، بار بار اپنی لڑکی کو الگ بلا کر اس کی وجہ پوچھتی تھی، لیکن لولو ہمیشہ ہی جواب دیتی تھی کہ ”میں ابھی اور انتظار کرنا چاہتی ہوں۔ میں رابرٹ کو کمزارج سے ابھی اور زیادہ واقف ہونا چاہتی ہوں۔“

دراصل لولو کی طبیعت میں کچھ سوچ پیدا ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس کے اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے میں وہی پہلی سی شوخی موجود تھی اور وہ پہلے ہی کی طرح ہنستی، گاتی اور مذاق کرتی تھی، لیکن اپنی بہن کا مطالعہ کرنے کے لئے رابرٹ کے ایک ایک لفظ کو غور سے سننے کی کوشش میں اکثر اس کی ان مسرت اندوزیوں کا سلسلہ منقطع ہو جایا کرتا تھا سو فیما کے دلدل ہونٹ آپس میں پویت ہوتے تھے۔ دونوں بھویں ملی ہوتی ہوتی تھیں اور اس کے چہرے سے بڑی توجہ ظاہر ہوتی تھی۔

لولو نے اسے اس پاس نگاہ ڈالی۔ اور اس کے اس پاس عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے تھے۔ رابرٹ میں وہ زندہ ملی اور گنگنی باقی نہ رہی تھی جو اس کا خاصہ تھی، بلکہ وہ مکر مند اور مرتد ہو گیا تھا، اور اس کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ وہ باتیں کم کرتا تھا اور کمویا ہوا سا رہتا تھا۔ بہت سی باتوں کی طرف جن سے پہلے اُسے دلچسپی تھی اب وہ بالکل توجہ نہ کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ بڑی کوشش سے اپنے اوپر قابو حاصل کر کے پیکلی طرح زندہ دل بن جایا کرتا تھا، لیکن یہ کیفیت دیر پا نہ ہوتی تھی۔ بناوٹ سے وہ آشنا ہی نہ تھا اس لئے مشکل کامیاب ہوتا تھا۔ اُس کے جذبات اور اس کی روحانی اذیت اُس کی آنکھوں میں صاف نمایاں ہوتے تھے۔

ہالی سو فیما کی جگہ اب ایک اور سو فیما نے لے لی تھی، ایک مضطرب اور بے قرار سو فیما نے، جو کبھی تو محالاً اضطراب میں اپنی بہن سے بنگلیہ ہو جاتی تھی اور کبھی گھٹنوں اُسے شکل تک نہ دکھاتی تھی۔ اُس کے زخماں اکثر تنہا اُٹھتے تھے، ایک آتش مستور سے تنہا اُٹھتے تھے، اس کی آنکھوں میں ایک شعلہ چمکتا ہو نظر آتا تھا، اس کی آواز کبھی گہری اور پُر جذبات ہو جاتی تھی اور کبھی خشک اور درشت، اُس کے ہاتھ لرزتے تھے۔ رات کو اسے نیند نہ آتی تھی لولو اکثر ننگے پاؤں اٹھ کر اس کے دروازے تک جاتی اور کان لگا کر سو فیما کے رونے تملانے کی آواز سُنتی، اگر سو فیما سے اس کی وجہ نہ پتہ کی جاتی تو وہ اٹھ کر دیتی، اور کبھی نہ بتاتی۔

جب رابرٹ اور سو فیما شہتے تھے — اور یہ اتفاق روز ہی ہوتا تھا — تو وہ تبدیلی جو ان میں ہو چکی تھی نمایاں ہو جاتی تھی، بحث مباحثے کر بڑے بات کا جواب ملا توقف دیا جاتا، اور اکثر یہ سم سا ہوتا، بار بار نگاہیں ڈالی جاتیں بعض اوقات گھٹنوں وہ لنگھو نہ کرنے، لیکن ہر ایک دوسرے کی حرکات کا بغور مطالعہ کرتا رہتا، وہ کبھی ایک دوسرے کے قریب نہ بیٹھتے کبھی رابرٹ لولو کسی کسی جیلے سے اس چیرا اُس کتاب کو اٹھ لگتا تھا جس کو سو فیما نے چھوٹا بعض اوقات جب سو فیما کے میں نہ

ہوتی تو رابرٹو کی بے تاب نگاہیں بار بار اس کے بندے کے کی طرف اٹھتا ہیں اور اس حالت میں وہ بالوں کا جواب بھی عجوبے جی سے دیتا تھا بعض اوقات سوفیا کی آنکھ کے پانچ منٹ بعد بھی وہ اپنی ہیٹ اٹھاتا اور چل پڑتا۔ سوفیا کا رنگ نہ ہنر نابلدا تھا اور اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے تھے۔ آخر اس نے تنہائی اختیار کر لی ہر شام وہ اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بند کر بیٹتی اور مٹم کے طوفان کو روکنے کی کوشش کیا کرتی لیکن اسے کسی طرح قرار نہ آتا اور وہ گھنٹوں ٹرپتی تملاتی رہتی۔

ایک شام لولو اس کے کمرے میں آئی، اور کہنے لگی: "کیا تم مجھ پر ایک مہربانی کرو گی؟"

سوفیا نے پوچھا: "کیا؟"

لولو نے کہا: "مجھے کچھ کھانا ہے، اور رابرٹو باہر کیلا کھا رہا ہے۔ کیا تم تھوڑی دیر اس کے پاس ٹھہرو گی؟"

"لیکن میں —"

"تم ہمیں بند رہنا چاہتی ہو؟ کیا نہیں اس قید میں اتنی ہی خوشی حاصل ہوتی ہے جتنی مجھ پر احسان کرنے میں ہو گی؟"

"کیا تم جلد آ جاؤ گی؟"

"مجھے صرف چار سطریں لکھنی ہیں۔"

سوفیا اپنے سارے حوصلے کو مجتمع کر کے دروازے کی طرف مڑی جہاں میں اگر وہ کھڑی ہو گئی۔ رابرٹو ادھر ادھر ٹپل رہا تھا، وہ آگے بڑھی آہستہ آواز میں اس نے کہا: "مجھے لولو نے بھیجا ہے۔"

"تم مجبور ہو کر آئی ہو؟"

"مجبور، نہیں۔"

سوفیا کا سارا جسم کانپ گیا، رابرٹو اس کے بالکل قریب تھا اور اس کا چہرہ جذبات کے جھوم سے بدل رہا تھا۔

"سوفیا میں نے تمہیں کیا کہا ہے؟"

سوفیا نے ڈر کر مختیارانہ انداز میں کہا: "تم نے کچھ نہیں کہا مگر میری طرف اس طرح مت دیکھو۔"

"سوفیا، آہ سوفیا، تمہیں معلوم ہے مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟"

"خاموش، رابرٹو، خدا کے لئے خاموش رہو! اگر لولو اسے تو کیا کہے؟"

"مجھے لولو سے محبت نہیں ہے، سوفیا، مجھے تم سے محبت ہے۔"

"یہ فدا ری ہے۔"

"میں جانتا ہوں یہ فدا ری ہے۔ مگر مجھے تم سے محبت ہے۔ میں کہیں —"

لوہو نے ایک دوسرے دردناک سے آتے ہوئے دُور رہی سے کہا "اچھا، اچھا، تم دونوں نے صلح کر لی؟"

لیکن اس کا کچھ جواب نہ ملا۔ سوچا اپنا منہ اپنے ہاتھوں میں چھپاتی ہوئی بھاگ اٹھی۔ اور رابرٹو بے حس و حرکت اور خاموش یوں کھڑا رہ گیا جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

لوہو بولی "رابرٹو!"

"لوہو۔"

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں! میں جا رہا ہوں۔"

اور لوہو سے اجازت لئے بغیر وہ بھی چلا گیا۔ اُس کے چہرے پر بالواسی چہارہ ہی تھی۔ لوہو خیالات میں گم کھڑی اس کو جاتے ہوئے پیچھے سے دیکھتی رہی۔

لوہو نے آہستہ سے کہا "ایک یہاں بیقرار ہے اور ایک نے ہاں، اور اس سے پہلے کیا حالت تھی! بس! اب مجھے اس معاملے میں دخل دینا چاہئے؟"

آخر لوہو نے اپنی ماں کے کہہ دیا کہ وہ رابرٹو سے شادی نہیں کرے گی، اور اس کے لئے کچھ وجوہ بھی پیش کیں۔

اُس کی ماں نے اپنے سر کو ہلاتے ہوئے جواب دیا "یہ وجوہ بے معنی ہیں میری بیٹی۔"

"تو کیا مجھے آزادی سے صاف صاف طور پر کہہ دینا چاہئے کہ مجھے رابرٹو پسند نہیں ہے اور میں اُس سے شادی نہیں کروں گی؟"

"ہاں یہ جواب کم از کم صاف ہے، لیکن یہ تمہارا دم ہے۔ رابرٹو کو تو تم سے محبت ہے؟"

"وہ اپنے دل کو تسلی دے لے گا۔"

"تم دونوں شادی کا وعدہ کر چکے ہو؟"

"ہم اپنے وعدہ سے واپس لے سکتے ہیں۔ ہمارا زمانہ آزادی کا زمانہ ہے جس میں کسی کو شادی کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔"

"دنیا کیا کہے گی؟"

"اُمّان ہمارا دنیا کی تعریف تو کر دے۔"

"وہی۔"

”اور یہ لوگ صاحب کون ہیں؟ میں تو ان کو نہیں جانتی، اور میں ان لوگ صاحب کے لئے اپنی خوشی کو بھی قربان نہیں کرنا چاہتی؟“

”لو، تم نہایت خوفناک لڑکی ہو! بھلا میں رابرٹ کو سے اب کیا کہوں گی؟“
”جو تم چاہو۔ تم میری ماں کس لئے ہو؟“

”یقیناً میں تمہاری ماں اسی لئے ہوں کہ تم الجھاؤ اور میں سلجھاؤں۔ رابرٹ تو اسے اپنی سخت تنہک سمجھ گیا۔“
”میرا یہ خیال نہیں ہے۔ تم اسے نہایت نرمی اور خوش اسلوبی سے سمجھا سکتی ہو۔ تم اس کے آگے مجھے جتنا برا بھی چاہو کہہ سکتی ہو۔ تم کہہ سکتی ہو کہ لاو نہایت متلون المزاج، غیر متین اور بے وقوف ہے، کہہ دینا کہ وہ نہایت بڑی بیوسی بنے گی، اس میں سنجیدگی نام کو نہیں، اپنے عزت و وقار کا اسے خیال تک نہیں اس کے برعکس اس کی بہن۔“
”بہن؟ لڑو ہوش کی باتیں کرو۔“

”کیوں؟ تم بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتی ہو۔ فی الحال رابرٹ اور سوفیا ایک دوسرے سے بے اعتدالی کرتے ہیں، لیکن اگر وہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو ایک دوسرے کو پسند کریں گے اور لوگ بھی تمہاری تعریف کریں گے کہ تم نے پہلے بڑی لڑکی کی شادی کی۔“
”سچ بھی ہے کہ۔“

”اور میری شادی کیسے رہ جائے گی؟ ابھی میری عمر ہی کیا ہے: اٹھارہ سال۔ ابھی میں آزادی کا لطف اٹھانا چاہتی ہوں، اپنی پیاری اماں کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔“

ماں نے غرطہ محبت سے اپنی بیٹی کو گلے سے لگا لیا اور کہنے لگی: ”لو تم بڑی شریر ہو۔“
”تو گویا ہم نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا؟ اب تم یہ بری خیر رابرٹ کو نہایت نرمی کے ساتھ سنا دینا، اور کہہ دینا کہ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے دوستی ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی اور ہم آپس میں ملے رہیں گے۔ اگر ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہونی ہے تو ہو کر رہے گی، یہ مقدور ہو چکا ہے۔“
”لیکن لو کہ کیا تمہیں یقین ہے کہ معاملات اچھی طرح طے ہو جائیں گے؟ تم جانتی ہو کہ میں لڑائی جھگڑے سے بہت ڈرتی ہوں؟“

”ہاں، ادبے یقینی ماں، میں نہیں اپنے وسیع تجربے کی بنا پر یقین دلاتی ہوں کہ تمہیں قطعاً پریشانی نہ اٹھانی پڑے گی۔ رابرٹ کو ایک شریف انسان ہے، اور وہ محبت کے بغیر مجھ سے شادی کی توقع ہرگز نہ کرے گا۔“

”مگر جو بات مجھے ناممکن نظر آ رہی ہے وہ سوفیا کا معاملہ ہے۔“

لولو نے فلسفیانہ انداز میں کہا ”ناممکن سے زیادہ ممکن اور کوئی چیز نہیں“
 ”بیٹی تم مسلمات کا ایک دفتر وضع کرنے لگ گئیں! اچھا چھوڑیں اب اس بحث کو ہمارے معاملات
 کو شاید اب وقت ہی سلجھا سکے گا۔ لیکن جو حقیقت کبھی بدلنے والی نہیں وہ یہ ہے کہ تم پاگل ہو“
 ”اور نہایت تکلون مزاج“
 ”وقت فیصلہ سے محروم۔“

”اور وہی، اور جو تم چاہو میں وہ بننے کو تیار ہوں، جو تم کہو میں اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتی ہوں
 کہ کچھ اور کہنا چاہتی ہو؟“

”ماں نے بیٹی کا منہ چوم کر کہا ”جاؤ اب سو رہو۔ خدا حافظ۔“

”خدا حافظ، اماں۔ میں تمہاری ممنون ہوں۔“

ماں نے اپنے دل میں کہا ”یہ بہتر ہے۔ واقعی لولو ابھی بہت چھوٹی ہے، ان شادیوں کے رنج و
 نتائج ہر روز ہم دیکھتے ہیں۔ خدا ہمیں ان سے بچائے۔ یہ بہتر ہے۔“

لولو نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا ”اُف! اکتی عیاری مجھے کرنی پڑی ہے، اماں کو قاتل کرنے
 کے لئے کتنا فریب میں نے کیا ہے! کیسی شاندار فتح ہے! محبت کی فتح نہ سی یہ لولو کی فتح ہے!“
 وہ جاتے جاتے اپنی بہن کے کمرے کے پاس کھڑی ہو گئی اور دروازے سے لگ کر سننے لگی۔

بار بار اندر سے دبی ہوئی آہوں کی آوازیں آرہی تھیں غریب سو فیاض اپنا سکون قلب کھو چکی تھی،

لولو نے دروازے کے قفل کو اس طرح چوم لیا جیسے وہ اپنی بہن کی پیشانی کو چوم رہی ہو، پھر زہرا ب کھنے لگی،

”سو جا، سو فیاض، سو جا۔ اپنے دل کو تسکین دے اور آرام کر۔ میں نے آج تیرا کام کر دیا ہے۔“

اور فیاض لولو اپنی پیاری بہن کی راحت کے خیال سے خوش اور مطمئن ہو کر سو گئی۔

وقت، نیک دل دانشمند بڑھے وقت نے اپنا کام کیا۔ لولو نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ بن بیاہی

بہن جو دلس کی سہیلی بہن کبریا کے ساتھ ہوگی آسمانی رنگ کارلشی گون پہنے یا صوفیانہ رنگ کا کوئی سادہ گون

پہن لے۔ اُس نے رابرٹو سے پوچھا کہ آج؟ سے کھانڈ کے کتنے کھلونے ملیں گے؟ اور صوفیا سے کہا کہ کیا وہ

اُسے وہ خوبصورت کرٹھا ہوا رمال دے گی جس کی شکل بادشہم کے ایک جھونکے کی طرح ہے یا ایک ہلکے س

بادل کی طرح۔ رابرٹو اور صوفیا لولو کے طفلانہ خیالات اور اُس کی مسرت آمیز بے پروائی پر ہنسکر ادا تے، اور

ہمیشہ اُس سے محبت کرتے رہے، اور اُسے اپنی قسمت کا چمکتا ہوا ستارہ سمجھتے رہے۔

رابرٹو ماٹھی فریکو نے ایک دوست سے اپنی شادی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا: میں نے ہمیشہ اس

خیال کی تائید کی ہے کہ میاں بیوی کے مذاق میں تخالف ہونا چاہیے۔ انتہا انتہا سے مل جایا کرتی ہے۔ اسی طرح وہ بھی ایک دوسرے کو سمجھ لیں گے، مل جائیں گے۔ ایک کل کی تکمیل کریں گے۔ اس کے برخلاف جن کے مذاق میں مطابقت ہوتی ہے، اُن کی مثال دوستوازی خطوط کی سی ہے جو پہلو پہلو چلتے ہیں۔ لیکن کبھی تمہیں ملتے اور پھر جب مجرت بھی ہو۔۔۔۔۔! میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے۔“

ترجمہ

منصور احمد

یادِ وطن

ہیں بھی یاد کرنا جب بنسیدیں گلیاں گلستاں کی قسم ہو تجھ کو اے صبحِ وطن شامِ غریباں کی
 بہا آئی، اڑا دیں ہجرتیاں پھولوں نے داماں کی خبر لے تو بھی اے رستِ جنوں امیر گریباں کی
 کہیں حسرت کا دفن ہو کہیں تبت ہو ارماں کی ترے عاشق کا دل تصویر ہے گورِ غریباں کی
 ادھر دیکھ او دل مضطر کی حالت پوچھنے والے رقم ماتھے پر ساری استاں ہو دردِ پنہاں کی
 کبھی اک تیر نادانستگی میں دل نے کھایا تھا خلشِ بخت نہیں نکلی جگر سے اس کے پکیاں کی
 وہی ظالمِ قاتل ہے ان محشرِ خرموں میں خناس جو جس کی بُرائی ہے یاربِ خونِ ارماں کی
 نقابِ رخ اٹھا دی جس نے اس کو بھی تو کچھ کہتے یہ مانا نرم میں ساری خطا تھی حشرِ حیراں کی

صدقِ جانی

غزل

تم خوش رہو، گر مجھ کو بھلاتے ہو تو کیا ہے

جنت کو جہنم ہی بناتا تم ہو تو کیا ہے

میرا بھی اُسی میں ہے بھلا جس میں تمہارا

طوفان مرے سر پہ اٹھاتے ہو تو کیا ہے

وہ چشمِ مروت ہی سدا یاد رہے گی!

آنکھیں بھی تم اب مجھ کو دکھاتے ہو تو کیا ہے

پتھر پہ مرا نام کُھدا ہے نہ مٹے گا

تم دل سے اگر مجھ کو بھلاتے ہو تو کیا ہے

جاؤ گے مرے دل سے تو کہنا کہ گئے ہم

پیمانِ وفا توڑ کے جاتے ہو تو کیا ہے

حامد علی خاں

المات

اب یاد کر رہے ہو مجھے بار بار کیا پہلے نہیں تھے واقف انجام کار کیا؟
 کیوں کھو رہے ہو اپنی جفا کا بھی اعتبار اپنے کئے پہ ہوتے ہو اب تیرا کیا؟
 کر کر کے یاد اپنی تغافل شعاریاں تم کر رہے ہو دل کو مرے مقبیلہ کیا؟
 غدر جفا سے دل کو دکھانے سے فائدہ؟ کم ہے مرے لئے ستم روزگار کیا؟
 مانا کہ تم کو میری وفا کا ہے اعتبار عمر گریز پا کا مگر اعتبار کیا؟
 دل سرد مہر لیں سجھایا کئے سدا روشن کرو گے اب مری شمع مزار کیا؟

زہنا تم کو حاجت غدر جفا نہیں

اے جان آرزو مجھے کوئی گلہ نہیں

خط

ہوشیار پوری

شعاعیں

آپ کو معلوم ہے کہ اب تک جو اسرار کائنات بے نقاب ہو چکے ہیں وہ غیر دریافت شدہ حقائق کے مقابلہ میں عشرِ شیر بھی نہیں ہیں، علماء نے اب تک شعاعوں کے متعلق جو کچھ دریافت کیا ہے وہ بہت کم ہے اور اس سے ذوقِ جستجو کی تشنگی رفع نہیں ہوتی۔ اس مقالہ میں بعض ایسی شعاعوں کے متعلق مختصر بحث کی گئی ہے جو حال ہی میں دریافت ہوئی ہیں، اور معالجہ امراض وغیرہ خصوصاً معالجہ سرطان میں ان کی وجہ سے جو سہولت پیدا ہو گئی ہے اُس پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک مددگار ان کے خواص و تاثرات کی تشریح کی گئی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے تک عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ بالائے منفشی اور پائیں سرخ شعاعیں دریافت کر کے ہم طیفِ نمکی کی انتہا تک پہنچ گئے ہیں، لیکن بعد میں واضح ہوا کہ بہت سی ایسی شعاعیں بھی موجود ہیں جن کے متعلق ہمیں یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں ہے۔ البتہ قیاس یہ ہے کہ وہ مختلف ستاروں سے یا ان فضاؤں سے آتی ہیں جو ستاروں اور سیاروں کے مابین حائل ہیں۔ اس بنا پر طیف کی سات بنیادوں شعاعوں کے علاوہ اور بھی شعاعیں ہیں جو یا تو سورج سے نکلتی ہیں یا دوسرے کردوں سے خارج ہوتی ہیں ان میں زیادہ اہم یہ ہیں۔ بالائے منفشی شعاعیں، پائیں سرخ شعاعیں، لاشعاعیں، جد شعاعیں، کائناتی شعاعیں اور برقی شعاعیں جنہیں لاسکی شعاعیں بھی کہتے ہیں۔

یہاں ہم ان سب کے علاوہ بعض جدید قسم کی شعاعوں کے متعلق اور خصوصاً حیاتی شعاعوں کے متعلق بھی بحث کرنا اور ان کے کچھ خواص بیان کرنا چاہتے ہیں۔

آج سے نصف صدی پیشہ اگر کوئی شخص ان شعاعوں کے متعلق جواب تک دریافت ہو چکی ہیں پیشین گوئی کرتا تو وہ ”دہی“ اور ”خبطی“ سمجھا ماتا، اس کے باوجود یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اب تک جو شعاعیں دریافت کی جا چکی ہیں ان کو تحقیق و جستجو کی آخری منزل قرار نہیں دے سکتے اور یقیناً ان کے علاوہ بھی اور شعاعیں کائنات میں موجود ہیں۔

حیاتی شعاعیں۔ جن شعاعوں کا علماء نے حال میں اکتشاف کیا ہے ان میں سے جدید ترین شعاعوں کو حیاتی شعاعیں کہتے ہیں۔ ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ یہ بعض نباتات مثلاً پیاز کے ذمی حیات خلیوں کے زندہ جال میں سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی دریافت کا سہرا ایک روسی عالم ڈاکٹر الگزندر گوروج (Dr. Alexander Gurwitsch) کے سر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ شعاعیں سرطان کے معالج میں بہت مفید ہیں اور غالباً علماء اُس کے استیصال میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس رائے میں آسٹریائی ڈاکٹر پولیٹینر (Dr. Politenier) بھی جو مرض سرطان کے معالج میں خاص دستگاہ اور شہرت رکھتے ہیں ان کے ہم خیال ہیں۔

ان شعاعوں کے تحقق وجود کے لئے تجربہ کے طور پر سبز پیاز کی جڑ لے لیجئے اور اسے ایک ایسے لپک کرنے میں رکھ دیجئے جہاں روشنی کا گزر قطعاً ناممکن ہو اس کے ساتھ ہی ایک مکی لپیٹ رکھ دیجئے۔ چن چنکھٹے بھی نہیں گزریں گے کہ اس میں سے نکلنے والی غیر مرئی شعاعوں کی تاثیر سے لپیٹ پر اس کی تصویر اتر آئے گی اکثر علماء نے اس قسم کے تجربات کئے ہیں اور انہیں ان شعاعوں کا وجود تسلیم کرنا پڑا جو زندہ نباتات کے اجسام میں سے خارج ہوتی ہیں۔ ابتداء میں بعض علماء کا خیال تھا کہ وہ بالائے بغشی پایا میں سرخ شعاعوں کی ایک قسم ہے لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کے خواص ان دونوں قسموں کی شعاعوں کے خواص سے قطعاً مختلف ہیں۔

ان شعاعوں کی حقیقت کے متعلق ہنوز کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں، لیکن ان کے متعلق پوری تنہی اور کاوش سے تحقیق جستجو کی جا رہی ہے اور اس امید پر ان کے خواص کا تجربہ کر رہے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے سرطان کا مکمل علاج دریافت ہو سکے۔

لیکن ان کا سرطان کے ساتھ کیا تعلق؟

ان شعاعوں کے کشف ڈاکٹر گوروج کہتے ہیں کہ اب تک ان شعاعوں کے متعلق جس قدر تجربات کئے گئے ان سے متفقہ طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ شعاعیں صرف خلیوں کے اس زندہ جال سے خارج ہوتی ہیں جو کامل نمو کی حالت میں ہو۔ یہ آپ کو معلوم ہو گا کہ خلیوں کا جال بعض وقت انسان کی موت کے بہت عرصہ بعد تک زندہ رہتا ہے اور ایک کافی مدت گزرنے سے پہلے فنا نہیں ہوتا لیکن اسے حالت نمو میں شمار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح نباتات کو اگر زمین سے اکھاڑ لیا جائے تو وہ کچھ عرصہ تک زندہ رہیں گے لیکن اگر انہیں دوسری موزوں مٹی میں نہ بویا جائے تو ان کا سلسلہ نمو منقطع ہو جائے گا۔ یہ بیان کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرطان بظاہر خلیوں کے زندہ جال کے ایک محوڑے سے عبارت ہے جو نمونے کامل کی حالت میں ہو۔

اس لحاظ سے وہ اس ٹکڑے کی ابتدائے تکوین ہی سے حیاتی شعاؤں کا مصدر و مخزن ہوتا ہے اور چونکہ یہ شعاں اُسی وقت سے خارج ہونے لگتی ہیں جب سے جسم میں سرطان کا مادہ پیدا ہوتا ہے اس لئے مادہ سرطان کے محل وقوع کی تعیین اور قوت کچڑنے سے پہلے اس کے استیصال میں بہت زیادہ آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دوسرے غظلوں میں یوں سمجھئے کہ حیاتی شعاں میں سرطان کی چٹلی کھا دیتی ہیں اور مادہ پیدا ہوتے ہی اس کا زناش کر دیتی ہیں، معالج کے لئے اتنا اشارہ کافی اور غیرت ہوتا ہے اور وہ فوراً انسدادی تدابیر عمل میں لے آتا ہے۔

ذمہ دار لوگوں کا خیال ہے کہ وہ غلابا جن سے سرطان کے جال کی تالیف ہوتی ہے بعینہ ان غلابا کے مماثل ہوتے ہیں جن پر زندہ نباتات کا مادہ جسمیہ مشتمل ہوتا ہے۔ تمام قرائن بتاتے ہیں کہ حیاتی شعاں سرطان اور نباتات دونوں سے یکساں طور پر خارج ہوتی ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ سرطان کے غلابا حیرت انگیز سرعت سے نشو و نما پاتے ہیں اور یہی نئے سرے سرطان سے پیدا ہونے والے خطرات کا موجب بن جاتا ہے۔ کیونکہ اُس کے غلابا سرعت کے ساتھ صورت پذیر ہو کر غلابا کے معمولی جال کی جگہ لے لیتے ہیں جس کے نتیجے میں موت واقع ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر گور وچ اور ڈاکٹر یوپیٹر دونوں کا خیال ہے کہ جب کوئی ایسا دقیق آلہ ایجاد ہو جائے گا جس کے ذریعے سے حیاتی شعاؤں کا انکشاف و انقاط آسان ہو جائے تو اطباء کو اس سے بہت زیادہ امداد ملے گی اور وہ سرطان کا محل وقوع معلوم کر کے صورت حال نازک ہونے سے پہلے اس کے تدارک کی تدابیر عمل میں لاسکیں گے۔ امید ہے کہ اطباء عمل جراحی کی امداد کے بغیر اس کے استیصال میں کامیاب ہونے کے قابل بن جائیں گے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ مادہ سرطان کے ظہور سے پہلے ہی اس کا تدارک کر دیا جائے۔

پسی شعاں میں (پسی شعاں) حیاتی شعاؤں سے کم حیرت انگیز نمبائی ہے یہ شعاں بھی نوادر ہیں اور اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ تمام فضائے کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں انہیں کی وجہ سے جو ہر مادہ وجود پذیر ہوتا ہے اور مختلف امواج نور پیدا ہونے کا سبب بھی بعض علماء کے قول کے مطابق پسی شعاؤں کی موجوں کا باہمی تصادم اور ایک دوسرے میں تفاعل ہے۔

اب تک صحیح طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ یہ امواج جو ہر مادہ کو کس طرح پیدا کرتی ہیں ہم صرف اس حد تک قیاس کر سکتے ہیں کہ سطح آب پر دو موجوں کے تصادم کے وقت جو ابھارا اولہ تفاعل پیدا ہوتا ہے، اسے پیش نظر رکھ کر ایک سادہ نظریہ قائم کر لیں جس طرح یہ ابھار، جو تصادم کا نتیجہ ہوتا ہے، ایک مخصوص شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح جب پسی شعاؤں کی دو موجوں میں تصادم واقع ہوتا ہے تو نقطہ تصادم پر

جو ہر فرد کا ایک دلدار کھلا پیدا ہو جاتا ہے

یہ بیان کرنا غیر ضروری ہے کہ امواج پسّی اور امواج کبّر کی تشبیہ قطعاً مجازی ہے اس کا مفاد صرف اس قدر ہے کہ ناظرین کے دماغ میں ایک ترقّی تصویر قائم ہو جائے چونکہ پسّی شعاعیں فضا کے ان تمام جھٹوں کو چوکرتی ہیں جو کائنات کے مابین بصورتِ خلا واقع ہوں۔ اس لئے وہ دوانا و استمرار متصلاً رہتی ہیں اور ان کے تصادم سے مادّہ کی تخلیق عمل میں آتی رہتی ہے۔

اگرچہ اس نظریہ کی صحت کی بہت دلیلیں موجود ہیں لیکن علماءِ فزید بحث و استقرار میں مسلسل مصروف ہیں اور اس نظریہ کے اثبات کے لئے خرید تجربات کرتے رہتے ہیں۔

پائین سُرخ یا حرارتی شعاعیں۔ یہ شعاعیں ان تمام اجسام سے خارج ہوتی ہیں جن میں حرارت کا دوران موجود ہے۔ نیز دوسرے زندہ اجسام سے بھی خارج ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں کا دعوئے ہے کہ چند ایسی شعاعیں بھی موجود ہیں جو انسان کے جسم یا اس کے دماغ سے خارج ہوتی ہیں اور انہیں سے وہ مادّہ بنتا ہے جو روح کا قوام ہے اور جس کا نام اکو بلازم رکھا گیا ہے۔ ان کے نزدیک ظہورِ ارواح کی یہی تعلیل ہو سکتی ہے۔ مگر ان شعاعوں ————— یا امواج ————— کا اخراج علمی طریقہ پر ثابت نہیں ہو سکا ہے اور پائین سُرخ شعاعوں کا اجسامِ حین سے خارج ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو علمی حیثیت سے پائے ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ یہ بھی خیال ہے کہ اکثر لوگ اجنبی اشخاص سے ملاقات کے وقت انقباض و انبساط کی جو غیر ارادی کیفیات محسوس کرتے ہیں اُس کا سبب بھی صرف یہی ہے کہ یہ شعاعیں بعض اجسام سے خارج ہو کر دوسرے اجسام سے ٹکراتی ہیں اور مختلف حالات میں مختلف اثرات کا موجب بن جاتی ہیں

نامعلوم شعاعیں۔ بعض ایسی شعاعیں بھی ہیں جن کی ماہیت اور کیفیت انبعاث کا اب تک اکتشاف نہیں ہو سکا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ وہ مختلف قسم کے پروانوں کے بازوؤں سے خارج ہوتی ہیں۔ یہ شعاعیں کافی قوی ہوتی ہیں یہاں تک کہ اُن کے ذریعہ سے نہایت باریک اشیاء کی تصویر بھی عکسی پلیٹ پر اتر آتی ہے حیرت انگیز یہ امر ہے کہ یہ شعاعیں پروانوں کے مر جانے کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے بازوؤں سے خارج ہوتی رہتی ہیں۔ بعض علماء نے اس قسم کے تعجب خیز تجربات کئے ہیں۔ ایسے پروانوں کے بازو ہیا کئے گئے جو تیس سال پہلے مر چکے تھے انہیں ایسے تاریک کمرے میں رکھا گیا جہاں روشنی کا قطعاً گزر نہیں تھا۔ ان پر ایک عکسی پلیٹ رکھ دی چند گھنٹوں کے بعد ان شعاعوں کے لوہے کے بازوؤں سے کھل جی نہیں پلیٹ پر بازوؤں کی تصویر منطبع ہو گئی۔

ان عجیب و غریب شعاعوں کی دریافت کا سہرا واشنگٹن کے قومی عجائب خانہ کے ایک عہدہ دار ڈاکٹر آسٹن کلاک کے سر ہے۔ وہ اس کے متعلق اب تک وسیع پیمانہ پر تجربات کر رہے ہیں تاکہ ان

شعاعوں کی حقیقت واقعی دریافت ہو سکے۔ انہوں نے بہت سی قسم کے پروانوں کے بازوؤں کی اس طرح دیکھ بھال کی کہ انہیں بالکل بند صندوقوں میں مقفل کر دیا جن میں کمپن سے کسی طرح روشنی کا گزرنہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود ثابت ہوا کہ تمام بازوان نامعلوم شعاعوں کو خارج کرتے رہے ہیں اور یہ کسی پلیٹوں پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔

ابتداء میں خیال تھا کہ یہ شعاعیں بالائے منفشٹی شعاعوں کی قسم ہیں سے ہیں، کیونکہ جس طرح بالائے منفشٹی شعاعیں خواہ کتنی ہی لطیف و شفاف کیوں نہ ہوں گا پتھر میں سے نہیں گزر سکتیں۔ اسی طرح یہ شعاعیں بھی نہیں گزر سکتیں لیکن بعد میں تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ شعاعیں گار پتھر میں سے گزر سکتی ہیں اور یہی ایک دلیل اس امر کے اثبات کے لئے کافی ہے کہ وہ بالائے منفشٹی قسم کی شعاعوں میں سے نہیں ہیں۔

طیف کی شعاعیں - رنگ کیا ہے؟

حقیقت میں رنگ کوئی بیرونی وجود نہیں رکھتا، جو چیز بیرونی وجود رکھتی ہے وہ شعاعیں یا روشنی کی امواج ہیں، مختلف رنگوں کی روشنی میں جو فرق ہے وہ محض طول موج کا فرق ہے۔ جب خاص طول موج کی شعاعیں آنکھ پر پڑتی ہیں تو غالباً آنکھ سے لمحہ اعصاب کے ذریعے سے سہلے دماغ میں ایک خاص قسم کا احساس پیدا ہوتا ہے جسے "رنگ" کہتے ہیں۔

اب ہم طیف کشی کی شعاعوں یا سات بنیادی رنگوں کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ سات رنگ یہ ہیں۔ (منفشی) ۲۔ نیلا ۳۔ آسمانی، ۴۔ بنزہ زرد، ۵۔ نارنجی اور سرخ۔ ان رنگوں کو قوس قزح میں بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن آسان ترکیب یہ ہے کہ دھوپ میں ایک مثلث الاضلاع منشور رکھ دیں، روشنی منشور میں سے گزر کر دوسری جانب مذکورہ بالا سات اصلی رنگوں میں منقسم نظر آئے گی اور رنگوں کی ترتیب اوپر سے نیچے کی جانب وہی ہوگی جو ہم نے بیان کی یعنی رب سے اوپر منفشی اور رب سے نیچے سرخ۔ مگر جدید معلومات بتاتی ہیں کہ ان رنگوں یا شعاعوں پر تمام طبعی شعاعیں ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ ان کے علاوہ بھی کئی قسم کی شعاعیں ہیں جنہیں اگرچہ محض چشم ظاہری کی امداد سے نہیں دیکھ سکتے لیکن ان کے اثرات محسوس کر کے انہیں موجود تسلیم کر لیتے ہیں۔

مثلاً پائین سرخ شعاعوں کو لے لیجئے جنہیں ڈاکٹر ہرشل نے محض برسبل اتفاق دریافت کیا تھا اس کا صورت یہ ہونی کہ وہ طیفی شعاعوں کو "الوان منفک گانہ" میں تحلیل کر رہے تھے۔ اتفاقاً پش چما دھرم پٹر سرخ شعاعوں کے نیچے کی جانب رکھا گیا، اس سے یہ عجیب نتیجہ نکلا کہ تیش چما کا درجہ حرارت کم ہونے کی

بجائے اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ دوسرے ساتوں رنگوں کی شعاعوں میں سے کسی ایک کے نیچے بھی پیش پیماکہ درجہ حرارت میں اتنا اضافہ نہیں ہوا تھا، اس تجربہ کا مکررہ کرکئی مرتبہ اعادہ کیا گیا اور ہر مرتبہ یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ جب پیش پیماکہ شعاع سورج کے نیچے کی جانب رکھا جاتا تو درجہ حرارت میں اضافہ ہو جاتا تو اتر کوٹ و استقراء سے ثابت ہوا کہ طیف شمسی کے نیچے حصہ میں خاص قسم کی شعاعیں موجود ہوتی ہیں گو وہ بظاہر نظر نہیں آتیں، انہیں اب پائیں سورج شعاعیں کہنے لگے ہیں۔

سورج کی حرارت بلکہ جسم انسانی سے خارج ہونے والی حرارت کا سبب بھی یہی شعاعیں ہیں، اور اوجودیکہ آنکھ انہیں دیکھنے سے قاصر ہے لیکن جسم کی جلد ان کی حرارت کو محسوس کرتی رہتی ہے۔ یہ شعاعیں جسم انسانی میں نفوذ کر جاتی ہیں اور اسی بنا پر اطباء ان کے ذریعہ سے خلایا کے جانوں میں جن سے جسم کی تالیف ہوتی ہے، اور خون میں حرارت پیدا کر کے بعض امراض کے معالج میں امداد لینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے جنگ کے موقع پر غیر مرنی خفیہ اشارات ارسال کرنے میں اور دوسری بہت سے اغراض میں بھی امداد لی گئی ہے۔

بالائے منفشی شعاعیں طیف کے دوسرے سرے پر پائی جاتی ہیں بعض امراض میں خصوصاً کسح اطفال میں ان کے ذریعہ سے علاج بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ ان شعاعوں کا طول موج دوسرے الوان ہنگامہ کے طول موج سے بہت کم ہوتا ہے۔ بخلاف پائیں سورج شعاعوں کے جن کا طول سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

دوسری شعاعیں بالائے منفشی شعاعوں سے بھی کم طول موج کی بعض شعاعیں موجود ہیں جنہیں ٹیوں (Skuman) کی شعاعیں کہتے ہیں۔ اسی قسم کے خواص کی بعض اور شعاعیں بھی پائی جاتی ہیں جنہیں لمپین (dyman) کی شعاعیں کہتے ہیں۔ ان دونوں قسم کی شعاعوں کو ان کے کشفین کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

جدید ترین شعاعیں وہ ہیں جنہیں حال میں ایک جرمن عالم ڈاکٹر جی (J. Blacky) نے دریافت کیا ہے اور ایک دوسرے امریکن عالم ڈاکٹر جوزف ایئر نے بھی اسی عرصہ میں اپنی ذاتی تحقیقات کی بنا پر ان کے اکتشاف کی خبر دی ہے۔ ان دونوں نے بالاتفاق ان کا نام (Border line Rays) یعنی خطا قطع کی شعاعیں تجویز کیا ہے۔ خیال ہے کہ یہ بعض جلدی امراض کے معالج میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔

لاشعاعیں (X Rays) اور جہ شعاعیں (Gamma Rays یا γ Rays) بھی نو دریافت شعاعوں میں کافی اہمیت رکھتی ہیں خصوصاً سرطان کے علاج میں بہت مفید ثابت ہوئی ہیں کیونکہ وہ بعض قسم کے زندہ فیلوں اور خصوصاً سرطان کے فیلوں کو فی الفور ہلاک کر دیتی ہیں۔

ایک قسم کی شعاعیں کہلاتی شعاعیں (Cosmic Rays) کہلاتی ہیں جنہیں حال ہی میں امریکن

پروفیسر ٹیکن کے دریافت کیا ہے۔ یہ شعاعیں ابھی تک علماء کے لئے رازِ سرست کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان کا سرچشمہ یعنی طور پر دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ خیال یہ ہے کہ وہ کائناتِ بعیدہ یا فضا کے بیسٹ سے نکلتی رہتی ہیں ان شعاعوں کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ بہت شدید نفوذ ہیں اور اس لحاظ سے انہیں جہ شعاعوں پر بھی فوقیت حاصل ہے جو سرعتِ نفوذ اور شدتِ تاثیر میں خاص امتیاز رکھتی ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کائناتی شعاعیں کائناتِ بعیدہ کے بعض عناصر کے انحلال سے پیدا ہوتی ہوں۔ غالباً ان کا مصدر ان متعدد ستاروں یا آفتاب کے جو کہ کوثرِ آریہ زیادہ قریبِ مواب ہوگا۔ جن میں غیر معمولی طور پر انتہائی حرارت پائی جاتی ہے۔ بعض علماء — مثلاً ڈبلن یونیورسٹی کے اساتذہ پروفیسر جولی اور پروفیسر مکسٹن — کا خیال ہے کہ کائناتی شعاعوں کا ایک حصہ ہمارے عالمِ ارضی تک سورج سے خارج ہو کر پہنچتا ہے۔ اور وہی انواع کی مختلف نسلوں کے طورِ انقلاب کا باعث ہے یعنی قانونِ نشو و نما کا حقیقی سبب یہی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مستقبل میں دوسری شعاعوں کے انکشاف کی بھی توقع ہے نیز اگرچہ ان کے دریافت شدہ خواص بکثرت ہیں لیکن وہ خواص جو ابھی تک پردہٴ خفا میں ہیں ان سے بہت زیادہ ہیں حقیقت میں ہمیں اسرارِ موجودات کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ بہت کم ہے اور دریا کے مقابل میں قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کی حالت کس بچے کی سی ہے جو اپنے گرد و پیش کی اشیاء اور ماحول کے مناظر دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے۔ علم اگرچہ کمال کی جانب تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے لیکن اُس کی رفتار ترقی خواہ کنستی ہی تیز تر کیوں نہ ہو جائے مگر منزلِ مقصود تک پہنچنا ہنوز محض ایک خواب ہے جس کی تعبیر کے لئے انسان بے تابی سے منتظر ہے۔

کیا مستقبل اس خواب کی صحیح تعبیر پیش کر سکے گا؟

منظورِ سر و ش

(ماخوذ)

(جہوپالی)

فرہنگ اصطلاحاتِ مستعملہ

طیف	Spectrum	ٹیش پیرا	Thermometer	برقی شعاعیں	Radio Rays
طورِ موج	Wave length	پائین سرخ	Infrared	مکس پلٹ	Photographic Plate
بنفشی	Violet	بالائے بنفشی	Ultra Violet	گار پتھر	Quartz
نیلا	Indigo	لاشعاعیں	X Rays		
آسمانی	Blue	جہ شعاعیں	Gamma Rays		
منشور	Prism	کائناتی شعاعیں	Cosmic Rays		

راحت کدہ

(۱)
رات گاہ گراہوت اک جوتیار نغمہ ہے
چو دھویں کے چاند کا دریا نغمہ ہے
نغمہائے شوقِ تراشِ بجاں تہا ہوں میں
سازِ دل کا تار تارک شعلہ زار نغمہ ہے

(۳)
ترجمنِ بہارِ گلستانوں پہ چھاپا ہے
نئے جلوتوں نے دایانِ پیاباں کو برباپا ہے
نہاں تھی ہی جیسے گلِ گل میں بوجاں پڑا ہے
ترا سو موجِ تبتِ میو کی گنگ میں سماپا ہے

(۲)
تہا سے غمِ جا بے عیاں میں لازاروں میں
نہا سے دلشیں نغمے دان میں آشادوں میں
تہا سے دیکھیں باقبا میں خوشاں
تہا سے لکھیں ہماہور تاروں میں

(۴)
گلشنِ غنائے دل میں اُخبِ فناک ہے
شعلہ زارِ آرزو اب یک مشتِ فناک ہے
کج جو ان سٹے بے پروا تھا صہبائی
سچ تیرے جو ہیں افسرِ فناک ہے

اثر صہبائی

فن تنقید

مارچ ۱۹۳۱ء کے آخری دن تھے اور ۱۴ اپریل کو ہمارا امتحان تھا۔

شام تھی کوئی چھ بجے ہو گئے کہ میرے ایک کمرے کا میرے پاس تشریف لے آئے اور ازراہ پند و نصائح ارشاد فرمایا "تم کہہ رہے ہو یقیناً! تمام دن تم ایک جگہ بیٹھے پڑتے رہتے ہو۔ جھلا یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ آدمی ادھر ادھر نہیں نہ جاتے اور یہ سمجھے کہ ہم ہمہ دان ہیں میاں علم کی بھو علم اور یاد رکھو کہ علم اقوام عالم کے نزدیک ایک بہت بڑی نعمت ہے گویا پیسے روٹی جوتی ہے..... یا تصوف..... فلسفہ؟"

میں اس عمیق فلسفہ سے کچھ نہ سمجھ سکا سوائے اس کے کہ یہ صاحب کچھ فرما رہے ہیں "جی ہاں" میں نے جواباً عرض کیا درست ہے لیکن ذرا اس وقت معاف کیجئے میں جناب کی فلسفیانہ گفتگو کو زیادہ نہیں سمجھ سکا لیکن وہ حضرت تھے کہ کوٹے کی طرح میرا داغ چاٹ رہے تھے۔ ایک دھواں دھار تقریر ہو رہی تھی جس میں ان کے "جناب شہریت" کا عنصر غائب تھا اور کچھ نہایت زبردست دلائل پیش کئے جا رہے تھے جن کا مقصد غالباً یہ تھا کہ علم کا ہے۔ درخت سے پانی ہے جتنی کہ کسی کی نیم باز آنکھ کی مستانہ وار نگاہ ہے!

دفعۃً وہ بڑبڑا اٹھے آج ایک کچھ ہے..... دیکھو ایک کچھ ہے..... تنقید (criticism)

پر تمہیں تنقید کرنا نہیں آتا سیکھ جاؤ گے..... فلاں صاحب کا..... کالج ہال میں..... وہ جو چھوٹے سے ہیں..... اپکین ہٹا کرتے ہیں ڈبے سے..... بہت لائق ہیں..... سنا..... بہت سی کتابیں انہوں نے لکھ ماری ہیں..... "اور انہوں نے مجھے کڑی سے اٹھا کر اس زور سے پھینکا کہ میں نے آٹھ نوٹ کا فائدہ ہوا میں طے کیا اور کمرے میں پہنچ گیا..... اس وقت خدا شاہد مجھے حضرت آدم کی حالت پر رحم آ رہا تھا.....

بہر حال ہم کچھ سننے گئے..... ہم نے ہال میں قدم رکھا ہی تھا کہ تیناں گل ہو گئیں شام صبح کا سماں طاری ہو گیا۔ ہر قسم کی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ اسی طبع آزمائی کے دوران میں ایک ہنگامہ زلزلہ ہو گیا معلوم ہوا کہ ایک شریف انسان (روشنی ہونے پر وہ کچھ راہی نکلے) اندھیرے میں شیچ پر چڑھ گیا تھا اور اسے نیچے اتارنے کے لئے شمشکس ہو رہی تھی۔

آخراً کچھ شروع ہوا۔ کچھ اصرار صاحب اپنے آسنو پونچھ چکے تھے لیکن آپ کی شکل پر دہی نقشہ طاری تھا۔ آپ نے افتتاحی طور پر سکرائے کی کوشش کی لیکن واسد میرے آسنو تل آئے میں یہ سمجھا کہ وہ پھر رونے لگے ہیں لیکن میرے کمر فرمانے فوراً تینہ کی کہہ ہوں۔ وہ تو ہنس رہے ہیں۔ جس پر میں نے ضبط کر لیا۔

ہاں تو کچھ شروع ہوا۔ حضرات! سنتے۔ آج ہم اس لئے اکٹھے ہوئے ہیں کہ تنقید پر کچھ نہیں۔ ایک آواز تو آپ کچھ سننے کے لئے تشریف لائے ہیں؟ نہیں نہیں میں اس طلب ہے کہ بہت تنقید پر کچھ کریں۔ ایک اور آواز۔ تو میرا کچھ نہایت فصیح ہوگا۔ کچھ اصرار صاحب (خفت بٹاتے ہوئے)۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ ہاں تو تنقید ایک فن ہے۔ جیسے پارچہ بانی (جس طرح پارچہ بانی میں تخیل) اور انفرادی کوشش نہایت ضروری ہیں ٹھیک اسی طرح تنقید میں بھی یہ اجزا لازمی ہیں۔ ہاں لیکن ایک اور چیز نہایت ضروری ہے اور وہ قلم اور دوات ہے کیونکہ اس طرح کے وقت سے یہ روایت چلی آتی ہے کہ گوگ قلم اور دوات سے لکھیں (تاسیہ) اور کاغذ بھی۔ کیونکہ قلم اور دوات کا فلسفہ بالکل وہی ہے۔ یعنی اظہار مقصد! تو اس سے ثابت ہوگا کہ مقصد کے اظہار کے لئے نقطہ نگاہ کی ضرورت ہے لیکن محض اسی سے آدمی انسان نہیں بنتا۔ اسے آپٹیک ہونا چاہیے چنانچہ میں بھی آپٹسٹ ہوں ہاں تو یہ آدمی آپٹیک ہوتا ہے یا میسٹیک۔ ایک نہایت کیہ بہ نظر شخص لیکن جناب یہ آپٹی میسی کس جانور کا نام ہے؟ کچھ اصرار صاحب (علمیت کے جوش میں)۔ تو آپ آپٹیزم اور میسزم نہیں جانتے ہی۔ ہی۔ ہی۔ اچھا تو سنئے لیکن آپ سچ کچھ نہیں جانتے چھ۔ جب آپ مال پر جا رہے ہوں۔ لارنس کی طرف۔ تو حضرات آپ دائیں جانب کیا دیکھتے ہیں! بلند اور عالیشان عمارتیں۔ یہ آپ میسزم ہے! لیکن آپ بائیں جانب ملاحظہ فرمائیے۔ مٹی کوڑا کرکٹ گراہے یہ ہے میسزم! یا مثلاً آپ موٹر میں بیٹھے ہوئے الف لیلہ پڑھ رہے ہوں تو یہ میسزم ہے لیکن۔ ایک آواز! اگر الف لیلہ کی جلدیں پھٹی ہوں تو؟ دوسری آواز! اگر الف لیلہ نہ ہو تو؟ تیسری آواز! اگر آپ موٹر کی چھت پر بیٹھے ہوں تو؟ کچھ اصرار صاحب (منہ پھلا کر کہتے ہوئے) غاموش! الجھ جاؤ۔ تینوں حالتوں میں ایک ہی نقطہ ہے! ہاں۔ اگر آپ موٹر کے گرد و غبار میں بھیسے ہوں تو یہ میسزم ہے! ایک آواز! لیکن چپٹرٹن۔ کچھ اصرار صاحب! گویا اس کے سیاہ چپک کے داغوں والے چہرے اس کا مقصد پڑھ کر! ہاں چپٹرٹن میرے میسا ایک آدمی ہے۔ ایک اور آواز! تو آپ ہندوستانی چپٹرٹن ہیں؟ کچھ اصرار صاحب (نہایت سنجیدگی سے اور متانت کی تیوری چھلے ہوئے) نہیں فرق صرف رومانسزم کا (romanticism) ہے ایک اور آواز! تو یہ کیا ہوتی ہے؟ کچھ اصرار صاحب! تم سب نالائق! کچھ ہو رہے ہو۔ تم کچھ نہیں جانتے رومانسزم

پیمال

اغیار میں ذکر اُن کی فسا کا نہ کریں گے
 گراُن کو تقاضا ہے تو اچھا نہ کریں گے
 سنبل سے کسی زلفِ گرہ گیر کی باتیں
 اے بے خودتی جو شِ تمنا نہ کریں گے
 نرگس کو کسی چشمِ فصولِ گر کے بیاں سے
 ہم اک نگہِ ناز کا شیدا نہ کریں گے
 اے سرو و گل و یاسمن و لالہ و نسریں
 باتیں جو ہوتیں تم سے وہ اصلا نہ کریں گے
 کہتے ہیں وہ کس طرح یقیں آئے کسی کو
 کیا کیا نہ کیا آپ نے کیا کیا نہ کریں گے
 رسوائے جہاں ہو کے بھی اے کم نظر و ہم
 عہدِ کرمِ دوست کو رسوا نہ کریں گے

حامد علی خاں

اسلام اور اشتراکیت

مغربی ممالک میں اشتراکیت کا ظہور اُس منافرت کا نتیجہ ہے جو پیشہ ور اور مزدور جماعتوں کے دلوں میں سرمایہ داروں کے ظلم و ستم کی وجہ سے راسخ ہو گئی ہے چونکہ سرمایہ دار برسرِ اقتدار ہیں اور کلیسیا ہمیشہ سے ان کا ساتھ دیتا رہا ہے۔ ساتھ ہی مزدور طبقہ کی استبدادوں کے باوجود اصلاح حال سے غفلت برتنا رہا ہے۔ اس لئے بتدریج اشتراکی مسیحیت کو سرمایہ داری کا متضاد سمجھنے لگے اور مذہب سے سخت نفرت ہوتے گئے۔ ان کا یہ رجحان خاطر ایک ٹرمی مذہب برسرِ حق تھا۔ کیونکہ ان کی ساری معلومات صرف کلیسیائی مذہب تک محدود رہی ہیں۔ وہ حضرت مسیح کے سچے مذہب سے بھی جیسا کہ وہ فی الحقیقت ہے واقف نہیں رہے ہیں۔ دنیا کا کوئی مذہب ان کی واقفیت کے معیار سے اب تک اس مسئلہ کا خاطر خواہ حل پیش نہ کر سکا تھا ان کی پیدائش مغربی ممالک میں ہوئی اور انہوں نے اسی سرزمین میں ہوش سنبھالا تھا، اسلام کی تعلیمات سے بے خبر تھے اور جو کچھ علم انہیں اسلام کے متعلق حاصل ہو سکا تھا وہ تمام تر عیسائی ذرائع ہی سے حاصل ہوا تھا اور اس پر تعصب کا رنگ چڑھا ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ اشتراکی ہر مذہب کے مخالف ہو گئے۔ اور مذاہب کو تباہ کرنا ان کے لائحہ عمل کا ایک جزو قرار دیا گیا۔ ان کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اسلام حقیقی اشتراکیت کا معلم آویں ہے۔ اب بتدریج تاریکی کا پردہ اٹھنا جا رہا ہے اور انہیں معلوم ہو رہا ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی دنیا کا ایک ایسا مذہب ہے جس کے وسیلہ سے حقیقی اشتراکیت ————— آج کل کی اشتراکیت عیسائی کہ روس میں رائج ہے ————— دنیا کو نجات دلا سکتی ہے۔ اس بیان کی تصدیق کے لئے چند مثالیں کافی ہیں۔

اسلام کا قانون وراثت ایک ایسا حکیمانہ اور عادلانہ قانون ہے کہ جس کی وجہ سے ملک دار امیر طبقہ اور سرمایہ دار کو ورثتی کا جو دہی کا عدم ہو گیا ہے ہر متوفی مسلمان کی ہلک اُس کے ورثائیں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ حق انصافیت و اکثریت اولاد جیسا کہ دیگر مذاہب میں ہے اسلام میں نہیں یعنی متوفی کی ہلک کسی خاص وارث یا ورثہ کو نہیں مل جاتی۔ بلکہ جلد ورثہ میں تقسیم اور اولاد و اولاد میں بٹی جاتی ہے جو بیوی کو اپنا حصہ رسد ہی تو ملتا ہے۔ مگر بعض صورتوں میں بیوی کے والدین کو بھی حصہ ملتا ہے کوئی شخص بھی

اپنی ملک کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ کسی اپنے رشتہ دار یا غیر کو دے نہیں سکتا۔ البتہ خیرات اور وقف کی صورت میں اپنی ساری ملک اُسے دے دینے کی اجازت ہے۔ عرب کے اس معتقن اعظم کا مقصد عظیم یہ تھا کہ مال و دولت کو اپنے ملک میں یکساں تقسیم کر دیا جائے تاکہ افراد انسانی مراتب کے اعتبار سے کم و بیش ایک ہی حالت پر ہوں اور ہر فرد کو یکساں موقع ملے ہو۔ اسی غرض کو مد نظر رکھ کر مالداروں پر اسلامی قانون نے سالانہ زکوٰۃ فرض کر دی ہے۔ اشتراکیت کی آخری حد اسلام میں یہ ہے کہ اگر کسی کی زمین ایک مدت تک غیر خرور و عمر پڑی رہے تو اُس کے ہمسایہ کو یہ حق حاصل ہے کہ جی بھلت اُس میں زراعت کرے۔ اس اصول کی بنا پر کہ تمام افراد انسانی آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور ایک کے لئے دوسرے کی مدد کرنا لازم ہے۔ اسلام نے سود خواری سے منع کر دیا ہے اس ممانعت کی وجہ انسان میں تجارت اور محنت کرنے اور کفایت شعار بننے کی رغبت پیدا ہوتی ہے اور بینوں میں مال و دولت جمع کرنے کی حرص کم ہوتی ہے۔ اور سود خواروں کا وجود جو انسانی سوسائٹی کی خوشحالی کے حق میں ہم قاتل کا حکم رکھتا ہے، غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ مزید بریں یہ ایک ضرب کاری ہے مرنیہ داری کے جسم پر۔ روپیہ اور دوسری شایہ حاجت مندوں کو بلا سود فرض دی جاسکتی ہیں۔ قرآن کا حکم اس بارے میں حسب ذیل ہے:-

”دوسروں کے ساتھ نا انصافی سے پیش نہ آؤ تو تمہارے ساتھ بھی نا انصافی نہ کی جائے گی۔ اگر کوئی مقرض سخت تکلیف میں ہو تو اُسے اُس کی حالت سنبھل جانے تک ہمت دو۔ اگر تم قرض معاف کر دو تو تمہارے حق میں یہ بہتر ہو گا۔ اگر تم سمجھو۔ قرآن حکیم میں ایک اور جگہ دولت جمع کرنے کے بابے میں اجتماعی حکم آیا ہے اے ایمان والو! سچ ہے کہ اکثر عالم اور زاہد فخر سے لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں اور انہیں راہ خدا سے منحرف کر دیتے ہیں مگر اُن سے کہہ دیا جائے کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور راہ خدا میں نہیں دیتے وہ سخت عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے۔“

اسلام میں قمار بازی کی سخت ممانعت ہے اور غالباً اس حکم کی غرض دفاعیت یہ ہوگی کہ کوئی فرد و احد اپنے کسی غریب بھائی کی کمائی سے دولت مند نہ بن جائے۔ قرآن میں گراں فروشی اور احمکاسی بھی ممانعت کی گئی ہے اور قرآن السیو پر لعنت بھیجتا ہے۔ اگر عیسائی دنیا اسلام اختیار کر لیتی اور اُسے معاشری زندگی میں اپنا فخر راہ بنا لیتی تو یقیناً اجارہ داری کی لعنت سے جو اصول مساوات کی دشمن ہے اور جس پر افراد ہی حقوق کی مہارت قائم ہے، بچ جاتی اجارہ داری و حقیقت ایک دوسرا طریقہ ہے قلیل التعداد طبقہ امراء کے پیدا کرنے کا جو باقی فراہمیت کی قربانی اور ایک فرد کی خون آشامیوں سے پیدا

ہوتا ہے۔ رسول مقبولؐ نے فرمایا ہے کہ جارہ داری گناہ گاری ہے۔ مغربی تہذیب نے جس کی دایرہ گری نام نہا مسیحیت کر رہی ہے وہ سہ پہلک مگر سرگراں تھکڑے کٹے ہیں جن کا جاہ و جلال دنیا کی غریب اقوام کی مسلسل خون ریزوں کا نتیجہ ہے۔ اگر یہی تہذیب اسلام کو اپنا سنگ بنیاد قرار دیتی تو نظام نہ کو اذیت کے ذریعہ ہی ان دونوں باتوں کے درمیان کہ انسان کیا ہے۔ اور اُسے کیا ہونا چاہئے حقیقی توازن قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتی اس کے متعلق گہن اپنے مشہور الفاظ میں یوں کہتا ہے رسولؐ عربی شاید دنیا کے ایک ہی ایسے متفق ہیں جنہوں نے خیرات کی ٹھیک ٹھیک مقدار بتا دی ہے۔ مقدار خیرات مال و دولت کی عینیت اور دے پر موقوف ہے۔ چاہے وہ منس کی صورت میں ہو یا روپیہ اور مویشی کی صورت میں مگر مسلمان اُس وقت تک قانون سے عہدہ برائیں ہو جیتے جب تک کہ عشر ادا نہیں کریتے۔ حقیقی اشتراک زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس مادی دنیا میں ہم توقع نہیں کر سکتے کہ کوئی انسان اپنی ذاتی منفعت کو چھوڑ کر کسی صورت میں قربانی کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔ خیرات پہلے گھر سے شروع ہوتی ہے یہ ہے ہماری ذہنیت۔ مگر اسلام اور صرف اسلام ہی وہ محرک تھیارتناہی جو ایمان والوں کو قربانی کرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ اپنے مال و دولت کو محض رضائے الہی اور ثواب عقبی کے لئے تقسیم کر دیں۔

ہمیں امید ہے کہ ہماری اس مختصر تحریر کو غور سے پڑھا جائے گا۔ ممکن ہے اشتراکیت جس کا شعلہ حتمی طور پر بجھ جانے والا ہے وہ صحیح اور مضبوط بنیاد پر قائم ہو جائے، تو پھر زندہ رہے اور دنیا کو مادہ پرستی اور منہراج کے آہنی پنجے سے نجات دلا دے۔

ایم عبدالقادر

ترجمہ

تمہاری زندگی تمہارے خیالات کا پر تو ہے۔ اگر تم اپنے موجودہ حالات سے مطمئن نہیں ہو یا تمہاری سابعہ زندگی کے امتحان کا نتیجہ نا تسلی بخش ہے تو اپنے خیالات کو بدل دو

میر زمان خاں نانن

ڈاکو

وارڈ کے جنوب میں راتب کی جانب دو شکستہ حال ٹیلے دکھائی دیتے ہیں جو ڈاکوؤں کے تنہا گھسٹے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی وقت ڈاکوؤں کا ایک گروہ وہاں قیام رکھتا تھا۔ اُس زمانے میں تقریباً ناممکن تھا کہ کوئی مسافر ڈاکوؤں کی لوٹ مار سے بچ کر سفر کر سکیں گے۔ مزدوروں اور سائیلوں پر تو خصوصاً ان ڈاکوؤں کی نظر عنایت رہتی تھی۔ حکام کے لئے اس گروہ کا کھوج لگانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے گیلرپ اور ارد گرد کے دوسرے دیہات میں اپنی کینگا ہیں بنا رکھی تھیں۔

شام ہوتے دیر ہو چکی تھی کہ ایک نوجوان انڈر فوم پہنچا۔ انڈر فوم وارڈ کے نزدیک ایک ہریسندار ٹمٹ کی پُرانی حویلی تھی۔ اس نے وہاں رات بسر کرنے کی اجازت طلب کی اور کہنے لگا کہ کچھ ڈاکو جو میرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے میرا تعاقب کر چکے ہیں اس لئے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ آج رات سفر کروں۔ ایک ویران جگہ میں ڈاکوؤں نے مجھ پر حملہ کر دیا میرا گھوڑا ایک ایسے رستے سے جو موٹک کے آ پار پھیلا گیا تھا الجھ کر گر پڑا اور میں بمشکل تمام پیدل بھاگ کر انڈر فوم پہنچ سکا ہوں۔

صاحب خانہ اور اس کی حسین بیٹی نے نہایت اخلاقی و مروت سے اجنبی کا خیر مقدم کیا اور ڈاکوؤں کے حادثہ کی وجہ سے اجنبی کے دل پر جو ناخوشگوار اثر پڑا تھا اس کے دور کرنے کے لئے پوری توجہ صرف کر دی اس ناگوار واقعہ کے اثر کو زائل کرنا باپ کے لئے اور بھی زیادہ آسان ہو گیا کیونکہ دوران گفتگو میں اجنبی نے ایک سلجھ ہوئے اور شائستہ دماغ کی لطافتِ احساس اور نزاکتِ فہم ظاہر کی۔ اسی طرح لڑکی کے لئے بھی اس وجہ سے مسافر کی دلجوئی زیادہ آسان ہو گئی کہ وہ ایک خوبصورت آدمی تھا اور اس نے اس نازنین کو مخاطب کرنے کے پہلے ہی لمحہ میں پوری پوری کوشش صرف کر دی کہ اس کے حسن اور جوانی نے جو حیرت افزا مسرت اس کے دل میں پیدا کر دی تھی وہ اس پر ظاہر ہو جائے۔ پس یہ ایک قدرتی امر تھا کہ وہ دونوں کی دلچسپی کا موجب ہو سکے۔

نوجوان کھٹے لگا میرے باپ کا نام کیلڈ ہے ہم کو لڈنگ سے پرے رہتے ہیں۔ میں سیر و تفریح کے لئے تمام موسم خزاں ملک میں سفر کرتے گذار آیا ہوں۔

رات ختم ہو چکی تھی اب دن بھی گذر گیا لیکن اجنبی اب بھی انڈر فوم ہی میں تھا۔ گھروالوں کو اس کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی نظر آنے لگی۔ نوجوان نے بڑے شوق سے زمیں دار نامٹ کے نکرار اور تاش کی پارٹیوں میں حصہ لیتا۔ اس کی موجودگی نے خاتون کی بے کیف زندگی کے تسلسل کو بھی توڑ دیا۔ وہ اُسے ان ملکوں اور شہروں کے حالات سنانا جن کی سیر وہ کر چکا تھا اور وہ نہایت شوق اور توجہ سے سنتی۔ جب وہ اُس کی خوشامد کرتا اور سرگوشیوں میں اس کے حسن کی تعریفیں کرتا تو وہ شرما کر نظروں نیچی کر لیتی۔

اس طرح کیلٹ نے اس مکان میں ایک مہینہ گزار دیا۔ ہر روز وہ اپنی روانگی کا دن مقرر کرتا لیکن اُس طرح ہر روز میزبان کی التجائیں اُسے کچھ دیر اور وہیں ٹھہرنے پر مجبور کر دیتیں اور گنگا ناراس کی روانگی ملتوی ہوتی رہی۔ آخر کار ایک دن ایسا بھی آگیا کہ جب اُس نے اپنے میزبان کو خیرباد کہی۔ اب نوجوان دو شیزہ اس سے منسوب ہو چکی تھی وہ گھر کے مالک اور اپنی منسوبہ کو رنج و غم میں چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو گیا لیکن جانے کی اجازت اُسے اس وقت ہی ملی جب اُس نے جلد پھر واپس آنے کا وعدہ کر لیا اُس نے کہا کہ میں جا کر اپنے گھروالوں کو مطلع کر آتا ہوں اور اگر ممکن ہوا تو اپنے باپ کو ساتھ لانے کی کوشش کروں گا۔ انڈر فوم کے رہنے والوں کو اس کی غیر موجودگی بہت ہی لمبی اور تھکا دینے والی معلوم ہوتی تھی۔ آخر کار جب وہ واپس سے واپس آیا تو نہایت خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ وہ اپنے ساتھ نہ صرف اپنے باپ کی اجازت لایا بلکہ گھر والوں کے بہت سے پرغوص پیغام۔ اس کے باپ نے اس بات کے لئے بہت معذرت کی تھی کہ وہ بیماری کی وجہ سے بیٹے کے مہراہ نہیں آسکا۔

نوجوانوں کی شادی کے لئے بہار کا موسم مقرر ہوا اس دوران میں کیلٹ اسی بڑی جیلی میں مقیم رہا اور روز بروز باپ بیٹی کے دل میں گھر کرنا گیا۔ باپ کا خیال تھا کہ شکار کے تعاقب کرنے میں کوئی کیلٹ کا ثانی نہیں۔ اگرچہ وہ خود بھی ایک اعلیٰ درجہ کا شکارچی تھا۔ کیلٹ کا رجحان طبیعت میدان کے کھیلوں کی طرف زیادہ تھا اور بجائے اس کے کہ وہ زیادہ وقت اپنی منسوبہ سے دلچسپی لینے میں بسر کرتا وہ اپنے وقت کا شیزہ حصہ یا تو پسارسی وادیوں میں گزارتا یا جنگل میں ڈراکوؤں نے ان دنوں غیر معمولی لوٹ مار چا رکھی تھی لیکن نہ تو ڈراکوؤں کا خوف اور نہ خاتون کی التجائیں کیلٹ کو اس شوق سے مانع رکھ سکتیں۔

ایک روز کیلٹ حسب معمول شکار کے لئے نکلا۔ اس کے واپس آنے سے پہلے شفق کی مٹھی غائب ہو چکی تھی۔ نوجوان دو شیزہ کا خطرہ بظہر بظہر تھا۔ آخر کار اُس نے اپنے باپ کو مجبور کیا کہ وہ باہر جا کر کیلٹ کو ڈھونڈ لھائے۔ باپ بچا رہ گھوڑے سے گر پڑنے کی وجہ سے اپنے پسندیدہ شغل میں حصہ نہ لے سکا تھا۔ ڈھونڈا آدمی چلا گیا اور بہت دیر تک جھنجھل میں مارا مارا پھر تارک لیکن کہیں بھی کیلٹ کا پتہ نہ چلا۔ دفعۃً

اس نے سُن کر قریب ہی کوئی شخص اس کا نام لے رہا ہے اور وہ نکلیں اُس کو اپنی طرف آتی دکھائی دیں۔ وہ ان اجنبی مشکوں سے پوشیدہ رہنے کے لئے احتیاطاً ایک جھامی کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ لوگ لگاتار باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتیں سُن کر بوڑھے آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کو ذرا بھی شک نہ رہا کہ وہ ڈاکوؤں کے کیننگا ہوں کے بہت قریب ہے۔ اب وہ چپکے سے نتیجہ کا منتظر رہا۔

چند منٹ باتیں کرنے کے بعد بوڑھے والے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ ایک تو بڑی سڑک کے کنارے کے پار ہو گیا اور دوسری جو اُس دُھندلے میں بھی ایک بوڑھی عورت معلوم ہوتی تھی اُس کے پاس سے گذر کر جھاڑیوں میں داخل ہو گئی۔

گھنی جھاڑیوں سے گھرے ہوئے ٹیلے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ کے لئے بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چاروں طرف نظریں دوڑا رہی ہے۔ پھر اُس نے صاف صاف بغیر کسی ہت کے ایک بڑا سا پتھر اپنی جگہ سے سرکایا جو ٹیلے کے دامن میں پڑا تھا اور رینگ کر اس سوراخ میں داخل ہو گئی جو اس پتھر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ پھر اندر سے اس نے پتھر سرکاکر پھر پہلی جگہ کر دیا۔

بوڑھے آدمی نے ایک ہی لمحہ میں سوچ لیا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ اس نے اپنی تلوار میان سے نکالی اور پتھر کو ایک طرف ہٹا کر اس عورت کے پیچھے ہولیا۔ جب سوراخ ختم ہو گیا تو اُس کا پاؤں ایک ڈھلوان دھبے پر پڑا۔ اس زینے کی مدد سے وہ نہایت دے پے پاؤں نیچے اتر گیا۔ سوراخ بند رہ کر کھلا ہوا گیا۔ جب اس کے پاؤں دوبارہ زمین سے لگے تو وہ ایک نہ خانے میں تھا۔ یہ نہ خانہ ناتراشیدہ پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ اس کی بھورے رنگ کی دیواریں دُشمنوں سے روشن کی گئی تھیں۔ غار میں کچھ ہتھیار اور کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ اور ایک لمبی سی میز کھانے کی چیزوں اور شاہ کی بوتلوں سے بھری پڑی تھی۔ چھت کے ساتھ ایک بڑا گھنٹہ آویزا تھا جو چھت سے اس طریق پر چوسٹ کیا گیا تھا کہ جب کوئی مسافر یا سوار اوپر کی سڑک سے گذرنا تو یہ ٹن ٹن کرنے لگتا۔ انڈر فوم کے آفاقی خوش قسمتی تھی کہ جب وہ نہ خانے میں پہنچا تو بڑھی عورت کے سوا اور کوئی وہاں موجود نہ تھا۔ لیکن اسے اس کی موجودگی کا علم کیسے ہو سکتا تھا بلکہ وہ تو ایک طرح اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ وہ سڑک کے نیچے سے گذر کر مقابل کے دوسرے ٹیلے کی طرف جا رہی تھی۔ جو آواز بوڑھے نانٹ کے داخل ہونے سے پیدا ہوئی ہوگی اس نے نہ سنی۔ جب وہ واپس آگئی تو نانٹ نے اُس کی نہایت آہستہ اور محتاط چال سے اور جس انداز سے وہ اپنے ہاتھ سامنے پھیلا پھیلا کر ملتی تھی اندازہ لگایا کہ وہ اندھی ہے۔

جب وہ خوف اور حیرانی سے کچھ منٹ یہ نظارہ دیکھ چکا تو دفعۃً چھت والا گھنٹہ بجنے لگا۔ بوڑھی نے ایک اطمینان کا تقہم لگایا اور بڑبڑا کر کہنے لگی۔ ”وہ آئے۔ آج رات وہ اپنے ہمراہ کیا لائے ہیں۔“

بوڑے نائٹ نے جب دیکھا کہ وہ سخت خطرے میں ہے تو چھپنے کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈنے لگا۔ جب ڈاکوؤں نے اوپر کا بڑا پتھر سر کا یا تو وہ ایک چارپائی کے نیچے جا چھپا جو غار کے ایک کونے میں بچھائی گئی تھی۔ اُسے بہت سے لوگوں کا شور سنانی دیا اور آٹھ دس فٹ کا غار میں اتر آئے۔ ان میں سے ایک ڈاکو ایک نوجوان عورت کی لاش بازوؤں میں اٹھائے ہوئے تھا۔

بوڑھی ماں بدیکھنا! اس نے چلا کر کہا یہ ہمارا آج رات کا خفقہ ہے جو میں تنہا سے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ میں نے آج تک اس قدر حسین عورت نہیں دیکھی۔ میں تو اس کے چلنے کے لئے جب تک کام چھوڑنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ ہاں صرف اگر میں وقت پر پہنچ سکتا تو وہ زندہ رہ سکتی اور میری بیوی کھلاتی۔ اب جو کچھ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے جواہرات اتار لئے جائیں اور پھر اس کو دوسروں کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔

یہ سن کر کچھ ڈاکوؤں نے لاش کے تمام زیورات اتار لئے۔ اب تک وہ بجز ایک بڑی سی وزنی انگوٹھی کے ساری لاش پر ہاتھ صاف کر چکے تھے لیکن انگوٹھی کا فی کوشش کے باوجود بھی اٹھنے سے نہ اترتی۔ ایک آدمی نے ایک چھوٹی سی کھمٹائی لی اور لاش کا ہاتھ چارپائی کے ایک کنارے پر رکھ کر ایک داریں انگلی کاٹ بیٹھنے کی جگہ وار تیزی سے کیگا تھا اس لئے انگلی کٹ کر چارپائی کے نیچے جا گری اب ڈاکوؤں نے اپنا خفقہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ اور بوڑے نائٹ کے کپڑے جانے کا قومی اندیشہ ہو گیا خوش قسمتی سے ایک آدمی بول اٹھا چلو رہے بھی دو بار! میں پھر کسی وقت اسے ڈھونڈ لوں گا۔ بہتر ہو گا اگر ہم پہلے لاش کو دوسرے ٹیلے کے نیچے دفن کر دیں اور فانیخ ہو کر کھانا کھائیں۔

یہ تجویز مان لی گئی اور تھوڑی دیر میں ڈاکو ایک میز کے ارد گرد اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور انہوں نے شام کے کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ بوڑھا نائٹ چارپائی کے نیچے سے سب کچھ دیکھ رہا تھا جو جوں جوں وہ زیادہ شراب پیتے جاتے فرار کا موقعہ حاصل ہونے کی امید بڑھتی جاتی۔ شراب کے بے پناہ استعمال نے انہیں بالکل مدہوش کر دیا تھا۔ اب وہ میز سے اٹھ کر آرام کرنے لگے۔ رات کا فی گز بچتی تھی جو فی کوشش کی گئی، بوڑے نائٹ نے اپنی جگہ چھوڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے آہستہ آہستہ چارپائی کے نیچے سے بچوں کے ہل رینگ کر بھٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ زینے کے قریب جا پہنچا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا جب وہ زینے پر چڑھنے لگا تو اس کا پاؤں اکھڑا اور وہ دم سے زمین پر گرا اس آواز نے سونے والوں میں سے ایک کو جگا دیا وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا کہ کون ہے؟ جب اُسے جواب نہ ملا تو وہ طیر جیوں کی طرف بپکا کیا دیکھتا ہے کہ کوئی آدمی پتھر پٹکار سوراخ سے باہر نکل رہا ہے۔ ایک ہی لمحہ میں باقی کے تمام ڈاکو بھی چپکنے ہو گئے اور پٹکار کر بوے رات کے وقت کس نے یہاں برہمی ڈالی ہے جب ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو طیر جیوں

کی طرف دوڑے اور بھاگتے ہوئے ٹائٹ کے پیچھے ہوئے۔ لیکن رات اس قدر تاریک تھی کہ بہت تھوڑے فاصلہ سے بھی یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ مفور نے کونسی راہ اختیار کی ہے۔ ٹائٹ جب جھاڑیوں والے رستے کو طے کر کے باہر نکلا تو اُسے ایک گھوڑا ملا۔ یقیناً یہ ڈاکوؤں میں سے کسی ایک کا ہوگا۔ ٹائٹ اس پر چڑھ گیا اور اسے سرپٹ دوڑا دیا۔ لیکن اس نے یہ نہ سوچا کہ جو سڑک اُس نے اختیار کی ہے وہ اسے اندر و فوم سے دوڑے دور لے جا رہی ہے۔

ڈاکوؤں نے بھی برابر تعاقب جاری رکھا۔ بڑھا ٹائٹ گھوڑے پر سوار تو تھا ہی اور اس وجہ سے اس نے فاصلہ بھی کافی طے کر لیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اس سڑک سے دور نہ بھل سکا کیونکہ یہ سڑک جھاڑیوں کے ارد گرد کی تمام گٹھنڑیوں کو حلقے بنا کر دو گھوم گھوم کر کاٹتی تھی۔ اس کا تعاقب کرنے والے ہر گٹھنڑی سے واقف تھے۔ انہوں نے نزدیک ترین رستہ اختیار کیا اور چند ہی منٹوں میں ایک ڈاکو نے ٹائٹ کو آلیا۔ اس نے ٹائٹ کے گھوڑے کی دم اپنے ہاتھ کے ارد گرد مضبوط لپیٹ لی اور اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔

ٹائٹ نے چاہا کہ طرف نگاہ دوڑائی اور دیکھا کہ اسکی زندگی کا دار و مدار کسی فوری تدبیر پر منحصر ہے۔ اُس نے اپنی تلوار کینچ کر باہر نکالی اور ڈاکو پر وار کیا۔ تاریک اندھیرے میں یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ ضرب کہاں لگی ہے لیکن یہ ضرور سنائی دیا کہ تعاقب کرنے والا ایک کرخت چیخ مار کر زمین پر گر پڑا ہے۔

اب وہ پھر اُتر اُٹھا۔ اس نے گھوڑے کو ہمیر لگائی اور دوڑے کی قبضے کی طرف گھوڑا سرپٹ دوڑا اب وہیں کے قریب پہنچ گیا تھا جو ایک وسیع وادی تھی۔ لیکن اس نے دیکھا کہ دریا میں اس قدر طغیانی آگئی ہے کہ سڑک سے گزنا ناممکن ہے۔ یہ سڑک وادی سے گذرتی ہوئی شہر کے جنوبی دروازے سے جا ملتی تھی۔ اس نے سوچا کہ محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ میں گیلڈ کی طرف جاؤں اور صبح تک وہیں رہوں۔

اگرچہ اس نے کچھ دیر سے تعاقب کرنے والوں کی کوئی آہٹ نہ دسنی تھی، لیکن اس کو یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ پھر اسی گٹھنڑی کے رستہ سے واپس جائے جس سے خطرہ تھا کہ وہ پھر اسی پٹیلے کے نزدیک ڈاکوؤں کے قریب جا پہنچے گا۔ تاہم اس نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑ لی اور تھوڑی ہی دیر میں گیلڈ پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ سرے کے دروازے بھی بند ہو چکے تھے۔ چارہ ٹائٹ واپس ہانے ہی والا تھا کہ اُسے روشنی کی ایک لہلی سی جھلک نظر آئی، جو ایک جھونپڑی کی کھڑکی سے دکھائی دے رہی تھی۔ یہ جھونپڑی باقی تمام مکانوں سے علیحدہ واقع تھی۔ اس نے فوراً اپنے تھکے نامے گھوڑے کو اس طرف موڑا اور جا کر دروازے پر دستک دی۔ ایک نوجوان خاتون اور ایک لڑکے نے اس کا خیر مقدم کیا اور بڑی خوشی سے اُسے مات بھر کرنے کی اجازت دے دی۔ لڑکی نے ایک شمع ہاتھ میں لے لی تاکہ اگلے صبح گھوڑا

باندھنے کے لئے ناٹ آسانی سے رستہ دیکھ سکے۔

جب وہ گھوڑا باندھ کر اصطبل سے باہر نکلنے لگے تو چھوٹا لڑکا جو ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا فتنہ مچا اٹھا۔ "میں یہ کیا ہے؟ اس گھوڑے کی دُم سے کیا انگ رک رہا ہے؟ یہ الفاظ کہہ کر بڑے کے گھوڑے کی دُم کے اچھے بھوئے بالوں سے ایک انسانی ہاتھ کیچنے لگا۔ باہر نکالا جو بازو سے کٹ کر جدا ہو گیا تھا۔ وہ اُسے شمع کے قریب لے جا کر دیکھنے لگا۔ جب بڑی کی نظر اس پر پڑی تو دُور کے مارے اس کی چیخ مچ گئی۔ بوڑھا ناٹ اس ہاتھ کو دیکھ کر ذرا بھی حیران نہ ہوا کیونکہ اُسے فوراً خیال آ گیا کہ یہ ہاتھ اسی ڈاکو کا ہے جس پر اس نے وار کیا تھا۔

"دیکھو تو صبریں! لڑکے نے مسئلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "یہ تو میرے بھائی کا ہاتھ ہے۔ انگوٹھے پر جو نشان ہے اس سے میں اسے پہچانتا ہوں اور یہ سونے کی انگوٹھی بھی اسی کی ہے۔"

بڑی نے قہر آنو دنگا ہوں سے بچنے کی طرف دیکھا اور اسے خاموش رہنے کے لئے آنکھ سے اشارہ کیا۔ اب بوڑھے آدمی کو سخت خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اس نے سوچا کہ بلاشبک و شبہ جھوٹ پر ہی کے رہنے والوں کا ڈاکوؤں سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس لئے بغیر کوئی لفظ کہنے ناٹ نے اپنا گھوڑا اصطبل سے نکالا اور اس پر سوار ہو کر وارڈ کی طرف واپس پھرا۔ ہر لحظہ اسے خطرہ تھا کہ ڈاکو اسے آنہ لیں۔

جب دیس کی وادی تھوڑے فاصلہ پر رہ گئی تو بوڑھے نے منت مانی کہ اگر میں نے بغیر وعاقبت پانی عبور کر لیا تو میں وارڈ کے قریب ایک گر جاتے ہوئے کراؤں گا۔ اُس نے اپنے گھوڑے کا رخ موڑا اور پانی کے پار بغیر وعاقبت پہنچ گیا۔

صبح نمودار ہو چکی تھی۔ وہ ابھی واپس گھر جا رہا تھا علی الصبح اسے کیڈ لٹا جو اندر و فوم کو جا رہا تھا۔ کیڈ اس سے کہنے لگا جناب شکار کے دوران میں میرا گھوڑا ایک کھائی میں گر گیا۔ میں سخت زخمی ہو گیا اور وہیں بیہوش پڑا۔ آخر کار وہاں سے کچھ کسان گذرے جب انہوں نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو وہ مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچا آئے جس نے میری مہمڑی کی اب میں کچھ چل سکتا ہوں۔

باپ اور منیکیتیر کی فکر میں کیڈ کی منسوبہ نے نہایت خطرے اور بے اطمینانی سے رات گزار دی تھی۔ لیکن بوڑھے ناٹ کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ رات کے ناخوشگوار حادثہ کی یاد تک اس کے دل سے محو ہو چکی جو وہ حرب معمول سرور اور خوش طبع معلوم ہوتا تھا۔ اس نے تمام رات غائب رہنے کیلئے معذرت پیش کی اور کہا جب میں کیڈ کو تلاش کر رہا تھا تو میری ایک ہمسایہ سے ملاقات ہو گئی جو اپنے دوستوں کے ہمراہ شکار سے واپس آ رہا تھا اور میں نے ان کی معیت ہی میں رات گزار دی۔

ان تمام مہمت کے بعد کے دن دو تیزو کی سانگرہ کی تقریب تھی۔ پرانے رسم و رواج کے مطابق اس تقریب

پر شاندار دعوت منائی جاتی تھی۔ دوپہر سے پہلے ہی ہمارا گھر میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ بہر طرف خوشی اور مسرت چھا گئی۔ صرف کیلڈ ہی خیالات میں مستغرق اور غمگین سا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطری طور پر خاموش ہو گیا ہے۔ لیکن اس کا زرد چہرہ یہ ضرور ظاہر کر رہا تھا کہ حادثہ کی تکلیف ہی نے اس میں یہ تبدیلی پیدا کر دی۔ اپنی مشغولیت کے لئے اس کا دل پہلے ہی کی طرح محبت سے بھرا ہوا اور مہربان معلوم ہوتا تھا۔ نوجوان جوڑے کی آئندہ خوشی کے لئے میز پر بہت سے جامِ صحت خالی کئے گئے۔ کھانے کے بعد کا وقت نہایت خوشی سے کمائیاں اور لطیفے سننے میں گزرا۔

جب ہر ایک اپنی خوشی کا خزانہ ختم کر چکا اور گفتگو کا سلسلہ ذرا ٹوٹا تو میزبان اپنے مہمانوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”میں تمہیں ایک عجیب و غریب خواب سناؤں گا جو میں نے گذشتہ رات دیکھا ہے۔ جسے خواب میں اب تک دیکھ چکا ہوں ان میں سے یہ عجیب ترین ہے۔“

اس قہید کے بعد اس نے گذشتہ رات کے واقعات بیان کرنے شروع کئے کہ کس طرح وہ ٹیلے کے قریب کی گھنی جھاڑیوں میں آیا اور کس طرح اس نے کسی کو اپنا نام لیتے ہوئے سنا کس طرح وہ بوڑھی عورت کے پیچھے پیچھے غائب ہو گیا اور کس طرح اس نے اپنے آپ کو ڈاکوؤں کی آبد چھپا لیا۔

بوڑھا ٹائٹ کہنے لگا ”میں اُس لاش کو جو وہ اپنے ہمراہ لائے تھے دیکھ تو نہ سکا لیکن جب ڈاکوؤں نے اگلی کو کاٹ ڈالا جس میں سونے کی انگوٹھی تھی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ اس چارپائی کے نیچے آگری ہے جس کے نیچے میں چھپا ہوا اگر یہ یہ سب کچھ صرف خواب ہے لیکن اس کے باوجود۔۔۔۔۔ وہ انگشتی یہ ہے۔“

یہ لفظ کہہ کر اُس نے کٹھنی ہٹائی اگلی باہر نکالی اور اپنے سامنے کی میز پر رکھ دی۔ تمام حاضرین کے منہ سے حیرانی کے کلمے بلند ہوئے لیکن اس کہانی کا کسی پر بھی اتنا گہرا اثر نہ ہوا جتنا کہ کیلڈ پر۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا اور وہ کمرے سے باہر جانے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھا لیکن بوڑھے آدمی نے اسے پکڑ کر پھینکا لیا اور بڑے دوستانہ انداز سے کہنے لگا۔

”میسے داماد! تمہیں نہ در ابھی ہمارے پاس ہی رہنا ہو گا۔ تمہیں میری کہانی اخیر تک سننی چاہیے ابھی اس کا بہترین حصہ تو سنایا ہی نہیں گیا۔“

پھر اس نے بتایا کہ کس طرح اس جگہ سے بھاگ کس طرح وہ ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور کس طرح اس کا تعاقب کیا گیا اور اُسے دیس کے قریب کون کون سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جس کی بنا پر وہ پھر سے قید خانہ جانے پر مجبور ہو گیا۔

بوڑھے آدمی نے سلسلہ کلام جاری رکھا اور کہا پیچھے نے زخمی ہاتھ پہچان لیا اور کھنکھہ لگا یہ تو میرے بھائی کا ہاتھ ہے۔۔۔۔۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب میں گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگا تھا تو میں نے وہ ہاتھ بھی اپنے ہمراہ لے لیا تھا۔ اگرچہ مہیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں یہ سب کچھ صرف ایک خواب ہے لیکن اس کے باوجود میں وہ ہاتھ آپ کے سامنے رکھ سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک انسانی ہاتھ بائیں نکال کر مینبر پر رکھ دیا جو کلائی کے قریب سے کاٹ ڈالا گیا تھا خواب سننے والے اس ناقابل بیان حیرت کی کچھ پروانہ کی جس نے سب حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔

”میں نے سوچا کہ مجھے اس ہاتھ کی پہچان اس کی انگلی کی انگوٹھی سے کرنی چاہئے اور اس کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہاتھ میرے ہی دوستوں میں سے کسی ایک کا ہے۔“

بوڑھا ٹائٹ اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ پکڑ کر کیلڈ کی طرف پھینک دیا جس کی حالت مردہ سے بدتر ہو گئی تھی۔ وہ سب کہانی شروع سے اخیر تک سُن چکا تھا۔

ٹائٹ کہنے لگا کیلڈ اپنی انگشتی واپس لے لو! اور اذرا کہہ دو کہ یہ ہاتھ تمہارے کٹے ہوئے باندھ کو پورا آتا ہے یا نہیں جس پر تم نے پٹی باندھ رکھی ہے۔“

سب ہمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ تمام نگاہیں کیلڈ پر گرد گئیں۔ اُس نے اپنا بازو ایک پٹی میں لٹکا رکھا تھا جو اس کے گلے میں بندھی تھی۔ ٹائٹ چھپٹ کر آگے بڑھا اور کیلڈ کے بازو پر جو پٹی لپیٹی ہوئی تھی اُسے کھول دیا اور دیکھا کہ اس کا ہاتھ کٹ چکا ہے۔

ٹائٹ نے سلسلہ کلام جاری رکھا اور کیلڈ سے کہنے لگا ”اس وقت تمہاری کیلڈنگ کو وارڈ کی پولیس محصور کر چکی ہے۔ تمہارے ساتھی قید کر لئے گئے ہیں اور میں ان لوگوں کے یہاں پہنچنے کی آواز دُن رہا ہوں جو تمہیں اس جگہ سے زیادہ موزوں جگہ لے جائیں گے۔“

کیلڈ ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار تھا اس نے ٹائٹ سے اس لئے دوستی پیدا کی تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو جوئی میں داخل کرنے کے لئے بہتر رہنمائی کرنے کا موقع حاصل کر سکے اور بوڑھے آدمی کی دولت لوٹ لے۔ اس کے بعد اس کے ساتھیوں کا اسی ٹیلے پر قلع قمع کر دیا گیا۔ اور وہ اُسی ٹیلے پر قتل کر دئے گئے جو مدت سے ان کی جگہ پناہ بنا رہا تھا۔

بوڑھے آدمی نے اپنی قسم کے مطابق وارڈ میں چھوڑا مگر جاہ تعمیر کر دیا لیکن کہا جاتا ہے کہ جب وہ سنگ بنیاد رکھنے لگا تو اُس نے یہ الفاظ کہے۔

”جو آدمی اس گر بے کوسمار کرنے کی ابتدا کرے اس پر ابدی لعنت رہے“
چند سال گزرے جب مرہٹ کے لئے اس گر بے کو اکھڑنے کی ضرورت پیش آئی تو کوئی بھی فرد
کام کرنے پر رضامند نہ تھا جب تک کہ پادری نے دیوار سے پہلا پتھر خود نہ اکھڑ دیا۔

مہدی علی خاں

ترجہ

خیالات پریشاں

داسن شوق چاک کر دست کش زمانہ بن
مجھ سے الم نصیب کوئے نہ فریب آرزو
وضع ثبات و جوئے ضبط ہمسر درد دل نہیں
دست جنوں و بھڑقت منزل غرق و گم رہی
گوشتہ مفلوت حرم شہر خط درسی نہیں
فقر ہے بے تعلقی خاک نشین انکسار
شیوہ اہل دل نہیں فکر ناک درد دل
رسم و عبادہ جنوں رسم و رفا نہ بھول
راہ گرائے دشت شوق کیجہ نہ اپنی جاں گنوا
گردش آسمان سے تو سیکھ اولئے زندگی
فکر مال سے گذر چھوڑ خدا پہ عاقبت
اجی ہے میری بیکسی کرنے بھگاہ التفات
ایک خیال خام ہے کیفیت مدام کی ہوس

سر کو فحیم نیاز دے ہمسر آستانہ بن
دشمن جاں نہ ہو مر از ریت کا آسرا نہ بن
صبر و سکون پہ خاک اہل یا ستم شناس نہ بن
منت ناخدا نہ چھینچ پیرو ہنسنا نہ بن
فطرت زاہدانہ رکھ زندہ شرا نجھنا نہ بن
مسند زرنہ کر قبول خوگر بوریا نہ بن
پیرو خامکاری غفل گرہ کشا نہ بن
نسکوتہ غار غم نہ کر نالہ کش جفا نہ بن
عشق کے غار زاریں تجھ سے کچھ آہنگا نہ بن
برق پہ آشیاں بنا دشمن آشیانہ بن
نغمہ بانقرا سنا مہر مئے مغانہ بن
چھوڑ خیال دلہی مجھ سے تو با وفا نہ بن
نحکمہ حیات میں سر خوش مدعا نہ بن

حسرت زندگی ریاض عشق میں مصلحت نہیں

ہجر میں سخت جاں نہ ہوا ہے لئے بلا نہ بن ریاض عباسی امروہی

بادام کہ دلیا

تم بادام کھاتے ہو کہ دلیا؟

نرم نرم دلیا کہ سخت سخت بادام؟

دیپنے میں شکر ڈالتے ہو اور کچھ دودھ؟ وہ بھی سا بن جاتا ہے۔ میٹھی لسی جھٹ تھما رہے جسم کو چٹنے والی! اور اسی طرح تم اُس سے لطف اٹھاتے ہو۔ گاؤں کیسے کا سہارا لینے والے آرام پسند! دینے اور نیکی کی دلدل میں بہتے طے یاں! سب جانتے ہیں کہ نرم نرم مصنوعی خوراکوں نے عیش پسند انسان میں حیوانیت کی بہت کم طاقت چھوڑی ہے۔ کچی پکانی نرم جلد حلق سے اتر جانے والی خوراکیں انسان میں ہوتیں بلکہ ضعف پیدا کرتی ہیں۔ چھنا ہوا آٹا، ایسی سادلیا، کھو کھیر، فیریاں، انسانی بھینس کے سے ملکی دلدلیں ہیں جہاں وہ اپنی سستی میں پُری ستاتی ہے۔ اس کا دودھ دودھ ہو، اُس سے کٹھے حاصل کرو، بچوں کو دودھ پلاؤ، مگر وہ جنگلی جیسے کا زور وہ پھولے ہوئے تختے جنہیں دیکھ کر شیر بھی کنارہ کر جائے ان کا نام و نشان بھی نہیں۔

انسان کی قدرتی غذا پھل تھی، بعض کتنے ہیں اناج تھی جو کچھ بھی تھی اور سے وہی خوراک انسان پیدا کرتی ہے۔ وہی صحیح انسانیت کو قائم رکھتی ہے جو سخت ہو، نرم بھی ہو تو ذرا سستی مائل ہو، لے کچھ چبانا پٹے گویا اس سے لطف پائی ہو کچھ ہاتھوں کو کچھ انگلیوں کو کم از کم دانتوں کو دہن کے لعاب کو اس سے واسطہ پڑے۔

مغص نکلنے کے لئے تو صرف پانی قدرت نے بنایا ہے اسی سے اس کے لئے پینے کا غلط ہے۔ خوراکیں کھائی جاتی ہیں پی نہیں جاتیں اور جو خوراک زیادہ تر پی گئی وہ جزو بدن ہونے سے رہی۔

کوئی کون مشہور جرس باہر غذا یا ت کا خیال ہے کہ مٹھی کے کچے کھانے چاہئیں۔ اس طرح کہ انہیں منہ میں خوب پھرایا جائے چبایا جائے پھر وہ طاقت دیتے ہیں غرض مٹھی کم کوئی خوراک پکانی جائے گی اتنی ہی صحت مند آدمی کے لئے وہ زیادہ صحت بخش طاقت ہے صحت مند آدمی کے لئے اگر گراں باتوں کو پڑھ سن کر کوئی جسم و قلب کا مٹھی کے چنے چبانے لگ جائے اور پھر بیٹے کے دروے ٹھکل ہو کر گئے راقم کو تو نے الزام غفلت نفس شکنی اور بندہ برسی اللہ سپرائی عادتیں اور پالی پوسی کر دیں طے جاتے ہی مافی ہیں لیکن کچھ بھی جو کچھ بادام سے صاف زور دینے کو دوسری سلام بادام کو کاٹو چاؤ منہ میں لطف اٹھاؤ کم کا جزو بناؤ دلیا کھاؤ اور دلیا سن کر لپٹ جاؤ زندگی کی نیریت سے پاک کرنا پھوڑو دنیا کی شینوں کو اپنا بناؤ مٹھی نہ ساری مٹی کی کوشش ہو نرمی ہو جی تو تھیں اس کی نرمی کا پورا لطف لائے گا بادام کھاؤ اور بادام ہی بن جاؤ تھکے جسم میں تھک رہی ہو میں ان فراموشی مٹھی مضبوطی کا راسی قدرتی ٹھاس ہوا درخت ہو اپنے دودھ دوزخ لاہور، رشتی ۱۹۳۲ء

محفل ادب

اے رمی سکھی سبیاں ارہ رہیں جہاں کمیں

شام کا سہانا وقت تھا خوبصورت گدھے نشی بھیتوں میں کھلیں کر رہے تھے۔ ان کی میری آوازوں کا پکیریف نغمہ ہوا میں ایک ارتعاش اور نرم ہوا پر گرا تھا۔ گوبر اور شرے ہوئے تپوں کی بھینی بھینی بدبو سے ہوا میں گرمی سی تھی کیا ہی خوبصورت منظر تھا۔ ادھر کوڑے کے ڈھیر لگے ہیں۔ ادھر گوبر کے ادھنے اوٹھے پیلے ہاتھوں کا منہ چڑا رہے ہیں۔ سامنے کچھ خوبصورت بھینسیں کچھڑکے ملائم اور کوٹ پٹنے ٹھل رہی ہیں۔ ان کے بچے بھی کچھڑکی خوبصورت جاکٹیں اور ٹکڑیاں پٹنے ٹھل رہے ہیں۔ کیا ہی پر فضا اور روح پرور سماں ہے،

سامنے ارہ رہ کر نہ بکھیتا تھے میری گاڑی کے پیچے کی سی خوبصورت آنکھیں اس محفل کی طرف متوجہ تھیں جو میں اپنی نازک انگلیوں سے، ہاں نازک انگلیوں سے، یعنی ان انگلیوں سے جن پر پکی کے ملائم دستانے کی گڑ سے گٹے پڑ گئے ہیں۔ وہ انگلیاں جن پر ناخن کا گول تاج ہے۔ وہ ناخن جن کے کناروں میں گائے کا گوبر ٹھنک کر اس طرح وہیں کا وہیں رہ گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ناخن کے تاج پر سینک کی گوشت لگی ہے ہاں تو میں اپنی انہیں حسین انگلیوں سے تال میں سے اٹھائی کچھ کھال کھال کر ایک ٹوکری میں رکھ رہی تھی میری نظر ارہ کے کھیت کی طرف کسی سرسراہٹ کی وجہ سے متوجہ ہوئی، کچھ شبہ سا ہوا کہ کوئی گائے یا بھینس یا کتا ہے مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا میں پھر اپنے دلچپ کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایک دم سے میری کمر بکنی تین پاؤں زنی مٹی کا ڈھیللا اس زور سے آکر لگا کہ ٹوٹ کر کھیل کھیل ہو گیا میں نے مڑ کر دیکھا غور سے دیکھا کہ کون ہے، موٹی موٹی اٹھانہ میں گالیاں اس نامعلوم ڈھیللا بھینکنے والے کو نہایت ہی کھری کھری سنائیں مگر وہاں تو کوئی نہ تھا میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

لیکن غور ہی ہی دیر بعد کنوئیں کے رہٹ چلائے کاموٹا سا ڈنڈا میری اس نازک کمر پر آکر لگا جس کی تعداد سے میں ڈیڑھ سن کی گھڑی اٹھا لیتی ہوں۔ میں نے جل کر موٹی موٹی کالیاں دیں۔ اور کھڑی جو ہوئی تو کیا بکھیتی ہوں کہ وہاں تو کوئی اور ہی ہے۔ وہ جو مجھے اپنی بھینس اور تمام بھینسوں سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ جو اگر آج مجھ سے کہے تو تمام اپنے وہ پلے ٹاڈوں پر میں نے سال بھر میں سکھا کر رکھے ہیں وہ جس کو کہ میرا جی چاہتا ہے کہ نہا

کے لئے ڈھائی پاؤں کی مٹکاکی روٹی بیانی دو گھنٹیوں کے ساتھ روز کھلاؤں۔ وہ جس کو کہ میراجی پاستا ہے کہ بھر بھر کھلیاں روز شیرہ پلاؤں..... وہاں تو وہ کھڑا ہے جو مجھے یل سے بھی زیادہ غریب ہے۔ کھرپے سے بھی زیادہ پیادا ہے۔ ہنسیاے بھی زیادہ بانکا ہے۔ قصہ مختصر وہاں تو سیتیاں تھے۔ ارہر میں سے جھانک رہے تھے!!
بس اُن کے دیکھتے ہی میری حالت ہی عجیب ہو گئی۔ میری جبین نازک پر جو ہینس کے ماتھے کی طرح خوبصورت اور سچل ہے شرم و حیا کی سرواں چل گئی۔ میں نے سیتیاں کے چہرہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ خوبصورت چہرہ جو گول گدو کی طرح ہے۔ اور جوانی اور محبت کے روپ سے نئے کھرپے کی طرح چمکتا ہے۔

وہ یل کی سی بڑی بڑی آنکھیں جیسے معلوم ہو کہ اپنے تھا پنے دانی نامیں آج نیا پانی بھرا ہے۔ اس خوبصورت چہرہ پر کھد رکی دوہری چادر کا پکڑ لیا بہار وے رہا تھا!! اگھر طے کے برابر گزرا وہ خوبصورت پکڑ جسکی وجہ سے زمیندار کے جوئے کا روٹی کا گالہ بنکر سیتیاں کے سر کو ضرب پہنچانے کے بجائے گویا سہلا تا ہے۔ وہ پکڑ جسکی بدولت سیتیاں جب زمیندار کے یہاں پٹنے جاتے ہیں تو لگان کا روپیہ جوں کا توں باوجود مار کھانے کے واپس لے آتے ہیں۔

میں نے پھر اپنے داہنے ہاتھ میں اٹھائی کہ جیسے اردو لگی۔ ایک مسکراہٹ سیتیاں کے چہرہ پر نمودار ہوئی جو چشم زدن میں پھیل کر دونوں کانوں تک پہنچی۔ انہوں نے اپنی آنکھیں کچھ مکنے یل کی طرح مگر شرتا جھپکائیں کہ میں پارتی کی طرف چلائی۔ سہ اے ری سکھی سیتیاں ارہر میں جھانکیں۔

پارتی اُپلے تھاپ رہی تھی۔ اس نے کھیت کے کنارے سے مگر مجھے دیکھا۔ میان میری طرف پلکے..... اور ادھر سے پارتی نہایت ہی دلایم بغیرینے ہوئے اُپلے کا گولا لیکر دوڑی۔

سیتیاں کو میں نے کیچولی بارش سے روکا۔ مگر جو شخص آنا مہادر ہو کر زمیندار کے جوتوں سے نہ رک سکتا ہو وہ کیچوکب شمار میں لاتا۔ انہوں نے ڈور کر سب سے پہلے میری پیٹھ پر بڑے زور سے گھونسا مارا کہ اس گڑا کی بھیلی کی مٹھاس میرے دل و دگر میں بیٹھ گئی۔ اور پھر میری سیاہ ہینس کے پیچھے کی سی خوبصورت کٹانی کو پکڑ کر اس زور سے مروڑا ہے کہ میں درد کی تکلیف کی وجہ سے چیخ کر بیٹھ گئی۔ وہ درد جس کی لذت جھٹک رہی جھٹک بازو دوڑ کر تار ہا۔

اتنے میں پارتی گوبر کا پورا گولائے میری اعضاء کو پہنچی۔ سیتیاں ہنس تو رہے ہی تھیں۔ بولنے کے لئے جو منہ کھولا ہے۔ تو پارتی نے گوبر کا پورا گولاسیتیاں کے چہرہ پر اس زور سے مارا کہ آدھے گوبر سے تو آنکھیں بند ہو گئیں اور آدھا اُن کے منہ کے پار اتر گیا۔

میرا ہاتھ چھوٹ گیا۔ پارتی اور میں..... ہم دونوں بھاگیں..... دور سے ہم دونوں سکھیاں گا رہی تھیں سہ اے ری سکھی سیتیاں ارہر سے جھانکیں۔

(ندیم)

اور سیتیاں ماں کے میلے پانی سے کلیاں کر رہے تھے۔

ہومر اور مصطفیٰ کمال

یونان کے مشہور شاعر ہومر کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ خرافیات یونان کی ایک فرضی ہستی ہے۔ اور بعض کا گمان ہے کہ وہ حقیقتاً ایک شاعر تھا۔ اور الیڈ کی زمین داستان اس نے لکھی تھی۔
مصطفیٰ کمال پاشا صدر جمہوریہ ترکی کی رائے ہے کہ ہومر یونانی الاصل نہ تھا۔ بلکہ وہ ترکی الاصل تھا ایشیائے کوچک میں پیدا ہوا تھا۔ اور اس کا نام عمر تھا جو بعد کو ہومر ہو گیا تھا۔

ہمایہ امر کہ ایک ترک نے یونانی زبان میں کتاب کیوں لکھی۔ سو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ کیونکہ بہت سے ترکوں نے دوسری زبانوں میں کتابیں تصنیف کی ہیں اور لسانیات کی جدید تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یونانی زبان کے بہت سے الفاظ ترکی زبان سے لئے گئے ہیں۔
 (نکار)

میر کے محبوب

اگر تم مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہو۔ تو صرف محبت ہی کی خاطر محبت کرو۔
 پھر یہ نہ کہو کہ میں تم سے صرف اس لئے محبت کرتا ہوں کہ تمہارا تہنم و ج پر در رہے،
 یہ بھی نہ کہو کہ میری نگاہیں اپنے اندر جاو کا اثر مستور رکھتی ہیں،
 یہ بھی نہ کہو کہ میرا طرزِ تکلم یا میرا نرم سلوک اپنے اندر محبت کا پیغام لئے ہوئے ہے،
 اور یہ بھی نہ کہو کہ میرے کسی خیال نے تمہارے خیال سے موافقت کی تھی۔ یا کسی خاص موقع پر میں نے تمہارے ساتھ نہایت محبت آمیز برتاؤ کیا تھا۔

میر کے محبوب! اس لئے کہ یہ سب عارضی ہیں۔ اور انقلابِ زمانہ کے ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں صرف تمہاری خاطر اس محبت کا ایک بالکل نئے طور پر اظہار کروں۔ اور اس لئے یہی محبت جو پہلے "محبت" تھی۔ شاید اب "محبت" باقی نہ رہے،

اں اگر تم مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہو۔ تو صرف محبت ہی کی خاطر محبت کرو!

میر کے محبوب تمہاری محبت اس امر پر مبنی ہونی چاہیئے کہ تم نے کسی مصیبت کے وقت میری اعانت کی تھی اور میری پُر نغم آنکھوں سے آنسو پونچھے تھے،
 کیونکہ جب میں اس بلا سے ہلائی جاؤں گی اور پرسکون حالات میرے لئے پیدا ہو جائیں گے تو میں اپنی مصیبت اور غم بھول جاؤں گی! پھر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اس کے ساتھ تمہاری محبت کو فراموش کر دوں؟

میر کے محبوب صرف محبت ہی کی خاطر مجھ سے محبت کرو۔ تاکہ آئندہ بھی یونہی محبت کرتے رہو۔ اور محبت کی لہری فضا میں تمہاری محبت کا لغہ کبھی خاموش نہ ہو۔
 (جھاگیں)

مطبوعات موصولہ

معراج صدق و صفایہ صداقت معراج علاء - حضرت صدیق اکبر کی ولادت و وفات خلافت کا مختصر منظوم مرقع - شعر خوب ہیں - حجم بڑی قطع کے ۸ صفحات قیمت ۳۰ ناشر سید البراہیمہ شیخ روڈ حیدر آباد دکن پور
میلاد النبی پر وجہ کٹ - بچوں میں مذہبی شوق پیدا کرنے کے لئے بہت اچھی اور نئی قسم کی کتاب ہے - ۶۲ صفحات - قیمت ۸ ناشر مکتبہ جامعہ طبعہ دہلی -

کامل ہندسہ عملی - یہ کتاب ابتدائی جماعتوں کے لئے محمد منیر الدین صاحب بی۔ اے - نے تالیف کی ہے اردو زبان میں ہندسہ عملی کے متعلق یہ بہت اچھی کتاب ہے - ناشر مکتبہ ابراہیمہ شیخ روڈ حیدر آباد دکن
توبہ ستم - گولڈ ستمہ کے ایک منظوم افسانے کا منظوم ترجمہ از مولوی محترم احمد صاحب بدر بھلی شہری - ترجمہ بنت جہا اور دلچسپ ہے قیمت ۳۰ ناشر حکیم بہیم صاحب گورگھ پور -

مفہمات معروفہ بہ خزینہ صنعت حصہ اول کپڑوں پر بیل بٹے کاڑھنے کی آسان ترکیبیں درج ہیں
میلوں اور پھولوں کے کئی نمونے اس کتاب میں ہیں قیمت ۱۲ ناشر محترمہ بلقیس جہاں بیگم - برہمیں دہلی بیگم
سید محمد صابر حسین بی۔ اے - گلاب خانہ آگرہ -

گلزار شمس یہ جناب شمس الحق صاحب شمس رام نگر کی مجموعہ کلام ہے - زبان صاف ہے - چار آنے کے مکتب صحیح کر
مصنف سے رام نگر بنارس کے پتے سے منگوائے -

یادگار شارب - یہ خوبصورت چھوٹی سی کتاب نواب زادہ حامد علی خاں صاحب شارب کی یادگار کے طور پر نہایت
نغیس آرٹ پیپر پر چھپی ہے - اس میں مرحوم کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے - اور ان کا تمام کلام جمع کر دیا گیا ہے -
قیمت ۸ ہے جو زیادہ نہیں - ناشر راؤ بہادر عیدالحید خاں منظر باغیت ضلع میرٹھ -

بچوں کا قاعدہ یہ قاعدہ تصویر دار ہے - اور اس لئے بچے اسے دلچسپی سے پڑھ سکتے ہیں - قیمت درج نہیں
معمولی ہوگی - مکتبہ ابراہیمہ شیخ روڈ حیدر آباد دکن سے منگوائے -

قاعدہ فارسی یہ نئی طرز کا فارسی قاعدہ ہے - تصویروں نے اسے اور دلچسپ بنا دیا ہے - قیمت ۶ - ناشر
مکتبہ ابراہیمہ شیخ روڈ حیدر آباد دکن -

1915 d. 10

[illegible]

